رسائل ۹۳۶

مصنف

نمبر ۱۳

مجلس مصنفین علیگڑھ کا ماہی علمی رسالہ

جنوری سنہ ۱۹۴۶ء

(مدیر و ناشر)

سید الطاف علی بریلوی - بی - اے (علیگ)

قیمت سالانہ :- للعہ چار روپئے

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

باہتمام خانصاحب جواہر خاں

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکرٹری کانفرنس

مہینہ میں چار بار شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ تعلیمی تحریک مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کیجاتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ اخبار بہت عمدگی اور نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کر کے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ **نمونہ** ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے۔ جو اصحاب بہ ادائے قیمت پیشگی اخبار کے خریدار ہوں گے ان کی خدمت میں دو کتابیں یعنی **التربیۃ والتعلیم** ضخامت ۵۰ صفحہ اور رسالہ **تمدن و معاشرت** ضخامت ۱۸۰ صفحہ ہدیۃً پیش کش کی جائیں گی۔ یہ دونوں کتابیں نہایت مفید و قیمتی مضامین پر مشتمل ہیں، جو تعلیم و تربیت، مذہب اور اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ کانفرنس گزٹ کی سالانہ قیمت تین ۳ روپیہ ہے۔ جنگ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا۔

اڈیٹر:۔ محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ

صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

مُصنّف

جلد ۴ | بابت ماہ جنوری سنہ ۴۶ء | نمبر ۱۳

فہرست مضامین

ذکرِ ماضی اور فکرِ فردا

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ۵۴ واں سالانہ اجلاس ۲۷ لغایتہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۵ء آگرہ میں کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ خاکسار مُدیر "معنف" کانفرنس کے صدر دفتر علیگڑھ کا ہیڈ اسسٹنٹ ہے، اس لئے رسالہ کا شمارۂ اکتوبر شائع ہونے کے بعد سے اس وقت تک اس کو شدید مصروفیت رہی، سوائے اجلاس کانفرنس اور اسکی تفصیلات کے کسی دوسرے اہم سے اہم علمی یا غیر علمی کام کی جانب مطلق توجہ نہ ہوسکی۔ "مجلس مصنفین" کے جلسے بھی ۳۰ اکتوبر کے بعد سے نہ ہوئے۔

فروری بلکہ وسط مارچ ۱۹۴۶ء تک علمی کاموں کے تعلق کا یہی عالم رہے گا۔ کیونکہ اجلاس کے بعد منظور شدہ تجاویز کی تعمیل اور کانفرنس کے سالانہ میزانیہ کا ناگزیر ہنگامہ رہتا ہے۔ غرض چھٹے ہوئے علمی مشاغل کا انشاءاللہ شروع اپریل سے ہی از سر نو آغاز ہوگا۔ "مجلس مصنفین" اور کانفرنس کی "اکیڈیمی آف اسلامک ریسرچ" پر بھی پوری توجہ اُسی وقت ہوسکے گی۔ لیکن اس عرصہ میں علیگڑھ کے دوسرے محترم بزرگ اور معارف پرور احباب کی جد وجہد بدستور جاری رہے گی۔ قومی کاموں کی رفتارِ ترقی میں کسی ایک فرد یا چند افراد کا عارضی یا مستقل قطع تعلق کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ علیگڑھ خدا کے فضل سے بہت بڑی جگہ ہے اور یہاں کے کارکنوں میں اس خاکسار کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

سطور بالا میں کانفرنس کے سالانہ اجلاس کو ہم نے کامیاب بتایا ہے، اس سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو اتفاق نہ ہو۔ لیکن ہماری یہ رائے بوجوہ ہے۔ قطع نظر اس سے کہ صدر اجلاس عالی جناب نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کا آگرہ کی تاریخ میں سب سے زیادہ تزک و احتشام کا جلوس نکلا۔ بیکر گارڈن میں بہت عریض وطویل خوبصورت پنڈال بنا۔ جو قریب قریب ہر جلسے میں بھر جاتا تھا۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے بڑی تعداد میں مہمان آئے۔ حتّٰی کہ سیلون تک کا وفد شریک ہوا۔ نیز مہمانوں کے قیام وطعام کا بھی موجودہ گرانی اور رہائش کی دقتوں کے باوجود معقول انتظام تھا ـــــ زنانہ تعلیمی نمائش۔ مینا بازار اور آل انڈیا اردو مشاعرہ بہت دل چسپ اور کامیاب رہا ـــــ کامیابی کے ان وجوہ کے علاوہ دوسرے اسباب بھی تھے جن پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔

سب سے پہلے صدر کانفرنس کا انتخاب بہترین ہوا۔ موصوف موجودہ عہد کے مسلمانانِ ہند میں حد درجہ ہردل عزیز رہنما ہیں۔ اعلےٰ تعلیمی اسناد اور قابلیت کے حامل ہونے کے علاوہ بہت اچھے لکھنے والے اور مقرر ہیں۔ فکرِ صحیح کے بھی مالک ہیں۔ ایک مشہور مُدبّر اور ماہرِ سیاست ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانانِ ہند کے مسئلۂ تعلیم سے بھی خاص شغف ہے جب تک صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کی مجلس قانون ساز کے ڈپٹی پریسیڈنٹ رہے۔ اس خصوص میں مفید خدمات انجام دیتے رہے۔

چنانچہ ان ہی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۳۳ء میں یو۔پی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر بنائے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں اس اعزاز کا پھر اعادہ کیا گیا اور صوبہ کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ میں دوبارہ صدر بنائے گئے۔ آخر الذکر اجلاس کے بعد ایک اہم تعلیمی کمیٹی کی واردھا اسکیم کے سلسلے میں صدارت کی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جو نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کے نام سے موسوم ہے ہمارے تعلیمی لٹریچر میں ایک خاص وقعت کی چیز ہے۔ کانگرسی عہدِ وزارت میں صوبۂ متوسط و بہار میں ودّیا مندر اسکیم جاری کی گئی تو اس میں آپ کی بروقت مداخلت سے وہاں کے مسلمانوں کو مؤثر فائدہ پہونچا۔ صوبۂ سرحد میں بھی اسلامی مدرسہ کے مشہور قضیہ کو آپ نے مناسب طریقہ پر سُلجھایا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے آپ اس ادارہ کی توجہ مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں دلاتے رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں لیگ کی مختلف تعلیمی کمیٹیاں مصروفِ کار ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کورٹ اور اس کی ایگزیکیوٹو کونسل کے ذی اثر ممبر اور عربک کالج و اسکول سوسائٹی دہلی کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی مفید تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ دلّی یونیورسٹی کی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اصلاح میں بھی موصوف کا کافی ہاتھ ہے۔

غرض ایسے ہمہ صفت موصوف صدر سے جیسی کامیاب رہنمائی کی توقع ہو سکتی تھی وہ بدرجۂ اتم پوری ہوئی۔ آپ کا فاضلانہ خطبۂ صدارت بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ اسی طرح مختلف جلسوں میں جو تقریریں ہوئیں وہ سننے سے تعلق رکھتی تھیں۔

گزشتہ دس سال سے جیسا کہ اعتراض کیا جاتا تھا، اب کانفرنس کے اجلاس میں صرف ریزولیوشن ہی پاس نہیں ہوتے بلکہ ان کو سب سے موخر رکھا جاتا ہے اور پروگرام میں اُن کو کم سے کم اہمیت دی جاتی ہے۔ اول اور آخر دُو اجلاس عام ہوتے ہیں جن میں خطباتِ صدارت، سکریٹری کی رپورٹ اور دوسری رسمی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ کانفرنس کا اصل کام شعبۂ تعلیمی، شعبۂ تعلیم نسواں، شعبۂ تصنیف و تالیف (اُردو)، شعبۂ اسلامی تاریخ و تمدن اور شعبۂ اصلاحِ معاشرت واقتصاد میں تقسیم کیا جاتا ہے، ان شعبوں کی صدارات کے لئے ملک کے مشہور ماہرینِ فن مدعو ہوتے ہیں مستقل اور مقامی سکریٹری صاحبان شعبہ وار موضوعات پر اُس سال کی ترقی و تنزل کا تفصیلی جائزہ لے کر اپنی رپورٹ تیار کر کے پیش کرتے ہیں اور ان ہی مندرج مسائل کی روشنی میں مقالات و تقاریر کے عنوانات کا تعین ہوتا ہے۔ نیز شعبہ کی تجاویز تیار کی جاتی ہیں۔ جلسے کی ایک پوری نشست صرف ایک ہی موضوع کے لئے مخصوص ہونے سے اور اُسی پر صدر شعبہ کا فاضلانہ خطبہ، سکریٹری کی رپورٹ، مقالات اور تقاریر مسلسل چار گھنٹے تک سننے اور غور کرنے سے مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔ اور معلومات کا زبردست ذخیرہ دماغ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ امسال کے پانچوں شعبوں کی صدارت مسٹر حبیب الرحمان ایم، اے، ایم، اے، ڈی پرنسپل ٹیچرس ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ لیڈی سر علی امام صاحبہ پٹنہ، ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر علی گڑھ، ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر حیدر آباد دکن، اور آغا محمد یعقوب صاحب دواشی دہلی، جیسے فاضل بزرگوں نے علی الترتیب فرمائی۔ ان سب صاحبوں کے خطباتِ صدارت ایسی قیمتی علمی دستاویزیں ہیں کہ اُن کی افادیت ہمیشہ باقی رہیگی۔ مقالات

علمی کا معیار بھی بہت بلند رہا۔ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آنریبل میجر شمس الدین صاحب بہادر وزیر تعلیم ریاست بھاولپور مع چند دیگر افسرانِ تعلیم تشریف لائے تھے۔ آپ نے نہ صرف ایک بلند پایہ علمی مقالہ پڑھا بلکہ ازراہ کانفرنس نوازی اس کے اگلے سالانہ اجلاس کو بھی بھاولپور میں مدعو فرمایا۔ اس معارف پرور اور مخیر اسلامی ریاست کی جانب سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو مستقل سالانہ امداد بھی ملتی ہے۔

احباب اور بزرگانِ آگرہ نے اجلاس کانفرنس کو مجوزہ جناح میڈیکل و انڈسٹریل کالج کی تجویز کو تقویت دینے کی غرض سے مدعو کیا تھا۔ یہ اہم مسئلہ بھی نظرانداز نہ ہوا۔ صدر محترم نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے آخری اجلاس عام کے موقع پر اپنی تقریر میں اعلان فرمایا کہ " اس عقیدت و محبت کی بنا پر جو مجھکو قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کی ذاتِ گرامی سے ہے میں مسلمانانِ آگرہ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ایک سال کے عرصے میں وہ خود دو لاکھ روپیہ جمع کریں گے تو بقیہ دو لاکھ میں لاکر دیدوں گا۔" نواب زادہ صاحب کی اس موثر اپیل پر چھتیس ہزار روپیہ اُسی وقت جلسہ میں جمع ہوگئے۔ فراہمی سرمایہ کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آگیا ہے اور چندے کا سلسلہ جاری ہے۔

دوسرا اہم اعلان جناب حافظ محمد صدیق صاحب رئیس اعظم کانپور کی جانب سے ہوا کہ "اگر کانفرنس ان کے وطن کانپور میں ایک ٹیکنکل کالج قائم کرنے کا ذمہ لے تو وہ اپنی جیب خاص سے پانچ لاکھ روپیہ کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرمائیں گے۔" چونکہ حافظ صاحب موصوف اس سے قبل بھی مسلمانوں کے مختلف تعلیمی اداروں کو کئی لاکھ روپے کے عطیات دے چکے ہیں اور آپ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اس لئے کانفرنس نے حافظ صاحب کی پیشکش کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اِس سلسلے میں موصوف سے تفصیلات طے کرنے کے لئے مراسلت ہورہی ہے۔ اور یقین ہے کہ مستقبل قریب میں حافظ صاحب کی فیاضی کی بدولت کانپور میں بھی ایک صنعتی و حرفتی کالج جس کی سخت ضرورت ہے معرضِ وجود میں آجائے گا۔

مختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی کانفرنس کا اجلاس آگرہ بہمہ وجوہ بہت کامیاب ہوا، جس کے لئے جملہ کارکنانِ کانفرنس نیز مجلس استقبالیہ کے متعدد ارکان اور عہدہ دار جنھوں نے بہت ایثار اور محنت سے کام کیا لائق مبارکباد ہیں۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے یہ صرف ایک اجلاس کی رُوداد کارگزاری اور صرف چند ماہ کی خدمت کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۸۸۶ء سے ۱۹۴۶ء یعنی گزشتہ ساٹھ سال کے عرصے میں اُس نے کس قدر قیمتی اور ٹھوس تعمیر ملی کی خدمات انجام دی ہیں ان کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ مسلمانانِ ہند کے اس عظیم الشان قدیم ادارے کی اہمیت و ضرورت کو خیال و زبان سے گھٹانا ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک عام فیشن سا ہوگیا ہے۔ اس کے بظاہر دو سبب سمجھ میں آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ

لوگ کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور اس کے میدانِ عمل کی وسعتوں سے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہیں بلکہ واقفیت پیدا کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش نہیں کرتے۔ یہ بات ہمارے علم و تجربہ کی ہے کہ اگرچہ دارالعلوم علیگڑھ کے ایک نہایت مرکزی مقام پر احاطۂ کانفرنس، اس کا عالیشان ذاتی دفتر سلطان جہاں منزل اور دوسری دو۔ ڈھائی لاکھ روپیہ کی خوشنما عمارتیں واقع ہیں۔ لیکن خاص علی گڑھ میں کافی اصحاب کو ان چیزوں کا علم نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مشہور ہے کہ خاص مکہ شریف میں بعض مستقل سکونت رکھنے والے لوگوں نے حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل نہیں کی ہے۔ کانفرنس کا ایک شعبہ تصنیف و تالیف، اس کی اپنی بک ڈپو، پچاس کے قریب مطبوعات اعلیٰ درجہ کی لائبریری، اور ایک ہفتہ وار اخبار ہے۔ لیکن ان کو ملاحظہ کرنے کی تکلیف نہیں اُٹھائی جاتی۔

اس ادارہ نے ملک کے طول و عرض میں صدہا چھوٹے بڑے اسکولوں اور کالجوں کی بنا رکھی، بعض کو خود چلایا اور ترقی دی۔ لاکھوں روپئے ضرورت مند طلبا کو وظائف میں دئے۔ مرکزی اور صوبائی گورنمنٹوں کے سامنے موثر انداز میں مسلمانوں کی شکایات اور تعلیمی حقوق کو پیش کرکے انھیں منوایا۔ لیکن ان میں سے کوئی بات معترض حضرات کو یاد نہیں رہتی۔ کانفرنس کا ایک مطبوعہ دستور ہے اس کے ماتحت عام ممبران میں سے ہر صوبہ کے مقررہ تناسب نمائندگی کے مطابق ہر سال مجلس منتظمہ کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ ہر پانچویں سال مجلس منتظمہ میں سے ستر ہ اصحاب کی مجلس عاملہ اور عہدہ داروں کا باقاعدہ انتخاب ہوتا ہے۔ مگر قواعد کو پڑھنے کی کسے فرصت ؟

کانفرنس کی اہمیت کم نظر آنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کی طرح اس کے کاموں میں شور و غل اور جوش و ہنگامہ نہیں ہے۔ جوں جوں ملک میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے، تعمیری کام کرنیوالی جماعتوں اور اداروں سے اسی تناسب کے ساتھ دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ کچھ مسلمانوں پر ہی موقوف نہیں ہے ہم نے "سرونٹ آف پیپل سوسائٹی لاہور" اور "سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی پونا" کو بھی قریب سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ اُنکی طرف بھی توجہ تیزی کے ساتھ روز بروز کم ہو رہی ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ورنہ ہم بتاتے کہ ان کے مقابلے میں ہماری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بدرجہا بہتر حالت میں ہے۔

مسلمانوں اور دوسرے اہلِ ملک کو دراصل انگریزوں سے سبق لینا چاہئے۔ کہ اس قوم نے گزشتہ سے پیوستہ جنگِ عظیم کے نازک ترین لمحوں میں اپنے یہاں ہائی اسکول تک کی مفت لازمی تعلیم کا قانون پاس کیا اور ایک دن کے لئے بھی اپنی تعلیمی اور اصلاحی کوششوں میں جنگ کی کھاگھمی کے باوجود کوئی کمی نہ آنے دی۔ تعمیری اور ہنگامی کاموں میں جب اس قسم کا توازن قائم رکھنے کی صلاحیت ہم میں پیدا ہو جائے گی تو ہماری قوم اور ہمارا ملک بغیر کسی وقت کے دوسروں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا ہرزہ سرائی کے باوجود بھی ہمیں یہ یقین نہیں ہے کہ کانفرنس کی بے عملی کے الزام سے اِس کے کارکن آئندہ کے واسطے محفوظ ہو جائیں گے۔ کیونکہ اتنے بڑے ملک اور اُس میں بسنے والے دس کروڑ مسلمانوں کے ہاتھوں میں غریب 'مصنف' اور اس کا یہ مقالۂ افتتاحیہ سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور ہماری کمزور آواز کروڑوں بنبہ در گوش ہمنواؤں کے جنگل کے ایک محدود گوشے میں گونج کر رہ جائیگی۔

اس حسرت ناک صورتِ حال کا چارہ کار بھی کیا ہو سکتا ہے ؟

ہمارے پیش رو بزرگ بھی اسی وقت سے دو چار تھے، اُن سے بھی اسی طرح سوال کیا جاتا تھا کہ :۔

کانفرنس کیا کرتی ہے ؟

یعنی کچھ نہیں کرتی۔ اور ایک بے کار جماعت ہے !!!

سر سید علیہ الرحمۃ کانفرنس کے بانی اور پہلے سکریٹری تھے، جب اُن پر مسلسل اعتراضات ہوتے رہے تو بالآخر دل تنگ ہو کر ۲۸ دسمبر ۱۸۹۰ء کانفرنس کے پانچویں اجلاس بمقام الہ آباد میں انھوں نے اپنی سالانہ رپورٹ میں فرمایا:۔

"جس کامیابی کی توقع پر ہم نے یہ سالانہ تعلیمی جلسہ قائم کیا ہے وہ کامیابی ابھی کوسوں دُور ہے۔ کسی کو ہمارے اس قومی جلسہ کی عیب جوئی ضرور نہیں ہے۔ ہم خود اُس کے نقصوں کو بیان کرتے ہیں۔ ہم خود کہتے ہیں کہ ہم کو اس کی کامیابی کی توقع نہیں ہے۔ مآل لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا۔ ہم خود اس کو اب تک فعلِ لغو اور بحث عبث اور قول بے عمل قرار دیتے ہیں۔ ہم خود کہتے ہیں کہ اب تک اس پر بے سُود روپیہ خرچ ہوتا رہا ہے۔ پس اس سے زیادہ اور کسی کے کہنے کو کیا گنجائش ہے۔ مگر کریں سو کیا کریں قوم کو مرتے ہوئے دیکھا نہیں جاتا۔ بیمار جاں بلب کو سب جانتے ہیں کہ دوا دینی بے سُود ہے۔ پھر بھی اُس کے حلق میں دوا ڈالے جاتے ہیں۔ یہ ہی ہم سے ہو سکتا ہے۔ نجات دینی یا نہ دینی خدا کے ہاتھ ہے۔"

اس یاس انگیز تقریر سے متاثر ہو کر علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے جو اجلاس میں موجود تھے ایک جوابی تقریر کی۔ اور سر سید کی تسکینِ خاطر کا حسب ذیل الفاظ میں سامان بہم پہونچایا۔

"بے شبہ یہ افسوس کی بات ہے کہ پارسال جو رزولیوشن پاس ہوئے ان کے مطابق عملی کارروائیاں بہت کم ہوئیں۔ نہ اسکالرشپ فنڈ میں کوئی معقول اضافہ ہوا نہ اعلیٰ تعلیم اور ادنیٰ تعلیم کے موازنہ پر مضامین لکھے گئے، تاہم میں سکریٹری صاحب کے ان الفاظ سے کہ ہماری کانفرنس بے فائدہ چیز ہے۔ اور مفت میں ہزاروں روپئے برباد کرتی ہے، ہرگز اتفاق نہیں کر سکتا بلکہ اگر سکریٹری صاحب معاف فرمائیں تو

میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی یہ رائے غلط اور بالکل غلط ہے۔ بے شبہ ایک ایسا شخص جو ایک عمر سے اِن کوششوں میں معروف ہے، جس نے اِنھیں افکار میں اپنے بال سپید کر دیے، جس کو معمولی طور پر دنیا میں زیادہ رہنے کی توقع نہیں رہی ہے، ضرور ہے کہ اس کا دل تھوڑی سی بات پر رنجیدہ ہو اور اس حالت میں وہ مجبوراً نا امیدی کے الفاظ کہہ اُٹھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ برسوں کے کام دو دن میں نہیں ہو سکتے۔ قوم میں ایک مدت سے خاموشی چھائی ہوئی تھی، تعصب، غفلت، جہالت کی کچھ حد نہیں رہی تھی، تمام روحانی قوتیں افسردہ ہو گئی تھیں۔ دل و دماغ عموماً بیکار ہو گئے تھے، کیا ایسی مُردہ قوم صرف دو چار لکچروں اور اسپیچوں سے سنبھل سکتی ہے۔

ایسی مُردہ قوم کیلئے کم از کم پچاس برس کا زمانہ درکار ہے کہ اس کو ترقی کا خیال بھی آئے۔"

مارچ ۱۸۹۸ء میں سر سید علیہ الرحمۃ کا انتقال ہوا اور نواب محسن الملک ان کی جگہ کانفرنس کے آنریری سکریٹری ہوئے۔ چھ سال کام کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۰۴ء کے اجلاس کلکتہ میں مرحوم نے اپنی تقریر میں کانفرنس کی بے عملی کے اعتراضات پر اسی طرح تبصرہ کیا:۔

"اگرچہ یہ کانفرنس اٹھارہ برس سے قائم ہے، ہر سال شاندار جلسے ہوتے ہیں، نئے نئے رزولیوشن پاس ہوتے ہیں اور فصیح و بلیغ لکچر دیے جاتے ہیں، لیکن نہایت افسوس ہے کہ اصل نتیجہ بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ رزولیوشنوں کی تعمیل نہیں ہوتی۔ میں چونکہ کانفرنس کا سکریٹری ہوں، لہٰذا سب سے زیادہ مورد ملامت میں ہوں اور کانفرنس کی اس ناکامیابی پر خود شرمندہ ہوں۔ شرمندگی سے کام کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

اس اجلاس کے صدر مسٹر ماریسن تھے۔ آپ نے نواب صاحب کی تقریر ختم ہونے پر ارشاد فرمایا کہ:۔

"عملی کام نہ ہونے کی سب شکایت کرتے ہیں۔ لیکن رُوپیہ کا انتظام نہیں کیا جاتا جس سے کام ہو۔"

۱۹۰۵ء میں قریباً آٹھ سال کام کر کے نواب محسن الملک نے کانفرنس کے بارے سبک دوشی حاصل کر لی اور اُن کی جگہ نواب وقار الملک آنریری سکریٹری اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے، تقریباً بارہ سال یعنی ۱۹۱۷ء تک صاحبزادہ صاحب کانفرنس کے روح رواں رہے۔ بہترین کام ہوا لیکن بے عملی کے الزام سے کانفرنس ایک دن محفوظ نہ رہ سکی۔ صاحبزادہ صاحب کے زمانے میں کانفرنس کے خلاف بکثرت مضامین اور پمفلٹ نکلے۔ جن میں "کانفرنس پر ایک نظر"... "دوسری نظر"... اور "تیسری نظر" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ (اسی بنا پر صاحبزادہ صاحب نے اجلاس راولپنڈی منعقدہ ۱۹۱۴ء میں کانفرنس کے "ماضی، حال اور مستقبل" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں ارشاد فرمایا:۔

"گزشتہ چار سال کے واقعات اور حالات کے سبب سے قوم کی توجہ میں انتشار پیدا ہو گیا ہے اور سابق میں جو دلچسپی تعلیمی تحریک سے تھی اُس میں فرق آ گیا ہے.... اس میں شک نہیں کہ ۲۸ سال سے یہ کانفرنس قائم ہے اور برابر قوم نے اُس کی قدر اور مدد کی لیکن کچھ عرصہ سے اس قسم کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کہ

ابتک کانفرنس نے کچھ نہیں کیا' اور اس لئے آیندہ اس کے قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں.....''

اس اعتراض کا جواب کہ کانفرنس نے اسوقت تک کچھ نہیں کیا' صاحبزادہ صاحب نے تفصیل کے ساتھ دیا نیز آئندہ کے متعلق ایک پروگرام بھی پیش فرمایا۔ ۱۹۱۷ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب ممبری کونسل وزیر ہند کے عہدہ پر مامور ہو کر انگلستان تشریف لے گئے' اور موصوف کی جگہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کا انتخاب بعہدۂ جوائنٹ سکریٹری کانفرنس عمل میں آیا۔

۱۹۲۰ء میں کانفرنس کے جدید قواعد منظور شدہ اجلاس امراؤتی کی رُو سے مسلم یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر سر راجہ صاحب محمود آباد کانفرنس کمیٹی کے مستقل پریسیڈنٹ اور نواب صدر یار جنگ بہادر تین سال کے لئے آنریری سکریٹری مقرر ہوئے۔ ساتھ ہی ۱۹۲۲ء میں مولانا سید طفیل احمد صاحب جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔ جناب نواب صاحب اسوقت تک بحمداللہ کانفرنس کی خدمت کر رہے ہیں۔ مولانا طفیل احمد صاحب البتہ ۱۹۳۵ء میں اپنی دوسری علمی اور قومی مصروفیتوں کی وجہ سے جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے' اور انکی بجائے خان بہادر پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی ایم۔ اے کام کر رہے ہیں۔

چونکہ دُنیا کا یہ عام دستور ہے کہ ہمیشہ گزرے ہوئے زمانہ اور اُسوقت کے کارکنوں کو اچھا اور موجودہ دَور اور اس وقت کے لوگوں کو بُرا کہتے ہیں۔ ماضی پر فخر اور حال پر اعتراضات کی بھرمار ہوتی ہے۔ اس لئے موجودہ عہدہ داروں کی مخلصانہ خدمت گزاری سے بھی بعض لوگ مطمئن نہیں ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ:۔

''کانفرنس نے سر سید محسن الملک۔ وقار الملک اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کے زمانے میں تو خوب کام کیا اور ترقی کی لیکن اب اس کا عدم وجود برابر ہے۔''

اگرچہ یہ یقین ہے کہ آیندہ جلد یا بدیر اسوقت کے کارکن کام چھوڑ دیں گے تو ان کا شمار بھی اچھے کام کرنے والوں میں ہو جائیگا اور دنیا اس بات کو بالکل فراموش کرنے گی کہ ان میں بھی کوئی بُرائی تھی۔ لیکن چونکہ دنیا کی اس تلون مزاجی اور حافظہ کی کمزوری سے مخلص کارکنوں کا بروقت اعترافِ خدمت نہیں ہوتا۔ جس کے نتیجے میں سخت ہمت شکنی اور قومی کام کو نقصان پہونچتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ معترض حضرات محض اعتراضات کر کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہ کریں' اور کانفرنس کو ایک قومی امانت سمجھ کر اس کی ہمدردانہ خدمت گزاری کو اپنا شعار بنائیں۔ اُن کے طرزِ عمل میں اس مبارک تبدیلی سے انشاء اللہ ''ماضی'' کی طرح کانفرنس کا ''مستقبل'' بھی روشن ہونے میں بہت کچھ مدد ملے گی +

سید الطاف علی بریلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رُوسی اَدَب کی عالمگیر اہمیّت

(از جناب ل۔ احمد صاحب اکبر آبادی)

پچھلے سَو سال میں ایسا کوئی زمانہ نہیں گزرا کہ دُنیا نے رُوسی اَدب کی عظمت کا اعتراف نہ کیا ہو۔ زمانۂ حال میں بھی جب رُوس کا نام لینا بھی خطرناک سمجھا جاتا تھا گورکی متعدد تصانیف، شولاخوف کی QuiteFlowsTheDon اور الیکزی ٹالسٹائی کی RoadTo Calvary قسم کی اہم اور وزنی کتابوں نے رُوسی ادب کی روایت کو قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اُس کی عظمت و اہمیت میں اضافہ کیا۔

بین الاقوامی اَدب اور زندگی کے دوسرے معاملات کے متعلق ہم ہندوستانیوں کی معلومات کا ذریعہ انگریزی زبان ہے۔ لیکن رُوسی اَدب اور زندگی کے متعلق خود انگریزی زبان میں باوجود بہت بڑا ذخیرہ موجود ہونے کے جو معلومات ہیں وہ رُوسیوں کی نظر میں ناقص ہیں بایں ہمہ انگریزی زبان میں رُوسی کتابیں اُس وقت بھی منتقل ہوتی رہیں جب سوویٹ نظام قائم ہونے کے بعد رُوس کا ذکر تک سرمایہ دار ملکوں میں بغاوت کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ اور صرف یہی ایک حقیقت امر رُوسی اَدب کی بڑائی اور برتری ثابت کرنے کو کافی ہے۔

پھر جب یورپ کی زبانوں اور خاص کر انگریزی میں جو ہماری معلومات کا ذریعہ ہے کامل اطلاعات موجود نہ ہوں تو نہ صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر قوم کے لئے صحیح اندازہ کر سکنا

مشکل ہے کہ دُنیا کی اَدبی ترقی میں رُوسی اَدب کا کیا درجہ اور کتنا حصّہ ہے۔ میں سوویٹ مصنّفہ تمارہ موتی لوفا[۱] کا اِس مضمون کی تیاری کے لئے بے حد ممنون ہوں۔

اس مصنّفہ کا نام میری نظر سے اگرچہ پہلی مرتبہ گزرا، لیکن موضوع بحث کی اہمیت سے قیاس ہوتا ہے کہ تمارہ کوئی دوسرے درجے کی لکھنے والی نہیں ہے۔ ایک دوسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ سوویٹ نظام نہایت پچھڑی ہوئی قوموں میں بھی ایسے مصنّف پیدا کر رہا ہے۔ علم دوست قوموں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ سوویٹ رُوس کی اَدبی و علمی زندگی کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔

رُوسی ادب کو بہتر سمجھنے کے لئے رُوسی زبان کی بعض خصوصیات کا علم ہو جانا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ رُوسی ادب کی تیز ترقی اور اس کی گہرائی یا بلندی کے صناعانہ اظہار میں رُوسی زبان کو اتنا ہی دخل ہے جتنا رُوسی ادب کی ان خصوصیات نے خود رُوسی زبان کو ہر ممکن اظہار خیال پر قادر کر دیا۔

مشہور عالم رُوسی سائنسداں LAMONOSOV اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل میں یعنی آج سے تقریباً دو سو سال پہلے لکھ گیا ہے کہ "شاہ رومہ چارلس پنجم نے کسی سے کہا تھا کہ آدمی کو خدا سے بات کرنا ہو تو اسپینی زبان میں کرے، دوستوں سے گفتگو فرانسوی زبان میں کرے، دشمنوں کے سامنے جرمن زبان استعمال کرے، اور صنفِ نازک کو اطالوی زبان میں مخاطب کرے۔ لیکن شاہ رومہ اگر رُوسی زبان جانتا ہوتا تو یقیناً یہ کہتا کہ آدمی کو جس سے بھی بات کرنا ہو رُوسی زبان میں کرے۔ اس لئے کہ رُوسی زبان میں اسپینی کی سی شان و شوکت ہے، فرانسوی کی سی شگفتگی و زندہ دلی ہے، جرمن کی سی درشتی ہے، اور اطالوی کی سی نرمی اور لوچ ہے۔ اور ان سب خوبیوں کے علاوہ اس میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا سا ایجاز و اختصار اور تمول و قوتِ بیان موجود ہے۔

---

[۱] تمارہ یقیناً ترکستان میں زنانہ نام ہے۔ تمارہ خانم ایک مشہور اُزبک مغنیہ و رقاصہ ہے جس نے تمام یورپ کے بائے تختوں سے اپنے فن و کمال کا خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ موتی لوفا، میں سمجھتا ہوں کہ مطیع اللہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ رُوسی عورتوں کے نام بالعموم لفظ "فا" پر ختم ہوتے ہیں۔ چنانچہ تمارہ موتی لوفا، میرے قیاس کے مطابق ترکستانی ہے۔ ل۔ احمد

الیکزی ٹالسٹائی رُوسی زبان کے اوصاف بتا کر اُن اوصاف کو اس عہد کی ادبی خصوصیات کے زیادہ موافق و مطابق بنا دیتا یعنی اس کی نوعیت بیان کر دیتا ہے :-

"روسی زبان تمام زبانوں سے زیادہ جادو بھری زبان ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ رُوسی ادبی زبان عوام کی بول چال سے اتنی مختلف اور جُدا نہیں جتنا کہ اور زبانیں ہیں - بول چال کی اور تحریر کی رُوسی زبان بہت زیادہ قریب ہیں - اور روسی زبان کسی قسم کی آمیزش اور تصنع کو بھی قبول نہیں کرتی - اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے - لیو ٹالسٹائی ہر قسم کی آمیزش کا مخالف تھا اور وہ اپنی اس مخالفت سے صداقت کو روشن کر گیا اور رُوسی الفاظ کی ساحری کو بڑھا گیا - رُوسی زبان اوّل و آخر پشکن کی زبان ہے، اور اس کا خزانہ لارمانتوف، ٹالسٹائی، لیسکوف، چیخوف، اور گورکی ہیں -

۱۸۸۸ء میں شاید سب سے پہلے ENGEL نے اس واقعیت نگاری (REALISM) سے الگ جو فرانس میں رومانوی دور کے بعد رونما ہوئی (زولا وغیرہ جس کے پیرو تھے) اصلاح تعریف (؟) کی "مصنف کا عندیہ یا خیال بیان ہو جانا ہی صحیح نہیں ہے بلکہ اس خیال کو کردار کی صورت میں متشکل ہونا چاہئے، اور مصنف کی غایت یا مقصد پلاٹ کی ترتیب دینے اور صورت حال (SITUATION) کو تصنع یا آورد کے بغیر پیش کرنے میں مرکوز ہونا چاہئے"۔

ENGEL نے واقعیت نگاری کی یہ نئی تعریف قائم کرنے میں ایسکی لاس، ڈانٹے، سروانتے کے علاوہ رُوسی ناولوں سے مثالیں پیش کی ہیں - اور جن رُوسی ناولوں سے اس نے یہ مثالیں لی ہیں وہ ایک پورا سلسلہ نہیں، بلکہ ایک جلوس ہے جس میں ترجنیف، ٹالسٹائی، دوستو یفسکی وغیرہ سلسلہ وار چلے آتے ہیں - اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ آنٹریل کے سامنے اُنیسویں صدی کے نصف آخر کا تمام رُوسی ادب تھا - ان ناولوں کو آنٹریل نے "افضل و اعلیٰ" کہہ کر ان کا حوالہ دیا ہے -

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مغربی یورپ نے رُوسی اَدب کا مطالعہ محض فیشن کی خاطر شروع نہیں کیا بلکہ اس کی بنا، اِس حقیقت پر تھی کہ یورپ کا اَدب رُوسی اَدب سے شدت کے ساتھ متاثر ہو رہا تھا، اور اس مطالعہ کی اہمیت تقریباً سَو سال کی مدت میں برابر بڑھتی رہی ہے۔

خود رُوس کے اندر رُوسی اَدب کی اہمیت کا احساس شاید سب سے پہلے بیلنسکی کو ہوا -
بیلنسکی ایک مشہور مفکر و نقاد تھا اور اس کا زمانہ اُنیسویں صدی کا وسطی زمانہ ہے - وہ لکھتا ہے :-

"....... یہ قوت واستحکام کسی ایسی قوم میں آ ہی نہیں سکتا جو داخلی بروز یعنی تدریجی ترقی

حاصل نہ کر رہی ہو۔ بلاشبہ ہماری قومی زندگی کا وجود ہے اور یہ مقدر ہے کہ رُوس دُنیا کو اپنی بات سنائے! لیکن دُنیا کے لئے ہمارا پیغام کیا ہوگا؟ اس پر توجہ کرنے کا وقت آج نہیں ہے، اس پیغام کا علم ہمارے پوتے پروتے حاصل کریں گے اور ہمارا پیغام دُنیا انھیں کی زبان سے سُنے گی!"

۱۹۰۲ء میں لینن نے یہ بتاتے ہوئے کہ رُوسی اَدب کس طرح عالمگیر اہمیت حاصل کر رہا ہے اُسی احساس کا اظہار کیا جو بیلنسکی کا تھا۔ پھر چند ہی سال بعد لینن نے ٹالسٹائی کی اَدبی اہمیت کو ان لفظوں سے اُجاگر کیا کہ:۔

"ٹالسٹائی کے اَدب نے انسان کی ذہنی و فکری اور کلچری و ثقافتی ترقی کو نہایت تیز کر دیا ہے۔"

تہذیب کی دُنیا میں رُوسی ادب کو کیا درجہ و اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق گورکی کا قول ہے کہ:۔

"یورپی اَدب کی تاریخ بروزیں ہمارا نوعمر رُوسی ادب حقیقتاً ایک منظر (PHENOMENON) کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں کہ کسی قوم و ملک کا اَدب اس قوت اور ایسی تیزی سے، جو ہمہ قابلیت کی ایسی سیلابی صورت میں رونما نہیں ہوا جس طرح رُوسی اَدب وجود میں آیا۔ کسی قوم نے آتنی بہتر و اعلیٰ اور ایسی عالمگیر مقبولیت پانے والی کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ کسی قوم نے ایسے دُشوار حالات کے اندر اتنے اونچے پائے کا اور ایسا حسین اَدب پیدا نہیں کیا۔ تاریخ اَدبیات کا تقابلی مطالعہ بآسانی ثابت کر دیتا ہے کہ پچھلے سَو سال کی قلیل مدت میں بلند مرتبہ اَدیبوں کا ایسا عظیم الشان جلوس دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکی ہے۔ ہمارا اَدب ہمارا سرمایۂ فخر و غرور ہے...... رُوسی اَدب کی قوت اور اُس کے حُسن و جمال نے دُنیا کو ششدر کر دیا ہے........"

اپنے اَدب کے متعلق رُوسی اہلِ قلم کا خیال و احساس ان چند مثالوں سے پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ مگر رُوسی اَدب کی عالمگیر اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم دُنیا کے بلند پایہ اَدیبوں اور نقادوں کے تاثرات معلوم کریں۔ لیکن رُوسی اَدب کے متعلق غیر رُوسی اہلِ قلم کی رائے معلوم کرتے وقت یہ نکتہ سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے کہ رُوسی اَدیبوں کے خیال میں دُنیا ابھی تک صحیح اور واقعی طور پر رُوسی ادب کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکی ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ مغربی نقادوں نے رُوسی اَدب کو ناقص و ناکافی ترجموں کے ذریعے سے جانا ہے، اور رُوسی اَدب پر یورپ میں جو تبصرے ہوئے ہیں اُن میں واقعات کی غلطیاں ہیں۔ یہ تبصرے مبالغے سے خالی نہیں اور بعض صورتوں میں رجعت پسندی لئے ہوئے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ تنقیدیں چونکہ رُوس سے باہر کی دُنیا میں رُوسی اَدب کے پڑھنے والوں کی رائے کا اظہار کرتے ہیں، اس لئے قابلِ قدر ہیں۔

رُوسی اَدب پر سب سے پہلے جس یورپی اَدیب نے توجہ کی وہ فرانس کا مشہور نثر نگار میریمے (P. MERIMEE) تھا۔ ترجنیف کے قول کے مطابق میریمے نے پشکن کو قدیم یونانی اساتذہ کا ہم پلہ ٹھیرایا ہے۔ رُوس سے باہر پشکن کی فطانت یا جینیس کا پورا اندازہ نہیں کیا جاسکا اور اسی وجہ سے باہر کے ملکوں میں پشکن کو وہ شہرت حاصل نہ ہوئی جو اسے خود اپنے وطن میں حاصل ہوئی۔ اس کے کئی سبب تھے۔ بہرحال پشکن کی شاعری پر مختلف زبانوں میں تبصرے لکھے گئے اور یہ سب میریمے کی تائید کرتے ہیں۔

۱۹۲۳ء میں جرمن نقاد گنتھر (J. VON GUENTHER) لکھتا ہے:۔

"موجودہ زمانہ مانتا ہے کہ الیگزنڈر پشکن کی جگہ ان غیر فانی ہستیوں کی صف میں ہے جن کی ابتدا ہومر سے ہوتی ہے، اور جس میں یورپ بھی ڈانٹے، شکسپیر، کالدرون اور گیٹے شامل ہیں۔ ان پانچ غیر فانی ہستیوں کے ساتھ چھٹی پشکن کی ہستی ہے۔"

جرمن نقاد کی اس فہرست کو ممکن ہے کہ "خود رائی" سے تعبیر کرنے والے بھی موجود ہوں لیکن اسے کیا کہا جائے گا کہ دوسرے غیر رُوسی اہلِ قلم بھی رُوسی کلاسکی ادب کو ہمیشہ سے برترین ضاعت مانتے آئے ہیں، اور رُوس کے اَدبی کارناموں کا ذکر تاریخ کے نہایت زرخیز عہد یعنی زمانہ قدیم اور "رینے سانس" کے کارناموں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

ہیپولیت تین (H. TAIN) نے ترجنیف کو قدیم یونانی صناعوں کی صف میں کھڑا کیا ہے۔ روماں رولاں نے گورکی کو ڈانٹے کے مقابل رکھا اور مغربی یورپ کے نقاد مسلمہ طور پر ٹالسٹائی کو ہومر کا اور دوستویافسکی کو شکسپیر کا مماثل قرار دیتے آئے ہیں۔

لیکن اس تمام اعتراف و قدردانی کے اندر ایک یہ بات سامنے آتی ہے کہ غیر ملکوں میں رُوسی اَدب کی قدر بس اسی بنا پر ہوتی ہے کہ اس کے اندر وسیع امکانات ہیں اور دُنیا کے اَدب میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رُوسی اَدب کے اصل خط و خال کے بارے میں غیر رُوسی اَدیب و نقاد ہم خیال نہیں ہیں۔ تعریف اور قدردانی کے اس اختلاف پر جرمن مصنفہ روزا الیگزبرگ نے اپنی تصنیف SOUL OF RUSSIAN LILERATURE میں صحیح زاوئے سے نظر ڈالی ہے۔ اور وہ لکھتی ہے:۔

"رُوسی اَدب مغربی اَدب کا شاگرد بھی ہے اور استاد بھی۔ رُوسی ادب کی تیز ترقی کی ممتاز خصوصیت

یہ حقیقت ہے کہ وہ عصری نظام حکومت کی مخالفتوں کے اندر پروان چڑھا اور آزادی کی جدوجہد کی اسپرٹ کے اندر پھلا پھولا۔ رُوسی اَدب کی یہ خصوصیت اس کے پوری اُنیسویں صدی کے ارتقا میں نظر آتی ہے۔ رُوسی اَدب میں فکری جوہر کی گہرائی اور تموّل، جوہر و جدت، اور رضا عانہ شکل و پیکر کی صراحت بھی اسی حقیقت کے اندر چھپی ہوئی ہے کہ وہ حکومت کی مخالفت اور عوام کی جدوجہد کے اندر پلا بڑھا ہی یہی نہیں، بلکہ رُوسی اَدب کی قوتِ محرکہ اور اس کی الہامی نوعیت بھی اسی حقیقت سے واضح ہوتی ہے!"

رُوسی اَدب کے مغربی مطالعہ کرنے والوں میں روزا لیگزمبرگ کے علاوہ چند ہی اہلِ نظر ہونگے جنھوں نے رُوسی اَدب کے ترقی پسندانہ جوہر اور حریت پرستانہ اساس کو سمجھا ہو۔ لیکن یہ چند نقاد بھی جنھوں نے رُوسی اَدیبوں کی شدید قسم کی جمہوریت پرستی اور ان کے ادب میں قومی خصوصیت کو سمجھا ہے، جب اس کا اعتراف کرتے ہیں تو وہ اعتراف سرسری اور عمومی ہوتا ہے، گہری فہم اور سچی قدردانی پر مبنی نہیں ہوتا۔ فرانسوی نقاد ژول لیگرا (JULELEGRAS) ایسے لوگوں کا نمونہ ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"انیسویں صدی کے رُوسی اَدب کے اندر جدت یا اُپج کی شدت و کثرت کی علت یہ ہے کہ اس کا تعلق اپنے عوام سے کسی وقت بھی ترک نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔"

دوسری مثال میں پولستانی نقاد بروکنر (ELERANDER BRUCKNER) کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ بروکنر اپنی رُوسی اَدب کی تاریخ کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ:۔

"رُوسی اَدب دُنیا میں سب سے کم عمر ادب ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی نوعمری کا نعم البدل اس کی کثرتِ پیداوار سے، اس کے اندر اُپج کی کثرت سے، اس کی اخلاقی قدروں سے، اس کی دیانت اور سچائی کی تعلیم سے روحِ انسانی کے گہرے مطالعے اور زندگی کے متجسس مشاہدے سے اور اس کی راست بیانی اور جمہوری اسپرٹ سے ہوجاتا ہے۔ پڑھنے والا اس اہمیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو رُوسی اَدب نے رُوس کے اندر حاصل کرلی ہے، اور اس اعتبار سے رُوسی اَدب دُنیا کے ہر اَدب سے ممتاز و مختص ہے۔۔۔۔
رُوسی اَدب درحقیقت ایک منبر ہے جس پر خیر و حُسن کی محافظت اور حریت و انسانیت کی مدافعت کا وعظ ہوتا ہے! رُوسی اَدب فی الواقعہ ضمیرِ عامہ کا اظہار ہے، اس لئے کہ وہ ہر قسم کے جبر و تشدد، تمام غیر اصولی طریقوں، ظلم اور ظالم کی موافقت، اور ایسی ہر بات کی مذمت و ملامت کرتا ہے۔ اسی بنا پر رُوسی اَدب کی اخلاقی قدر سب سے زیادہ بلند ہے۔۔۔۔۔۔۔"

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رُوسی ادیبوں کا یہ خیال صحیح ہے کہ غیر رُوسی اہلِ قلم رُوسی اَدب کو اس کی اخلاقی قدروں کی بنا پر سراہتے ہیں، اور ان کے اندر یہ رجحان کام کرتا ہو کہ وہ رُوسی اَدب کو ایک مبہم سی انسانیت پرستی کی اسپرٹ تک محدود رکھیں، اور ان کا یہ رجحان اس شعوری یا غیر شعوری خواہش کا نتیجہ ہو کہ رُوسی اَدب کے ترقی پسندانہ خط و خال کو دھندلا بنا دیا جائے۔

اس کوشش کا ایک واضح ثبوت امریکن نقاد و ادیب نوئس (R. NOYES) کی تحریر سے مل جاتا ہے۔ نوئس کا دعویٰ ہے کہ :۔

"رُوسی اُدب کی سوشل یا سماجی قدر بڑی حد تک خیالی یا وہمی ہے' اس کی اہمیت اولاً صناعانہ اور اخلاقی ہے ـــــ سماجی زندگی سے اس کا بس دُور کا واسطہ ہے!"

غیر رُوسی نقادوں کا یہ زاویۂ نظر ان کو وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں پہنچ کر وہ رُوسی ادیبوں کو ولیوں کا درجہ دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرانسوی نقادوں کی تحریروں میں تقوائے و تقدس (SOCIAL BIETY) کا لفظ بار بار استعمال ہوتا ہے۔ ژان (JEAN) شوزویل (CHOUSEVILLE) رُوسی شعر پر اپنی تصنیف میں لکھتا ہے کہ :۔

"روسی اُدب کا مشن ضمیر انسانیت کو گہرا بنا دینا ہے۔"

فرانس سے باہر دوسرے ملکوں میں بھی عام خیال یہی ہے۔ چنانچہ اسٹیفان زوائگ (STEFAN ZWEIG) نے ٹالسٹائی کے باب میں بالکل یہی بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"ٹالسٹائی نے ضمیر انسانیت کو گہرا کر دینے کے سوا کچھ نہیں کیا۔"

لیکن اس کے برخلاف رُوسی اہلِ قلم مدعی ہیں کہ :۔

"روسی اُدب کی عالمگیر اہمیت اس کی جمہوریت پرستی میں ہے!"

مغربی نقاد اپنی نظر کو رُوسی اُدب کے اخلاقی پہلو تک محدود کر کے فی الواقع اس قابل نہیں ہے کہ وہ اس کی ذہنی و فکری طاقت اور اخلاقی و صناعانہ عظمت کا اندازہ کر سکتے۔ یہ لوگ صرف "روسی اسپرٹ" کے قابل قدر وصف کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کو رُوس کی سرقبیلہ (PA TIARCHAL) دَور کی پس ماندگی بھی بیان کرنا پڑتی ہے جو قبل انقلاب کی رُوسی زندگی کی خصوصیت تھی۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جو انھیں غلط نتیجے نکالنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ پُرانے رُوسی اُدب کی عظمت کا راز اس کی سرقبیلہ زندگی میں نہ تھا بلکہ اس زندگی کی پس ماندگی دُور کرنے کی کوشش میں تھا۔

رُوسی اُدب کی عظمت اور عالمگیر اہمیت کی بنیاد سمجھنے کے لئے تاریخ کے اس پہلو کو نظر سے اوجھل نہ ہونا چاہئے کہ رُوسی اُدب "سرفیت" (زرعی غلامی) کے اجزا کے خلاف احتجاج اور

جدوجہد کرتا چلا آیا ہے۔ زمانہ حال کے رُوس کی تاریخ قومی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اور اس جدوجہد کے اندر سے ہی وہ روایات پیدا ہوئیں اور پلی بڑھیں جو لینن کی نظر میں علم و روشنی کی بنیادیں ہیں۔ اور یہ روایات عوام کے حقوق کے لئے سینہ سپر ہو جانے کی روایات ہیں۔ پھر یہ روایات ہی وہ سوتے ہیں جن سے رُوسی اہلِ قلم کے اوصاف کے چشمے اور دریا بہے، وہ اوصاف جن کو آج کا یورپ "قابلِ احترام" کہتا اور مانتا ہے۔

جدید رُوس میں جو سماجی ترقی ہوئی اور جس شدت اور تیزی کے ساتھ ہوئی اس کا تجربہ عہد تاریخ کے کسی دَور میں کسی قوم یا ملک کو نہیں ہوا۔ مابعد اصلاحات (POST-REFORM) رُوس کا ذکر کرتے ہوئے لینن نے کہا ہے کہ :۔

"روس میں جو تبدیلیاں دس دس اور بیس بیس سال کے اندر مکمل ہو گئیں ایسی تبدیلیوں کے لئے دوسرے ملکوں کو صدیاں درکار ہوئیں۔"

رُوس کے سماجی تغیر کا یہ امتیاز ظاہر ہے کہ جدید رُوس کے اَدب کی تیز رفتاری کا نتیجہ تھا۔ رُوسی اَدب نے ناقابلِ یقین مختصر مدت میں یورپ کے فلسفہ و ادب کے بہترین اجزا کو جزو بدن بنا لیا اور رُوسی زندگی پر منطبق کر کے وہ قومی کلچر اور صناعت پیدا کر دی جس کے اندر عالمگیر اہمیت تھی۔ پشکن کی تصانیف "ریفے سانس" عہد کی صناعتی غایت کا نظریہ، تعقل کی روشنی اور ترقی پسند رومانیت کا ورثہ ہیں، اور بایں ہمہ، واقعیت نگاری کے بنیادی اصول کا پیکر ہیں۔ اور اسی خصوصیت کو غیر رُوسی علما رُوسی اَدب کی نمایاں خصوصیت باور کرتے ہیں جس نے رُوسی اَدب کے اندر جدت یا اُپج کا مادہ پیدا کیا۔

غور طلب پہلو یہ ہے کہ اُنیسویں صدی میں رُوسی اَدب کے رجحان وہی تھے جو یورپ میں ترقی پسندانہ خیال اور صناعت کے رجحان تھے۔ اور جو موضوع یا مسئلے یورپ کے پیشرو اہلِ قلم کے سامنے تھے ویسے ہی موضوع و مسائل رُوسی اَدیبوں کے سامنے بھی تھے۔ مگر اس وجہ سے کہ رُوسی واقعیت نگاری حریت اور جمہوریت کی اسپرٹ میں ڈوبی ہوئی تھی، رُوسی اَدیبوں نے ان مسائل کا حل اس طریقے سے نہیں ڈھونڈا جو یورپ کا طریقہ تھا۔ انھوں نے ان مسائل کا وہ حل نکالا جو ان کے طریق کے لئے مخصوص تھا۔ اور اس لئے کہ رُوسی اہلِ قلم ہمیشہ رُوسی عوام کی

قومی آزادی کی تحریک کے ساتھ رہے اس لئے وہ واقعیت نگار ضاعت کے اندر موضوعات کی تعبیر کرنے میں اس تحریک سے برابر اثر لیتے رہے۔

گورکی نے بار بار بتایا ہے کہ اُنیسویں صدی کے نوجوان کا افسانہ یا دوسرے لفظوں میں انفرادی حصول مسرت کی خواہش اُنیسویں صدی کے یورپی ادب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس دور کے مستند یورپی ادیبوں کے ادبی کردار معلوم ہوتا ہے کہ خواہی نخواہی وجود میں لائے گئے ہیں جن کو بورژوا سماج اسی مقصد کے لئے پیدا کرتی ہے۔ اس حقیقت کو بلزاک کا پیدا کیا ہوا کردار RASTIGNEC نہایت واضح طور پر پیش کر دیتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ یورپی ادیب اس بات سے ناواقف نہ تھے کہ بورژوا تعلیم یافتہ طبقے کی راہ ایسی ہی بے غیرتی اور پندار کی راہ ہو سکتی ہے۔

ہیگل نے یورپ کی کلاسکی واقعیت نگاری کا خلاصہ بتاتے ہوئے ایک ناول کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ اس ناول کا ہیرو اپنی بلند آرزؤں اور بلند خیالات کے ساتھ بالآخر زمانے کے تعلقات یا زندگی کے رشتوں اور سوچنے کے طریقوں کے جال میں پھنس جاتا ہے، اور آخری تجزئے میں وہ ویسا ہی عامیانہ خیالات اور پست آرزؤں کا آدمی بنجاتا ہے جیسے اور اس کے اردگرد نظر آتے تھے۔ کلاسکی جمال پرست بورژوا اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اُس سماج کے افراد کا معمولی یعنے NORMAL طریق صرف ذاتی بہبود اور بھلائی ہے۔

یورپی ادب کے اس انداز کے برخلاف رُوسی اَدب نے انیسویں صدی کے نصف اوّل ہی میں نہایت پُرزور طریق پر اور قطعیت کے ساتھ اس عقیدے کو مسترد کر دیا تھا کہ انسانی ہستی کا مقصود افراد کے اندر ملکیت کی اغو ہے اور بس۔ چنانچہ زار شاہی کے اس دور میں بھی جب "سرفیت" کا رواج تھا خود غرضی اور طمع کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ لالچ مکروہ ترین خاصۂ انسانی تھا اور کسی نہایت قدیم اور متروک نظامِ زندگی کا پس ماندہ سمجھا جاتا تھا۔

موجودہ حالات میں اونچے درجے کی سماج میں پیدا ہونا نکمی اور طفیلئے کی زندگی بسر کرنے کا ہم معنی ہو گیا ہے۔ اور چونکہ پُرانے رُوس میں انسان کا انسان کی لوٹ کھسوٹ کرنا عام بات تھی، اس لئے رُوس کے تمام اعلےٰ مصنف اس خود غرضی کی مخالفت، اور اس کی بُرائیوں کا اعلان

مختلف صورتوں سے کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک قابل ذکر بات ہے کہ پشکن نے فرانسوی ناول نویسوں کو اس لئے ملامت کی کہ وہ فسق و فجور کو پسندیدہ چیز بنا کر پیش کرتے ہیں اور انھیں انسانی زندگی میں خود غرضی و خود پرستی کے سوا کوئی دوسری شے نظر ہی نہیں آتی۔ اس امر واقعہ سے اُنیسویں صدی کے رُوسی اور یورپی ادب کے اخلاقی معیار کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔

اخلاقیات کے ذیل میں روسی اہلِ قلم کی یہ سخت گیری تاریخی اور مقصودی (OBJECTIVE) چیز تھی۔ اس لئے کہ رُوسی زندگی جن حالات میں گزر رہی تھی اس کا اقتضاء تھا کہ رُوسی اُدیب اس اخلاقی معیار سے برتر اخلاقی معیار کا مطالبہ کریں جو اس وقت کا یورپی اُدب پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ اُنیسویں صدی کے نوجوان کی طرزِ زندگی کا مطالعہ کرنے میں رُوسی اُدیبوں نے یہ دیکھنے کے عوض کہ وہ ایک فرد کی حیثیت سے خوش حالی کیونکر حاصل کرتا ہے یہ دیکھا کہ وہ سماج کا ایک فرد ہونے کے اعتبار سے اپنا سماجی فرض کس طرح ادا کرتا ہے۔ زواگ نے اس پہلو سے رُوسی اور یورپی ادب کا دلچسپ مقابلہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

> "ڈکنس کے تمام کرداروں کی برترین خواہش ہوتی ہے کہ چھوٹا سا آرام دہ مکان ہو جس میں ایک خوبصورت باغچہ ہو اور بچوں کا ایک غول اس کے اندر کھیل رہا ہو۔ بلزاک کے کرداروں میں یہ چھوٹا سا مکان ایک قصر بن جاتا ہے، شرافت و افراز کے لئے ایک اعلےٰ سرکاری خطاب اور لاکھوں کروروں روپیہ کی طلب آجاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کے مقابلے میں دوستو یافسکی کے کسی کردار کو ان چیزوں میں سے کسی کی بھی آرزو نہیں ہوتی، کسی کو عیش و راحت یا دولت و اعزاز کی ضرورت نہیں ہے ـــــ یہاں تک کہ کسی کو شخصی مسرت کی بھی تلاش نہیں ہے، سب کے سب اس دُھن میں نظر آتے ہیں کہ آگے بڑھتے جائیں۔ قدرت نے ان سب کو ایک شریف دل دیا ہے ـــــ ایسا شریف دل جو اندیشوں اور فکروں میں بتلا رہتا ہے!"

اس اقتباس کے اندر زواگ نے دوستو یافسکی کے کرداروں کے باب میں جو کچھ لکھا ہے بڑی حد تک وہ سب باتیں رُوسی کلاسکی اُدب کے بارے میں صحیح اترتی ہیں، مرتبہ و دولت سے بے پرواہی، زندگی کے بنیادی مسئلوں سے دلچسپی، اپنے وجود کو جائز قرار دینے کی کوشش، انسانوں سے متعلق اپنے فرائض کا شدید احساس، یہ وہ خاص خصوصیتیں ہیں جو

راڈیشیف سے لیکر گورکی تک کے تمام رُوسی اُدب میں موجود ہیں۔

اب چونکہ رُوسی اُدب میں سرمایہ داری استحصال یا لوٹ کھسوٹ اور جبر و زیادتی کی اخلاقی مذمت کی گئی ہے، غیر رُوسی نقادوں نے رُوسی اُدب کی سب سے بڑی تعریف یہ قرار دی کہ اس میں واقعیت نگاری اور انسانیت پرستی باقی دُنیا کے اُدب سے بہت زیادہ ہے۔ ان نقادوں نے رُوسی اُدب کے اس جوہر کو رُوسیوں کی مذہب پرستی کا نتیجہ قرار دیا جو یقیناً غلط تھا۔ اور اس کی صراحت رُوسیوں کی مخصوص قومی فطرت اور تاریخی سماجی حالات سے ہو جاتی ہے۔

جس نظام زندگی کی بنیاد استحصال یا لوٹ کھسوٹ پر ہوتی ہے اس نظام کے اندر مخالفت و تضاد کا ہونا لازمی ہے ایسے مخالفت و تضاد سے بحث کرتے ہوئے اسٹالین ایک جگہ کہتا ہے کہ:۔

"رُوس میں یہ مخالفت اس وجہ سے جلد سامنے آگئے کہ وہ خصوصیت کے ساتھ گھناونی صورت اختیار کر چکے تھے۔"

اسٹالین کا یہ بیان رُوسی سامراج ہی کے متعلق نہیں بلکہ پوری اُنیسویں صدی کے رُوس کے بارے میں صحیح ہے۔

یورپی اہل قلم کے مقابلے میں رُوسی اہل قلم کے لئے ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ اور بنیادی ناانصافیوں کا سمجھ لینا اور اس ظلم کا یقین آجانا اس لئے آسان تھا کہ وہ زرعی غلامی کی کروہ حقیقت سے دو چار تھے۔ "سرفیت" کی شدید مخالفت نے جو بالآخر ہر قسم کے جبر و تشدد کی مذمت میں بدل گئی، رُوسی مصنفوں کو وہاں پہنچا دیا جہاں پہنچ کر وہ ملکیتی سماج کے رشتوں کا تجزیہ نہایت سنجیدہ واقعیت نگاری میں کر سکتے تھے۔ اور پھر یہی چیز ایک نامیاتی جمہوریت پرستی بن گئی جو اب تمام اعلیٰ رُوسی اُدب کی سرشت معلوم ہوتی ہے۔

بورژوا سماج کا دو فرقوں میں بٹ جانا لازمی ہے۔ ایک چھوٹا فرقہ جو استحصال کرتا ہے اور دوسرا بڑا فرقہ جس کی لوٹ کھسوٹ ہوتی ہے۔ یورپی اہل قلم کے سامنے یہ حقیقت ۱۸۴۸ء سے پہلے نہ آسکی۔ ڈکنس کا ناول S: HARD ··iM اس خیال کا ثبوت ہے۔ لیکن رُوس کے اندر جب سماج کی یہ تقسیم شروع ہوئی، اسی وقت RADISEHEV اور VOUVIZIV نے محسوس کر لیا تھا کہ ایک کی دو قومیں بنی جا رہی ہیں۔

یہ تسلیم کیا جائے گا کہ ایسا اَدبی کردار جس کی لوٹ کھسوٹ کی گئی ہو مغربی یورپ کے اَدب میں پہلے نمودار ہوا اور رُوسی اَدب کے اندر بعد میں۔ لیکن اس وجہ سے کہ ان کے اردگرد کی زندگی مختلف یا مخصوص نوعیت کی تھی، رُوسی اَدیبوں نے اس موضوع کو کثرت اور تیزی کے ساتھ استعمال کیا۔ چنانچہ ترجنیف کی تصنیف A SPORTSMANS SKETCH کو اس کے یورپی ہم عصر کے افسانے سے مقابلہ کیا جائے تو نظر آجاتا ہے کہ ترجنیف کے دیہاتی کردار اتنے اونچے نہیں جتنے جارج سینڈ کے دیہاتی کردار اونچے ہیں۔ لیکن اسی بنا پر ترجنیف کے دیہاتی کردار زندگی کے سچے نمونے بنجاتے اور قابل قبول ہو جاتے ہیں۔ KALINIK BEZHIN MEDOW اور LUKARYA لڑکوں کے وہ کردار ہیں جن پر "سرفیت" کی مُہر لگی ہوئی ہے، جس نے ان کو بے عذر، جاہل، اور ضعیف الاعتقاد بنا دیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کے اندر بعض خصوصیتیں بھی ہیں۔ ان میں عالی اخلاق کی پاکیزگی ہے، تحمل اور برداشت ہے اور انصاف پسندی کی جبلت ہے۔ بلزاک کو یہ خوبیاں فرانس کے دیہاتیوں میں نہیں ملیں۔ کیونکہ ان کو نجی ملکیت کی دیمک چاٹ گئی تھی۔ ترجنیف نے رُوسی کاشتکاروں کے گوشت پوست کے اندر روحانی حُسن کو دیکھا جس نے اسے ایسی تصانیف کا اہل بنا دیا جن کے اندر داخلی شعریت ہے۔ غیر رُوسی پڑھنے والا آج بھی ان کتابوں میں رُوسی سماجی نظام پر خروشس اور پُر عظمت تنقید پڑھ کر حیرت میں پڑ جاتا ہے۔

رُوس کی قومی آزادی کی تحریک نے وہاں کے مزدوروں کو اندرونی یا داخلی آزادی کا ذائقہ دیدیا جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہا۔ ان مزدوروں کو اپنے اندر سوئی ہوئی طاقت کا جزوی احساس تھا۔ چنانچہ ایسے مزدوروں کی تصویریں رُوسی اَدب کے اندر بے گنتی کرداروں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر دوستویفسکی کی مزیک (دیہاتی) میری کی پرپا KEKRASOV اور گورکی کے کرداروں میں یہ مرقعے سامنے آجاتے ہیں۔

گورکی نے جب انقلابی پرولتاریا کو اَدب میں داخل کیا تو یہ ایک حیرت انگیز جدت یا بدعت تھی۔ رُوس میں ایک مخصوص طرح کی صف بندی ہو چکی تھی اور یہ صف بندی رُوسی اَدب کے اندر وہاں کے ادنے طبقوں کے حالات پیش کرنے کے لئے مناسب صورتِ حال ثابت ہوئی۔ اس لئے

رُوسی اَدب کا ارتقا جس کے اندر جمہوریت پرستی کی روایات بن چکی تھیں، گورکی کی اس جدت یا بدعت کو قبول کرنے کے لئے بالکل طیار تھا۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ رُوسی ادب میں واقعیت نگاری اور اس کے منا ماد خصوصیات پر یورپ کے نقادوں کی رائے کیا ہے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ رُوسی اَدب کی عظمت کا راز اس کے سماجی تاریخی اصول میں موجود تھا مگر یورپی نقاد اس نکتے تک نہ پہنچ سکے بعض تقابلی تبصروں اور فیصلہ کُن بیانات کی تہہ میں یہ کھُلا اعتراف موجود ہے کہ رُوسی اہلِ قلم اپنے عوام سے قریب رہتے تھے اس لئے ان میں تخلیقی قوت پیدا ہو گئی تھی، اور جو ان نقادوں کے ہم وطنوں میں پیدا نہ ہو سکی۔

انگریز نقاد ایڈورڈ گارنیٹ نے چیخوف اور موپساں کی عدم مماثلت پر بحث کی ہے۔ گارنیٹ مانتا ہے کہ ان دونوں مختلف الخیال واقعیت نگاروں کے اَدب میں شدید قسم کی تلاش حقیقت اور حُسن کا شاعرانہ احساس موجود ہے۔

موپساں جس ماحول کی پیداوار ہے اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کسی وقت بے مہر اور تُرش و درشت ہو جانا ممکن ہے۔ اس کے برخلاف چیخوف کا پس منظر ملائم لچیلا اور گرمجوش بھی ہے اس فرق کو پہچان کر گارنیٹ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس بحث میں سوال دو خلاق شخصیتوں کے اختلاف کا نہیں بلکہ واقعیت نگاری کے دو قومی نمونوں کے اختلاف کا ہے۔ چنانچہ نارمنڈی اور رُوس میں پیدا ہونے والے دو انسانوں کے مزاجی اختلاف کی وجہ قومی روایات اور ذہنی ارتقا کا اختلاف ہے جو ان دونوں کے قومی تمدن میں مرکوز ہے۔ اس لیے چیخوف کا مطالعہ روسی کلچر کی نظر ہی سے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ تمام رُوسی اُدب کی خصوصیت گرم جوشی اور روحانی احساس ہے، اور چیخوف کے ذی وقعت پیشروؤں کے یہاں گرم جوشی اور روحانی احساس کی روایات ان کے ذہنی خلوص کی روایات کے ہم پلہ ہیں۔

اس بحث میں گارنیٹ نے کچھ ذہنی دلیلیں پیش کر کے بتایا ہے کہ رُوسیوں کی یہ خصوصیت خطرے میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اپنے پیشروؤں کی طرح چیخوف کی صناعت کی اہم خصوصیت یہ حقیقت ہے کہ پڑھنے والے کو انسانیت کا اور خاص طور پر لاکھوں کروڑوں دیہاتیوں کا احساس ہونے لگتا ہے، اور یہی چیز تمام رُوسی اہلِ قلم کی ادبیت کا پس منظر ہے جو چیخوف کے اَدب میں چھپی ہوئی

گہرائیوں کا احساس و شعور ان تصانیف کو یورپ کی محدود سماجی سطح سے بہت بلند کر دیتا ہے اور لامحدود رمزناک پہنائی کا یہ پس منظر ہی وہ اصل شے ہے جس نے رُوسی اَدیبوں کو خیال و نظر کی وسعت بخشی اور ان کے تصورین جذبات کے مدارج قائم کئے۔ اس کمال و قابلیت نے ہی رُوسی اَدیبوں کو نئی اخلاقی قدریں قائم کرنے کے قابل بنایا، اگرچہ یہ اخلاقی قدریں یورپی معیار سے نہایت مختلف قدریں ہیں۔

موپساں اور چیخوف کا مقابلہ کرتے، ظاہر ہے کہ گارنیٹ نے موپساں کی اہمیت اور مرتبہ کو کم نہیں کرنا چاہا ہے بلکہ صناعی مسلک کے فرق کا اندازہ کیا ہے، اس مختلف حیثیت کا امتیاز دیکھنا چاہا ہے جو ان دو ادیبوں کو زندگی میں حاصل تھی۔ لیکن گارنیٹ نے ان دونوں میں جو فرق دکھایا ہے وہ دراصل ایک استثنا ہے جو کلیے کو ثابت کرتا ہے۔ اس لئے کہ جدید رُوسی اور یورپی اَدب کے راستے جدا کر دینے والی چیز سماجی حالات کی عدم مماثلت تھی۔

۱۸۴۸ء کے بعد سے سرمایہ دار سماج کے تضاد جب بیش از بیش ناقابل حل ہوتے گئے تو یورپ کے اہلِ قلم کو اپنی سماجی بے کسی کا احساس شروع ہوا، اور بالآخر ان کے اندر ہزیمت، مراجی حالت اور مردُم بیزاری کا رجحان بڑھا، حتےٰ کہ ترک علائق اور تیاگ کی ذہنیت تک پہنچ گئے۔ ان کیفیات کی جھلک بڑے بڑے اہلِ قلم جیسے فلابیر اور موپساں وغیرہ کی بعض تصانیف میں بھی نظر آجاتی ہے۔ دوسرے درجے کے اہل قلم تو سرے سے ان حالات کا شکار ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں فرانسوی اَدب کے اندر اخلاقی اور ذہنی قدریں پست ہونے لگیں، اور اُس زمانے میں فرانسوی اُدب ہی یورپ کا ممتاز ادب تھا۔ جرمن اور انگریزی اَدب اس زمانے میں لبرل رجحانات اور اور ایک حساس قسم کی پند آمیزی پر مشتمل تھا جو زندگی کے گوناگوں استدلال سے بلند ہونے کی کوشش سے زیادہ معنی نہ رکھتا تھا۔ اس ذیل میں جارج برانڈیز (GEORGE BRANDES) کا قول بڑی اہمیت رکھتا ہے:-

''ترجنیف کے زرخیز تجربات زندگی نے اس کو نہ تو فرانسوی اہلِ قلم کی طرح بمک چڑھا اور دُنیا بیزار بنایا، اور نہ اکثر انگریز ادیبوں کی طرح اخلاقی معلم اور واعظ''

چنانچہ اصل حقیقت یہی ہے کہ رُوسی اَدب صرف اس سبب سے ایک بہت بڑی اخلاقی قوت

بن سکا کہ اس کے اندر جمہوریت کے لئے رُوسی عوام کی جد وجہد نمایاں تھی، اور اسی بنا پر رُوسی ادیب عالم بیزاری کی ذہنیت سے محفوظ رہے۔ اور اس لئے کہ رُوسی ادیبوں کو تضادِ زندگی کی صحیح فہم اور سچی سمجھ آگئی تھی، وہ مصنوعی ناصح بنجانے سے بھی بچے رہے۔

اُنیسویں صدی میں جمہوریت اور انسانیت پرستی کے رجحانات نے جو سب سے بلند پایہ تصنیف پیدا کی وہ وکٹر ہوگو کی LES MISERABLE ہے۔ متعدد نقادوں نے اس ناول سے کئی رُوسی ناولوں کا تقابل کیا ہے۔ ان میں ایک فرانسوی نقاد ANDRELE BRETON ہے۔ برتیوں نے ہوگو اور ٹالسٹائی کا مقابلہ کیا ہے۔ لیکن جہاں اس نے "لے میزرے رابل" اور "ریزرکیشن" کی مماثل نمایتیں اُجاگر کی ہیں وہاں ان کے مابین اہم فرق و اختلاف کو بھی ظاہر کیا ہے۔

ٹالسٹائی کی کتاب واقعی زندگی کو انتہائی سادگی اور راست بیانی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس کے برعکس ہوگو کی تصنیف قصے کہانیوں کے ناممکنات سے بھری پڑی ہے۔ پھر ان دو ادیبوں کے درمیان صرف صناعت کے طریقوں کا ہی نہیں بلکہ اصل و جوہر کا فرق و اختلاف بھی ہے۔

ہوگو کی کوشش یا آرزو تھی کہ وہ غریب کو دولت مند اور تعلیم یافتہ کے برابر بٹھا دے یعنی پرولتاریا کو ایک بورژوا اور سٹیزن بنا سکے۔ اس کے برعکس ٹالسٹائی دولت مندوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنی ملکیت کو تج دیں اور تعلیم یافتہ سے کہتا ہے کہ وہ اپنی کتابیں بند کر کے غریب دہقانی ہو جائے اور وہی زندگی گزارنے لگے۔

برتیوں لکھتا ہے کہ ہوگو اور ٹالسٹائی، دونوں کے مطمح نظر مساوی طور پر یوٹوپیائی یعنی ناقابلِ حصول ہیں۔ ہوگو نے جو نصب العین پیش کیا ہے وہ اس سماجی رشتے سے آگے نہیں جاتا جو خود ہوگو کا مسلک ہے۔ چنانچہ ہوگو قدرتی طور پر ٹالسٹائی کی یوٹوپیا کے خلاف ہے۔ ہوگو پیرس کے BARICADE کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ ایک مقدس چیز بنجاتا ہے، لیکن اس نے جو اخلاقی نظریہ پیش کیا ہے وہ بس سمجھوتے کی ایک اپیل معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل ٹالسٹائی تشدد کو مسترد کر دیتا ہے، لیکن اس کا اخلاقی نظریہ ملکیت کی اغوا کو بنیادوں سمیت ڈھا دینا چاہتا ہے۔

یہ تقابل رُوسی ناولوں کی اُنیسویں صدی کی بڑھی ہوئی مقبولیت کو قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔
اصلاحات جاری ہونے کے بعد رُوس میں سرمایہ داری کی تیز ترقی نے رُوسی اُدب کے موضوعی بروز کی بڑی مدد کی اور اس اعتبار سے مالامال کردیا۔ یورپ کے نقادوں نے مانا ہے کہ رُوسی اُدب کے موضوع اور جن مسئلوں سے اس نے بحث کی ہے، اس نے رُوسی اُدب کو بالکل مطابقِ حال یعنے UPTODATE بنا دیا۔ رُوسی ناولوں کا پڑھنے والا زندگی کے ایسے مظاہر (PHENOMENEA) سے دوچار ہوا جن سے خود واسطہ پڑ رہا تھا، اور ان کے اندر جو چیز اسے سب سے زیادہ بھائی وہ یہ حقیقت تھی کہ رُوسی ناولوں میں دنیا بیزاری اور لبرل ریاکاری، ان دونوں باتوں کا شائبہ تک نہ تھا۔ رُوسی ناول نویس سماجی اور اخلاقی مسائل پیش کرتے ہوئے مطلق نہ ہچکچاتے تھے اور ان مسئلوں کے جو حل وہ پیش کرتے تھے انھیں سے سرمایہ دار سماج کے تضاد رفع ہو سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید رُوسی اُدب یورپی ضاعت کے زوال پزیر رجحانات کا سخت مخالف تھا۔

چنانچہ یورپی نقادوں نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ رُوسی اُدب اپنی نوعیت یا خلقت کے اعتبار سے جمالیاتی تقلید پرستوں (FORMALISTS) کے رجحانات کا مخالف ہے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ کئی نسلوں تک رُوسی اہلِ قلم اس عقیدے کے مدعی تھے کہ جمالیات اور اخلاقیات کا رشتہ اٹوٹ ہے اور اُدب کا درس آمیز پہلو اہم مسئلہ ہے۔ رُوسی ادب کا یہ انداز اس بات کی ضمانت بن گیا کہ اس کے اندر یورپی اُدب کے بُرے اثرات یعنی عالم بیزاری کی ذہنیت نہ آسکی جو ضاعت کے اندر خواص و اشراف کی خود پسندی اور علیحدگی کی تحریک کی بنیاد تھی۔
فرانسوی نقاد EMMILE HENNGUIN ٹالسٹائی اور دوستویفسکی کے ذکر میں لکھتا ہے کہ:۔

"زندگی کی بصیرت میں رُوسی اہلِ قلم جس گہرائی تک جا پہنچے، اگر اس گہرائی کا اندازہ کر لیا جائے، اگر اس نئے طریقے کو ذہن نشیں کیا جا سکے جس طریقے سے رُوسی اُدیب انسان اور ان کے متعلقات پر بات کرتے ہیں، اگر رُوسی مصنفین کے جوہرِ قابل اور ان کے خلوصِ مقصد کو سمجھا جا سکے اور ان کے مسلک کی گرمجوشی رحمدلی کا احساس ہو جائے۔ تو ضاعت برائے ضاعت کے مدعی اپنے عقیدے پر کرر غور کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔"

فصاحت میں فطرت پرستی (NATURALISM) کی تحریک یورپ سے نکلی اور اس کے بعض مدعیوں نے ترجنیف، ٹالسٹائی اور دوستویفسکی کو بھی فطرت پرست باور کرلیا۔ یہ نہایت غلط تفہیم یا فیصلہ تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی نقاد آنکھیں بند کرکے ہر اس ضاع وادیب کو فطرت پرست ماننے لگے جو آورد و تصنع کا مخالف ہو یا روزمرہ کی زندگی سے قریب رہنا چاہتا ہو۔

رُوسی اُدیبوں کو اس بات کا یقین تھا کہ واقعیت نگاری کا مسلک یورپ کے اندر بھی مقبول ہوگا۔ چنانچہ A COMMON STORY کی GONCHAROY نے اور ترجنیف کی A SPORTSMANS SKETCH کے بعض مقامات سے یورپ گئے فطرت پرستوں کو بہت ہدایت ملی (آخر الذکر تصنیف فلابیر کی "مدام بوورری" سے دس سال پہلے لکھی گئی تھی)۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ ہر دَور میں یورپ کے نقادوں نے رُوسی اہل قلم کی پوری پوری تحسین کی ہے اور یہ مانا ہے کہ رُوسی اہل قلم جمالیاتی نظریوں کو پیش کرنے میں بھی واقعیت نگاری کے مسلک پر قائم رہے۔ چنانچہ ترجنیف پر گفتگو کرتے ہوئے موپاساں لکھتا ہے کہ :-

> "اس کے ادبی نظریات نہایت ترقی پسندانہ تھے اور ناول کے از کار رفتہ پیکر و انداز کو جس کے اندر ڈراما اور علیت کو آمیز کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، مسترد ٹھیراتے تھے، اور مطالبہ کرتے تھے کہ ناول میں زندگی اور صرف زندگی پیش ہونا چاہئے۔ اس کے اندر پیچیدگی، آدیزش اور تلاش واردات مطلق نہ ہو۔"

اس ضمن میں اس کشاکش کو یاد رکھنا ضروری ہے جو اُنیسویں صدی کے فرانسیسی اُدب میں مختلف رجحانات کے درمیان کئی نسلوں تک جاری رہی۔ فلابیر اسکول کے اہلِ قلم کی طرح موپاساں نے ایسے اُدب کی مخالفت کی ہے جس میں ڈرامائی انداز کے ساتھ علیت کو سمویا جا رہا تھا۔ موپاساں تمام جھوٹے سوز و گداز اور روماں پرستی کے بچھے کھچے رجحان کا بھی دشمن تھا۔ موپاساں کے اس انداز کو جان لینے کے بعد اس نے ترجنیف کی جو داد دی ہے، آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بات بھی فراموش نہ ہونا چاہئے کہ ترجنیف، موپاساں کا بزرگ ہم عصر تھا اور موپاں پرانے ڈھرّوں کے خلاف جنگ کرنے میں اس کو اپنا فوجی ساتھی مانتا تھا۔

بلزاک کے بعد ہر وہ بات جو یورپی اُدبی ترقی پر واقعی اثر ڈال سکتی تھی یعنی اُدبی خصوصیات

کی بہتات، جمہوریت کی تحریک، زندگی کے منافی پہلوؤں کے بیان میں صاف گوئی، زندگی کی نقاشی کے نئے وسائل کی کثرت، سامنے کی زندگی کا بیان، جمالیاتی انداز میں لوچ کا ہونا، بول چال کی زبان کو ادبی بیان میں روا رکھنا، یہ تمام باتیں روسی واقعیت نگاری کی نوعیت سے ہم نوا تھیں اور روسی ادب میں بلا تکلف جگہ پا رہی تھیں۔ یہ باتیں روسی ادب کے اندر پہلے رونما ہوئیں اور یورپی ادب نے بعد میں اختیار کیں، لیکن اختلاف یہ رہا کہ جو باتیں روسی ادب کی واقعیت نگاری کو ترقی دینے کا ذریعہ بنیں اور خود بھی اسی کے اندر سے پیدا ہوتی گئیں، یورپی ادب کے اندر وہی باتیں جب داخل ہوئیں تو بعض ایسے رجحان پیدا ہو گئے جو ذہنی جوہر کو ماند کرنے والے تھے اور جو زندگی کی سست نقالی کا سبب بن گئے۔

یورپ کے عظیم الشان دار الحکومت اپنی کثیر آبادیوں میں بہت سا انسانی کوڑا کرکٹ بھی رکھتے ہیں۔ اس انسانی گروہ پر ادب نے پہلی بار نظر ڈالی اور بورژوا زندگی کے گھناؤنے زخم کے احساس کو پہلی بار بیان کیا۔ اور بلاشک یہ اظہار احساس زندگی کی موجودہ حالت پر ایک فردِ جرم کا درجہ رکھتا تھا۔ لیکن زولا اور اس کے متبعین کے ادب میں زندگی کے ان مکروہ حالات و موضوعات کے بیان نے ان کی ادبیت کو کھردرا اور اوکھڑ بنا دیا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ یورپی ضاعت اس جمالی حقیقت کو خلوص کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ان موضوعات کے ساتھ ان ادیبوں کے احساس میں سچائی اور گہرائی نہ تھی۔ اس کے برخلاف روسی ادب نے زندگی کے ان المناک پہلوؤں کو ضاعتی احساس کے ساتھ اختیار کیا۔ OPENSKY کی "MORALS OF RASTERYAEVA UTILSA"، OSTROPSKY کی "THE STORM"، ٹالسٹائی کی "ریزریکشن" اور گورکی کی "LOWER DEPTHS" اس کی روشن مثالیں ہیں۔

زارشاہی روس میں جبر و تشدد، دارو رسن، درندگی و حیوانیت کے منظر ایک عام بات تھی، اور اس کے خلاف قومی جدوجہد بھی برابر زور پکڑتی رہی، اور روسی ادب چونکہ زندگی سے کبھی الگ نہیں چلا اس لئے روسی ادیب کو ان حالات کا شدید احساس ہوا اور وہ ضاعانہ خلوص کے ساتھ اسے بیان کر سکا۔ ان کے یہ بیان ظاہر ہے کہ عوام کے نقطۂ نظر سے تھے اور عوام کی حمایت میں تھے۔

اس لئے یورپی فطرت پرستوں کی واقعیت نگاری اور روسی ادیبوں کی واقعیت نگاری سے

اصولاً مختلف نوعیت کی تھی۔ رُوسی ادیب جب سماجی خرابیوں پر سے پردہ اُٹھاتا اور احتجاج کرتا تھا تو اُسے عوام کی حمایت پر کامل یقین ہوتا تھا۔ لیکن مغربی یورپ میں ذرا سا جمہوریت پرست ان رشتوں پر جو اسے اپنے عوام سے وابستہ کرتے تھے، اُسی طرح بھروسا نہ کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں یہ ایک قدرتی سی بات تھی کہ روسی اہلِ قلم صناعت اُدب اور سماج کی مکروہ واقعیتوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کر سکے۔ غیر شاعرانہ اور زندگی کے تلخ حقائق کو موضوع ادب بنانے میں رُوسی ادیبوں کو جس طرح کبھی تذبذب نہیں ہوا، اُسی طرح ان کو صناعتی بلندی سے موضوع کی پستی تک اُتر آنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ اور رُوسی صناعت اُدب کا یہ روشن پہلو یورپی نقادوں کا مستقل نقطۂ بحث رہا ہے۔ پال بورژے، فرانسوی نقاد ترجنیف کی آدمی مخلوق کی بحث میں لکھتا ہے :-

> "بلاشبہ جس ناول کی بنیاد گہرے مشاہدے پر ہو وہ اسی قسم کے کرداروں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایسے کردار جن کے اندر کوئی نمایاں خصوصیت نہیں اور جو معمولی انسان ہیں۔ نہایت عجیب بات یہ ہے کہ ترجنیف کے یہ عومی انسان پڑھنے والے کے دماغ یا خیال پر کوئی ایسا اثر نہیں چھوڑتے کہ ان کی زندگیاں بالکل ہی ناکام رہی ہیں، جس طرح فلابیر کی 'سینٹی منٹل ایجوکیشن' پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔ ترجنیف کے کرداروں میں ارادوں کے ناکام رہنے کے بعد بھی ایک داخلی قوت موجود رہتی ہے اور وہ اپنے اندر کی شعریت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ آخر میں ہم اسی نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ ترجنیف کے کردار اپنی زندگی جیتے تھے —— ان کو کسی سے جینے کا نسخہ دیا نہ جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے وہ فلابیر کے کردار فریڈرک مورا اور ولاریٹیر کی طرح مایوسی کے سمندر میں ڈوب نہیں گئے۔"

اسی ذکر میں پال بورژے نے یہ بھی کہا ہے کہ ترجنیف نے صناعت محض (PUREART) کے نظریے کو ایک لمحے کے لئے تسلیم نہیں کیا اور نہ اسے کبھی زندگی کی حقیقتوں کو دیکھ کر ہیبت ہوئی۔

رُوسی ادیب اور رُوس کے قومی جدوجہد کرنے والے عوام کا قریبی رشتہ یورپ والوں کے لئے ہمیشہ ایک انوکھی بات بنا رہا ہے۔ اور فی الواقعہ اسی مطالعے کے طفیل یورپی اُدیب اس قابل بھی بن سکے کہ حدِ نظر سے آگے یعنی حقیقت کو دیکھ سکیں۔

رُوس کے بے رحم آقاؤں کے خلاف عوام کی طاقت کا وجود اور اس طاقت سے رُوسی ضاعت کا نزدیکی رشتہ، وہ الہام تھا جس نے ظلمات کے عالم میں رُوسی اَدیب کو روشنی کی کرن دکھائی اور اس کے ضاعانہ اظہار پر قادر کر دیا۔ یعنے رُوسی اَدیب حال کے اندر مستقبل کی نشانیاں دیکھ سکتا تھا۔ رُوسی افسانے کا ہیرو اگر موجودہ نظام کے جبر اور حیوانیت کی مخالفت اپنے عمل سے نہیں کر سکتا تب بھی خیال و احساس میں اس کا مخالف ضرور ہے۔ اس کا یہ احساس مبہم ہے، نامکمل ہے، غیر شعوری ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا یہ احساس اَدب کے اندر مخصوص قوائے شعری کو جگا دیتا ہے۔ داخلی حُسن و شعریت کے ایسے نمونے "ٹیا نا"، "لفر ٹیسکی"، اور "اینا کرینناہیں" بکراسوں کے مزیکوں اور چیخوف کے فنکزوف میں بھی نظر آسکتے ہیں۔

فلابیر اور اس کے بعد کے تمام فطرت پرست یورپی اہل قلم غیر جانبداری کے ساتھ روزمرہ کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مایوس نتیجوں تک جا پہنچتے ہیں، اور اپنے پڑھنے والے کو بھی مایوسی و شکست کا احساس کرا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس رُوسی ادیب اپنے سامنے مستقبل کے امکانات بکھرے دیتا ہے، اور مستقبل پر اس کا یہ عقیدہ ہیرو کی ذات میں جسم اختیار کر لیتا ہے۔ رجائیت کی یہ خصوصیت رُوس کے طنزیہ اَدب میں بھی اسی قوت و جمال کے ساتھ نظر آتی ہے۔ جرمن اَدیب ٹامس مان، گوگول سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

> "DEAD SOUL" کے اندر جو طنز و مزاح نظر آتا ہے، وہ درد اور تلخی کی گہرائیوں سے نکلتا ہے اور وہ گہرائیاں اتھاہ ہیں۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ گوگول کے پاس آزیں مزاح اور شکست خوردہ طنز کے اندر اس کی قوم پرستی کا عقیدہ بھی اسی درجے پر نمایاں ہے۔ اس کی وطنیت جس قطعی انداز میں سامنے آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گوگول کی روح کے اندر سموئی ہوئی تھی۔ گوگول کی انشا کے اندر مادرِ رُوس کی محبت ہمارے کانوں میں اس طرح پہنچتی ہے جیسے نغمۂ عبودیت سنائی دے رہا ہو! اس کی حُبّ قومی تلخیٔ احساس کی تہوں میں چھپی رہتی ہے۔"

ٹامس مان اس حقیقت سے آشنا ہے کہ رُوس کے طنزی اَدب میں ایک قطعی اور اثباتی عنصر کی موجودگی کی بنا، گہری اور مقصودی ہے۔ چنانچہ آگے لکھتا ہے کہ:۔

> "روس اور بدنصیب! غلط ہے! روس نہایت خوش قسمت حصۂ زمین ہے۔ روس کو

احساس ہے کہ وہ شدید افلاس اور تمام مایوسیوں کے باوجود حسین ہے —— محبت کئے جانے کے قابل ہے!"

گوگول کے باب میں انگریز نقاد چارلس ٹرنر کہتا ہے کہ :۔

"وہ بدی یا شر کی نقاشی جس تکمیل کے ساتھ کرتا ہے اسی تکمیل کے ساتھ وہ ہمیں اپنے مطمحِ نظر کا احساس بھی کرا دیتا ہے۔ اور ہمیں چاہئے کہ ہم گوگول کے نصب العین کے لئے جہد وسعی کریں۔"

سوئس نقاد میتھو روسی کلاسکی ادب سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

"روسی واقعیت نگاری جس کے سامنے یورپ کی واقعیت نگاری ہیچ ہے، بلند ترین نصب العین پیش کرتی ہے۔ دُنیا کے کسی ادب نے باطن حیات کو اس بیدردی سے الٹ کر نہیں دکھایا جس طرح رُوسی ادب نے دکھایا۔ زندگی کو کثافتوں اور گندگیوں سے پاک کرنے کے لئے ایسے قوی عزم کا اظہار کسی ادب نے نہیں کیا جو رُوسی ادب میں نظر آتا ہے۔"

الحاصل، مختلف ملکوں کے ادبی نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ رُوسی واقعیت نگاری سخت "فردِ جرم" ہونے کے باوجود محض تنقیدی واقعیت نگاری نہیں بلکہ اپنے ضمنی مقصود ومفہوم کے اعتبار سے ایک اثباتی حقیقت ہے۔ اور اسی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ رُوسی کلاسکی واقعیت نگاری اور گورکی کی اشتراکی واقعیت نگاری ہم رشتہ ہیں۔ ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ رُوسی کلاسکی ادب کے اندر سماجی تضاد کا پردہ فاش کرنے میں گورکی کی سی بے رحم صداقت بھی موجود ہے اور انجام کار فتح مند انسان کی "پُرمسرت زندگی" کا الہامی تصور بھی۔ البتہ یہ مانا جائے گا کہ رُوسی کلاسکی ادب میں یہ حقیقتیں بکھری ہوئی ہیں اور گورکی کے ادب میں مربوط اور مجتمع ہو گئی ہیں۔ وہ تمام کلاسکی کردار ادب جو یورپی ادب کے پڑھنے والوں کو متاثر کر چکے اور عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں، گورکی کی اشتراکی واقعیت کے اندر زیادہ مکمل صورت میں سامنے آتے ہیں۔

رُوسی ادب کی عالمگیر اہمیت کے ذیل میں اس عام تبصرے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض خاص مثالیں بھی پیش کی جائیں جن سے معلوم ہو سکے کہ بلاواسطہ طور پر رُوسی ادب نے یورپی ادب کو کس حد تک متاثر کیا۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء تک یورپ میں رُوسی ادب کا پڑھنے والا

رُوسی اَدب کے تاریخی مقصد اور سماجی منشاء کی صحیح تفسیر کرنے کے تو قابل نہ تھا، لیکن ادبی کردار کی تصویروں کی اس نمائش سے متاثر بہت تھا۔ اور اس مطالعے کے نتیجے میں اس کی تنقید نظر قوی ہو گئی، اہم اور بنیادی مسئلے سامنے آنے لگے اور اخلاق کے مسلّم ضابطے پر شک کرنے لگا۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رُوسی اَدب نے یورپ کے اندر ایک مقصودی ترقی پسندی کا بیج ڈال دیا۔

یورپی اَدب پڑھنے والے کے اندر رُوسی اَدب کے مطالعے نے غیر شعوری طور پر یہ آرزو پیدا کر دی کہ موجودہ نظامِ زندگی کو بدل جانا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اس کے اندر احتجاج کی حِس قوی ہو گئی۔ اور رُوسی ادب کی یہ حِس احتجاج یورپی اَدب کو تقویت پہنچ جانے کا سبب بن گئی جس کے اندر تعمیری احساس بڑھ رہا تھا۔ یعنی یورپی اَدیبوں کو انسانیت پرستی کا سوز و گداز اور اس سوز و گداز کے لئے فضا عانہ وسیلۂ اظہار مل گیا۔

اِس زمانے کے یورپی اہلِ قلم میں ایسے بہت کم ہوں گے جنھوں نے سماجی موضوعات کو اپنا موضوعِ قلم نہ بنایا ہو یا اپنے کرداروں کی داخلی دنیا میں داخل ہونے کی کوشش نہ کی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ رُوسی اَدب سے الہام یعنی ہدایت حاصل نہ کی ہو۔ یہ الہام یا ہدایت ان مصنفوں کے باب میں زیادہ صحیح ہے جنھوں نے ایک ہی وقت میں دونوں باتوں پر عمل کرنا چاہا۔ اس لئے کہ فرد اور سماج کے رشتۂ و تعلق کے پسِ منظر پر انسانوں کی تصویر کشی میں رُوسی اَدب نے نئے طریقے سکھا کر عالمگیر اَدب کے لئے امکانات کا ایک خزانہ بہم کر دیا تھا۔

سب سے پہلے جس رُوسی اَدیب کو یورپ میں شہرت حاصل ہوئی اور جس نے یورپی اہلِ قلم کی فضا عانہ بروز کو متاثر کیا وہ ترجنیف تھا۔ HAUMANT اپنی تصنیف " ایفاں ترجنیف " میں لکھتا ہے کہ جارج سینڈ نے سب سے پہلے ترجنیف سے ربط پیدا کیا اور اسے یہ لکھ کر کہ " مرشد! ہم سب کو آپ کے اسکول میں سبق لینا چاہیے۔" درحقیقت سارے یورپ کی طرف سے ترجنیف کے اَدب کی عالمگیر اہمیت کا اعتراف کیا۔

فرانسوی اہلِ قلم کی جماعت نے جس کا سرخیل میریمے تھا اور جس میں فلابیر، گون کور، دودے اور زولا شامل تھے۔ ترجنیف کی استادی کو مانا ہے۔ یہ لوگ ترجنیف کو اپنے مسودّے سُنایا کرتے تھے، اس سے مشورہ لیتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ موپساں کے بروز میں جو اس وقت نو عمر تھا، ترجنیف کی

اثر کو بڑا دخل ہے۔ سماج کے ادنےٰ طبقے سے موپساں کی ہمدردی اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ اور فرانس کے تمام نقاد اس پر متفق ہیں کہ صناعت محض PURE ART سے موپساں کو ہٹانیوالا ترجنیف تھا DUMESNIL نے موپساں پر اپنی تصنیف میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

اسی طرح ترجنیف کے جرمن ہم عصر اس سے متاثر ہوئے۔ مثال کے لئے AUERBACH کا نام کافی ہوگا۔ مگر انیسویں صدی کے نصف آخر میں جرمن ادب پر ایک جمود طاری تھا اس لئے ترجنیف کا یہ اثر محدود رہا۔ اس کے برخلاف اسکینڈی نیویا کے نوعمر ادب کو ترجنیف کے ادب میں واقعیت نگاری اور اخلاقی احساس کا ایک قوی محرک مل گیا۔ K. TINDER نے اسکینڈی نیویا کے ادب پر کافی تحقیق کی ہے۔ "ٹنڈر" "انٹرنیشنل لٹریچر" میں ترجنیف کی بین الاقوامی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ترجنیف کے ناول ON THE EVE میں ایلین کے کردار نے نوروے کے اہل قلم کو عورتوں کی آزادی پر متوجہ کر دیا، اور IBSEN کے ناول DOLLS HOUSE میں ترجنیف کا اثر بلاواسطہ موجود ہے۔"

دوستوئیفسکی نے بھی یورپی زبانوں کے ادب کو کم متاثر نہیں کیا۔ یورپ میں جتنے تبصرے اور مقالے اس مصنف پر لکھے گئے اتنے خود روس میں نہیں لکھے گئے۔ تبصرہ نویسوں کا یہ جلوس اگرچہ دوستوئیفسکی کے بارے میں ایک رائے نہیں رکھتا لیکن تمام قابل ذکر نقاد یہ دیکھنے پر مجبور تھے کہ اس کے ہیرو کا دردناک اور خطرناک تجسس خوفناک حد تک باغیانہ ضرور ہے مگر وہ اسی حد تک انسانیت پرست بھی ہوتا ہے۔ جے مڈلٹن مرے، انگریز نقاد نے دوستوئیفسکی کی سوانح عمری لکھی تو اسوقت اس کے ذہن میں یہی چیز تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"دوستوئیفسکی ایک قوت تھا جو انگریزی ادب کی اسپرٹ اور انگریز ادیبوں کی فکر کو ناقابل اندازہ حد تک متاثر کر رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ذہنی و فکری بغاوت کے وہ مرقعے ہیں جن کو اس نے نہایت بے خوفی سے پیش کیا اور جو ادنےٰ طبقوں کی ابتلا اور مصیبتوں کے ذمہ دار نظام معاشرت کے خلاف پُر زور احتجاج ہیں۔"

امریکائی مصنف E. I. SIMMONS اپنے حالیہ مقالے "دوستوئیفسکی" میں لکھتا ہے:۔

"دوستویفسکی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ساری عمر حریت کا جویا رہا —— ذہنی و اخلاقی حریت کا۔ وہ اپنے عہد کی سماج کا اتنا بڑا دشمن تھا بڑے سے بڑا انقلابی جتنا ہو سکتا ہے۔ اس کے ناول خود دوستویفسکی سے زیادہ اشرف و پاکیزہ ہیں، اور یقیناً اس کے سماجی اور مذہبی خیالات کی عمر بہت طویل ہے۔"

پھر، دورِ انحطاط میں یورپ کے بہترین اہلِ قلم میں سے بیشتر جیسے میٹر لنک، ہاپتمان، اور آسکر وائلڈ وغیرہ دوستویفسکی سے متاثر تھے۔ ان سب کو پست و مجبور طبقۂ انسان سے جو محبت تھی، اور زندگی کی بے رحمیوں کے خلاف اس طبقے کی جد و جہد سے جو ہمدردی تھی وہ تمام تر دوستویفسکی کا اثر ہے۔ دوستویفسکی میں انسان کی باطنی دنیا کی الجھن اور کش مکش کو مصور کر دینے کی جو قابلیت تھی اس کو سب نے مانا اور الہام سے تعبیر کیا ہے۔ اُنیسویں صدی کے تمام تحلیل نفسی کرنے والے ادیبوں کا استاد یعنی CHARLES LAIUS PHILLIPPE سے لیکر STEPAN ZWEIG اور HEMMINGWOY تک اسی رُوسی استاد کے مکتب سے نکلے ہیں۔

ان دو رُوسی ادیبوں کے بعد لیو ٹالسٹائی آتا ہے جس کی بین الاقوامی اہمیت ان سے بھی زیادہ ہے۔ زوائگ کے لفظوں میں ٹالسٹائی نے دنیا کو بتایا کہ "جدید عہد کا تمدن جس بنیاد پر کھڑا ہے وہ بنیاد جھوٹی ہے!" ٹالسٹائی ہی نے دنیا کو یہ عقل دی کہ "انسان پر انسان کا جبر روا رکھنے والا سماجی نظام کھوکھلا اور نا انصافی پر مبنی ہے۔" ٹالسٹائی نے اپنے یورپی ہم عصروں پر کتنا گہرا نقش قائم کیا وہ موپساں کے الفاظ میں صحیح بیان ہوا ہے۔ موپساں نے ٹالسٹائی کی تصنیف DEATH OF IOAN ELYACH کو پڑھ کر کہا کہ:-

"آج میں سمجھا کہ میں نے جتنی محنت کی بے کار محض تھی۔ میری تمام کتابیں بے وقعت ہیں!"

روماں رولاں کی ادبی تنقید پر جتنی تصانیف ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے جمالیاتی اور ترقی پسند ادب پر ٹالسٹائی کا اثر اس سے بہت زیادہ ہے جتنا قیاس کیا جاتا ہے۔ رولاں نے اپنی ابتدائی تصنیف THE PEOPLS THEATER میں پہلی مرتبہ اس خیال کا اظہار کیا تھا، لیکن اس کے بعد کی ہر تصنیف میں وہ اس خیال پر اصرار کرتا گیا ہے۔ اور اپنی عمر کے آخر میں فرانس کے اس عظیم المرتبت ادیب و نقاد نے اعلان کیا کہ:-

"ٹالسٹائی نے تفوق اور اقتدار یافتہ طبقے کی ضاعت اور سماج کی تنقید کا جو کام شروع کیا تھا اسے برابر جاری رکھا"

فرانس کا مشہور و معروف ناول نویس مارسل پریوو س نے ITERNA TiONAL TOLSTOY ALMANICE میں لکھا ہے کہ "اگر ٹالسٹائی پیدا نہ ہوتا تو عہدِ حاضر کے تمام فرانسوی ناول نویس وہ نہ ہوتے جو وہ آج نظر آتے ہیں!"

اناتول فرانس اور ٹالسٹائی کے مابین بڑا فاصلہ تھا لیکن سماجی خرابیوں کو بیان اور آشکار کرنے والے مصنف کی حیثیت سے اناتول فرانس نے بھی ٹالسٹائی کا اثر قبول کیا۔ ستمبر ۱۹۲۸ء کے "انٹرنیشنل لٹریچر" میں اناتول فرانس تسلیم کرتا ہے:۔

"ٹالسٹائی Epic مصنف کی حیثیت سے ہم سب کا استاد ہے...... وہ بالذات ایک سبق ہے!"

بیسویں صدی کے مسلم الثبوت انگریز مصنف، ہارڈی، بٹلر، گالزوردی اور بالخصوص برنارڈشا جنھوں نے ذاتی یا نجی ملکیت کے حامیوں کی جھوٹ اور ریاکاری کا پردہ فاش کیا، بلا استثناء ٹالسٹائی کے اثر میں تھے۔ اور بالکل یہی صورت یورپ کے Epic مصنفوں کی ہے جنھوں نے انسان کی انفرادیت کا بروز سماج کے رشتے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان اہم کتابوں میں ٹامس مان کی BUDEN BROOK، روماں رولاں کی CHRISTOPHER اور ROGER DU GARD کی THIBAULT ہیں۔ ان Epic مصنفوں کی طرح وہ تمام ادیب بھی ٹالسٹائی سے اسی درجہ متاثر ہوئے جنھوں نے جنگ کے روزمرہ کے واقعات کو واقعیت نگاری کے ساتھ پیش کیا۔ اور یہی عالم یورپ کے تاریخی ناول نویسوں کا تھا۔

گورکی کے ادب نے دنیا کے ادبی بروز میں بالکل ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ بیسویں صدی کے عالمگیر ادب کے اندر جتنی واقعیت نگاری نظر آتی ہے اور قوم پرستانہ جذبات کا جس قدر اظہار ملتا ہے، اس سب کا سلسلہ گورکی پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے، اور اسی کے اثر کا نتیجہ ہے۔ موجودہ دور کے تمام قابل ذکر یورپی اہلِ قلم گورکی کے ذاتی دوست تھے، اس کے ساتھ ادبی رشتہ رکھتے تھے اور اس سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ آنری باربوس، فرانسوی ادیب گورکی کا متبع تھا اور فاشی حیوانیت کے خلاف جدوجہد میں اس کا ہم سفر بھی۔ باربوس نے اپنے مقالے میں جو ۱۹۳۸ء کے انٹرنیشنل لٹریچر میں

شائع ہوا تھا، لکھا ہے کہ "ہمارے زمانے میں گورکی ایک مشعل ہے جو دنیا کے لئے ایک نئی راہ روشن کر رہی ہے!" MARTIN ANDERSON NENO فاشی دشمن ادیب اعلیٰ گورکی کا پیرو اور پرولتاریا جدوجہد کا نقاش ہے۔ اس نے اپنے امام کی اہمیت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:۔

میکسم گورکی ایک اعلیٰ و برتر ضاع ادب سے بھی اونچی شخصیت ہے۔ وہ اپنے عہد کا پیکر یا عہد مجسم ہے!
گورکی نے کروڑوں انسانوں کو ـــــ تمام مجبور انسانیت کو آواز بخشی ہے جس کو اب کوئی طاقت خاموش نہیں کر سکتی!"

UPTON SINCLAIR نے اپنے مضمون مطبوعہ "انٹرنیشنل لٹریچر" فروری ۱۹۳۸ء میں اعتراف کیا ہے:۔

"جوانی میں گورکی کے ادب کا مطالعہ میری شخصیت کے بروز میں ایک اہم عنصر ہے!"

غرض موجودہ عہد کے تمام اہل قلم جو مجبور و مظلوم انسانیت کی آرزوئے آزادی کا اظہار کر رہے ہیں، گورکی کی شخصیت ان سب کے سامنے رہتی ہے، اور یہ سب (رومان رولاں، ہائنرخ مان، لیون فیوخت وانگر اور دوسرے مسلم الثبوت اہل قلم جو روس کے اکتوبری انقلاب کے بعد منظر عام پر آئے) گورکی ہی کا عکس و مثال ہیں۔ یہ لوگ اس وقت بھی گورکی کے ادبی منشاء و مقصد کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور اس کی تعمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ گورکی کا منشاء و مقصد اس کے ان لفظوں کے اندر رہے کہ:۔

"دنیا کو ایسی کتابیں درکار ہیں جو فاشیت کے خبث کو دنیا سے مٹا دیں۔ دنیا ہم سے ایسی کتابوں کا مطالبہ کر رہی ہے اور ہم کو یہ مطالبہ پورا کرنا ہے!"

بیسویں صدی کے آغاز میں روسی اثر یورپ میں اتنا بڑھا کہ تمام کلچری ادارے اس کی زد میں آ گئے۔ روسی رقص و ڈراما، روسی علم و فن، اور روسی کلچر و ادب پچھلی جنگ عظیم سے پہلے بڑی تیزی سے یورپ کو متاثر کر رہے تھے۔ چنانچہ ماگھم نے جو جنگ عظیم ۱۸ء میں ڈپلومیٹک خدمات پر بھی مامور رہا، اس حقیقت کا اعتراف شد و مد کے ساتھ کیا ہے۔

روسی ادب نے یورپی اہل قلم کو جس حد تک متاثر کیا، وہ اثر اپنی واقعی صورت اور اپنے تخلیقی اظہار کے اعتبار سے مختلف النوع ہے۔ لیکن اثر کی نوعیت کا یہ اختلاف فی الجملہ ایک وحدت رکھتا ہے، اور وہ وحدت اثر یہ ہے کہ روسی ادیبوں کے اثر نے نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کے تمام ملکوں اور قوموں کے ادب میں ترقی پسندی کا نظریہ پہنچا دیا، اور اب روسی ادب اس نظریے کا

مرکز بن گیا ہے اور اُسے برابر قوی بنا رہا ہے۔

اس جنگِ عالم ۲ میں سویٹ عوام نے فاشی حملہ آوروں کو شکست دے کر نہ صرف یورپ بلکہ دُنیا بھر میں رُوسی ادب کے مطالعے کا ایک نیا شوق پیدا کر دیا ہے اور ٹالسٹائی کا ناول "امن اور جنگ"، ترجنیف، دوستویافسکی، چیخوف، گورکی، شولاخوف، الیکزی ٹالسٹائی اور الیا اہرنبرگ کے علاوہ اور بہت سے ادیبوں کے کارنامے کثرت سے ترجمے ہو کر شائع ہو رہے ہیں۔

لیٹن امریکا اور ایشیائی ممالک میں موجودہ نسل کے اہلِ قلم ترقی پسند ادب پیدا کر رہے ہیں۔ چین اور جاپان کے نئے ادیب "انٹرنیشنل لٹریچر" کے مضمون نگار ہیں۔ ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک برابر بڑھ رہی ہے۔ اور روسی اُدب نہ صرف اُردو بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی بکثرت منتقل ہو رہا ہے۔ اُردو کے مشہور فسانہ نویس منشی پریم چند کے ناولوں میں ٹالسٹائی کا اثر جھلکتا ہے۔

غرض، جے بی پریسٹلی کے بقول "روسی اُدب انسان کا ضمیر ہے"۔ اور دُنیا بھر کے اہلِ قلم متفق ہیں کہ رُوسی اُدب ایک طاقت ہے جو فاشیانہ ظلمت پرستی اور جبر و تشدد کے خلاف جد و جہد کر کے انسانیت کا وقار قائم کرتی اور انسانی آزادی کو مقدس چیز قرار دیتی ہے۔ لفظ "فاشیت" کا نیا مفہوم رُوسی اُدب ہی نے پیدا کیا جس کو دنیا نے بلا تکلف قبول کر لیا۔ فقط

ل۔ احمد

———•×؛×•———

قدیم اُردُو

(دکھنی) میں نیچرل شاعری

(از جناب مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن)

میں نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" کے تیسرے اڈیشن میں اس امر پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ جنوبی ہند میں اُردو زبان عرصہ دراز تک دکھنی کے نام سے موسوم تھی۔ ولی نے غالباً اپنے سفر دہلی کے بعد اس کو ریختہ سے موسوم کیا تھا ؂

یہ ریختہ ولی کا جا کر اُسے سُنا دے
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

اس کے بعد بھی جنوبی ہند میں دکھنی کا رواج تھا، مگر چونکہ اب نام تبدیل ہو گیا تھا۔ اس لئے اگر ولی کی شاعری تک ہم اپنے عنوان کی سرحد مقرر کریں تو نامناسب نہیں ہو سکتا۔ اُسی زمانہ سے شمالی ہند کے نامور شعراء دکن میں زیادہ آنے لگے۔ ان کی وجہ سے یہاں کی زبان میں تغیر ہونے لگا۔ بول چال کی زبان سے تحریری زبان میں فرق آگیا۔ اگرچہ اس کے بعد عرصہ تک مدراس میسور وغیرہ میں دکھنی زبان ہی کا رواج تھا۔ مگر ہم عنوانِ بالا پر صرف ولی کے زمانہ تک صراحت کریں گے۔

واضح ہو کہ اُردو شاعری کے متعلق یہ عام خیال ہے کہ اس میں نیچرل اُمور کی ترجمانی اور فطرتی عنوانوں پر خیال آرائی مغربی شاعری کے اثر سے ہوئی ہے۔ اور یہ مغربی مضراب ہی کا ایک سر ہے۔ جو اُردو شاعری کے بربط سے نکل رہا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اُردو کی جدید شاعری کے متعلق یہ خیال بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن دکھنی شاعری کے متعلق یہ رائے صحیح نہیں ہو سکتی۔

کیونکہ دکھنی میں نیچرل شاعری کا وجود اس وقت سے ہے جبکہ مغربی شاعری سے کوئی واقف بھی نہیں تھا۔ اور نہ مغربی شاعری کے اثرات شروع ہوئے تھے۔

اس موقع پر اولاً نیچرل شاعری کی توضیح کرنی چاہیئے اس کے متعلق مولانا حالی نے اپنے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں حسب ذیل صراحت کی ہے:۔

"نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنےً دونوں حیثیت سے نیچرل یعنی فطرت یا عادات کے موافق ہے۔ لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تابمقدور اس زبان کے معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں شعر کہا گیا ہے۔۔۔۔۔۔

معنی نیچرل ہونے سے مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دُنیا میں ہُوا کرتی ہیں۔ یا ہونی چاہئیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کے متعلق اعتراض کر کے وضاحت فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں نیچرل شاعری کی جو تعریف کی ہے۔ اسی بنا پر مثنوی غزل اور قصیدہ غرض قدیم شاعری کے تمام اصناف جن میں یہ تعریف صادق آسکے۔ نیچرل شاعری میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اور خود مولانا حالی نے مثنوی اور غزل کے متعدد اشعار کو نیچرل ثابت کیا ہے۔ لیکن اس دَور میں اس لفظ کا اطلاق صرف مناظرِ قدرت اور وصف نگاری میں محدود ہو گیا ہے۔ اور عام طور سے جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے یہی دونوں صنفیں مراد ہوتی ہیں۔"

(صـ۴۱۳ شعر الہند جلد اوّل)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب فطرتی شاعری یا نیچرل شاعری صرف مناظر قدرت پر خیال آرائی اور وصف نگاری کا نام ہے۔ مناظر قدرت اور وصف نگاری کے متعلق بھی وضاحت ضروری ہے۔ مناظر قدرت میں صرف جذبہ انگیز چیزیں شامل کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً چاندنی۔ برسات۔ بہار۔ جنگل۔ پہاڑ۔ پھول چرند و پرند وغیرہ۔ جب شاعر ان میں سے کسی پر اظہارِ خیال کرے تو اس کو منظر نگاری کہا جائے گا۔

وصف نگاری میں موجوداتِ عالم کی حقیقت اور ان کے مخصوص اوصاف نمایاں کئے جانے

ہیں۔ اس میں مصنوعی چیزیں مثلاً باغ کی آرائش وزیبائش کسی جلوس یا دربار کی صراحت۔ برات اور رسومات وغیرہ کا تذکرہ ہو تو اس کو وصف نگاری سے موسوم کیا جاتا ہے۔

قدیم اُردو شاعری میں میر حسن۔ میر انیس کے بعض نمونے اور نظیر اکبرآبادی کے کلام میں اس قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ حاتم نے بھی ایک دو نظمیں لکھی ہیں۔ بقول مولانا عبدالسلام ندوی یہی قدما کا سرمایہ نیچرل شاعری ہے۔ لیکن دکھنی شاعری کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں نیچرل شاعری کا بہت زیادہ ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے۔ اور جدید شاعری نے جو ترقی نیچرل شاعری میں کی ہے اس کے کئی ایک امتیازات دکھنی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ اُردو کی جدید شاعری میں نیچرل شاعری کے متعلق جو امتیازات موجود ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) جدید شاعری میں مناظرِ قدرت میں بہت زیادہ تنوع پیدا کیا گیا ہے اور ہر قسم کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔

(۲) قدما کی طرح صرف بہار۔ خزاں کے فرضی مناظر نہیں دکھاتے بلکہ سیرِ کشمیر۔ سیرِ ڈیرہ دون۔ دھان کے کھیت۔ گنگا۔ جمنا۔ جنگل وغیرہ اصلی مناظر پر اظہارِ خیال ہوا ہے۔

(۳) قدیم شعرا کے یہاں محاکات سے زیادہ تخیل کا عنصر پایا جاتا ہے وہ نیچرل تصویر پوری طرح نہیں کھینچتے۔

یہ اور اس قسم کے امتیازات جدید شاعری کے لوازم اور خصوصیات ہیں۔ اگر دکھنی نیچرل شاعری پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی کئی امتیازات موجود ہیں۔ جو نیچرل طریقہ سے اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

اس تفصیل کے بعد اب میں دکھنی نیچرل شاعری کا تعارف کراتا ہوں۔ دکھنی زبان کی شاعری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں منظر نگاری کئی طرح سے ہوئی ہے۔ مثلاً موسم (بارش۔ گرمی۔ سردی) بہار و بسنت۔ نوروز۔ پھول اور پھل۔ سبزہ و ترکاری وغیرہ اسی طرح وصف نگاری میں شاہی محل و ایوان۔ عیدیں۔ رسومات۔ شادی و بیاہ۔ کھیل۔ تماشے وغیرہ کے متعلق بھی نظمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ جن شعرا نے منظر نگاری اور وصف نگاری کے متعلق زیادہ خیال آرائی کی ہے یہاں ان کی کسی قدر تفصیلی صراحت کی جاتی ہے۔

محمد قلی سلطان قلی

دکھنی شعرا میں سلطان محمد قلی قطب شاہ ایک ایسا شاعر ہے جس نے منظر نگاری اور وصف نگاری کے موضوع پر بہت زیادہ اپنے طائرِ خیال کو پرواز دی ہے۔ اس کے کلیات میں کئی نظمیں نیچرل شاعری کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ اس نے نیچر کے متعدد اُمور کو جولان گاہ بنایا ہے اور طرح طرح سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ جن جن موضوع پر اس نے طبع آزمائی کی ہے وہ یہ ہیں۔

بارشس۔ سرما۔ بسنت۔ نوروز۔ ہلال عید۔ ترکاری۔ پھول پھل۔ سالگرہ۔ رسم جلوہ۔ دیگر رسومات شادی۔ بیاہ۔ شبِ معراج۔ عید رمضان۔ عید غدیر۔ عید الضحیٰ۔ عید مولود نبی۔ چوگان۔ بازی وغیرہ

دکھن میں کو موسم بہار نہیں ہوتا، گر موسم بارشس ہی یہاں کا زمانۂ بہار ہے۔ دکن میں نہ تو بنگال، آسام اور سواحل ملیبار کی طرح کثرت سے بارش ہوتی ہے اور نہ بعض اضلاع مدراس اور راجپوتانہ کی طرح اس کی کمی ہے۔ اس افراط و تفریط کے نہ ہونے کی وجہ سے موسم بارشس نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ نہریں۔ ندی۔ نالے۔ چلنے لگتے ہیں۔ تالاب۔ کنٹے۔ پُر ہوا چلتے ہیں۔ ہر طرف سبزہ زار سے زمردیں فرش بچھ جاتا ہے۔ کھیت لہرانے لگتے ہیں۔ جنگل اور بیابان تازگی اور شادی کا ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں۔ جو نشاط افزا اور سرور انگیز ہوتا ہے۔ چوپائے اور جاندار غذا اور پانی کی افراط کے باعث تنومند ہو جاتے ہیں۔ باغوں میں رنگ برنگ کے پھول بہار دینے لگتے ہیں۔ غرضکہ موسم بارشس دکن میں دامانِ باغباں اور کفِ گل فروش کیلئے اپنی نمود و نمایشس کا سامان مہیا کرتا ہے۔

سلطان محمد قلی نے اپنی کئی نظموں میں موسم بارشس کا تذکرہ کیا ہے۔ اور مختلف انداز سے اس نے اپنی جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ سلطان کی ان نظموں سے نہ صرف منظر نگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ اس وقت کی معاشرت اور تمدن کے متعلق بھی بہت ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ موسم بارشس کے آغاز یعنی مرگ کے دن سلطان بہت دھوم دھام سے ایک جشن مناتا تھا۔ شرابِ ناب کے دَور چلتے۔ مطربانِ خوش نوا نغمہ طرازی

کرتے ۔ رقص و سرود کے کمالات دکھائے جاتے ۔ باغوں میں جھولے ڈالے جاتے ۔ شاہی بیگمات بیر بوٹیوں کے رنگ کے سُرخ کپڑے زیب تن کرتیں ۔ مشک ۔ زعفران ۔ عبیر مل کر حسینانِ جہاں جھولوں میں جھولا جھولتیں ۔ شاہی قصر اور ایوان میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھ جاتیں ۔

اب مختصر نمونہ کلام ملاحظہ ہو : ؎

مرگ مہینے کوں ملائے ملکاں مل گگناں میں　　سمندر موتیاں کے جو برسائے سو انگناں میں

دھرت بند چیر جواہر چولی رنگ پاچ کر انگ پر　　بر بہوٹیاں لعلاں سو اترے ہیں یمناں میں

کوکے چوندھرتے موراں ہرے بن چو طرفاں دیکھ　　پنکھی رنگارنگی نغمیں کریں مست ہو چمناں میں

ہرے صحرا میں نہوے لالی گلالاں نہوے بن میں　　شبنمی تیل سوں شمعاں جوں زمرد لگناں میں

موہنیاں تازے طراوت سوں سرنگ رنگ رنگ کی ابرتی　　جھونے بند چھند سوں لٹکتیا جو بنالے جوبناں میں

امرت اوصاف سجل سات ہے ظلمات سوں بھیئیں　　یا نچھل و و بدلاں سیام ہے جوبن کے کھناں میں

دیکھ عجب چھند و دتیں مچ رہے حیراں ہو کے یوں　　جو اہے کیوں لگناں ابر سوں کنچک سناں میں

کرنے نظارے ہوا کے پیاں سے مست سہلیاں　　میگ ملہار بھو نرگائے سو تن تن سمناں میں

نہوے مشکیں بھنوراں دو جو وطن کر رہیں پھل میں　　نرمل آ بچھے ہیں تلاں دو سمناں سے وقتاں میں

یہ نظم طویل ہے اس کا خلاصہ ہم ڈاکٹر زورؔ کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلطان نے کس طرح اظہارِ خیال کیا ہے : ۔

" آسمان پر فرشتوں نے مرگ کے مہینے کو دعوت دی اور خوشی میں سمندر کے موتیوں کو آسمان سے برسایا ۔ جن سے ہمارے صحن بھر گئے ۔ زمین نے سر پر جواہر کی پگڑی باندھی اور تن میں کانچ کے رنگ کی چولی پہن لی ۔ لعلِ یمن ۔ جیسی بیر بوٹیاں تمام ملکوں میں نکل آئیں ۔

ہر طرف ہرے بھرے جنگل دیکھ کر چاروں طرف مور کوک رہے ہیں اور رنگ برنگ کے پرندے چمنوں میں مست ہو کر نغمے گا رہے ہیں ۔

ہر جنگل میں لال لال پھول نہیں ہیں بلکہ زمرد کے لگنوں میں شبنمی تیل سے شمعیں جل رہی ہیں ۔

اس تازگی اور طراوت کو دیکھ کر موہنیاں اپنے خوش رنگ جسموں پر رنگ برنگ کے لباس

پہنتی اپنے جوبنوں کی بہار دکھاتی ہوئی ناز و انداز کے ساتھ محو خرام ہیں۔

ان کے آب حیات جیسے صاف شفاف پستانوں کے ساتھ سیاہ سرپستاں ظلمات کی طرح لگی ہوئی ہیں۔ یا جوبن کے پاک وصاف آسمانوں پر دو کالے کالے بادل چڑھ آئے ہیں۔

ہُوا کا نظارہ کرنے کے لئے مست سہیلیوں نے شراب پی لی ہے۔ اور چنبیلی کے پھولوں میں بھنورے ملہار کے گیت گاتے پھر رہے ہیں۔

یہ مشک جیسے سیاہ بھنورے نہیں ہیں جو پھولوں کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں بلکہ چنبیلی جیسی نرمل ٹھوڑیوں کی کالی کالی تلیں ہیں۔

زرّیں لباس میں سکھیاں سر سے پاؤں تک زرق برق نظر آرہی ہیں۔ اور ان کے گھنگروؤں نے میرے دل کو لبھاکر مچھلی کی طرح بے تاب بنادیا ہے۔"

موسم بارش اور آغاز بارش کے متعلق سلطان محمد قلی کی (۱۶) نظمیں ہیں۔ جن میں اس نے مختلف نہج سے اپنے طائرِ خیال کو پرواز دی ہے۔

بسنت وہ تہوار ہے جس کو ہندو موسم بہار کے آغاز پر مناتے ہیں۔ ہندوستان میں بہار کا موسم وسط مارچ میں سمجھا جاتا ہے۔ جب پھولوں کی کثرت ہوتی ہے۔ سلطان محمد قلی اس تقریب کو نہایت کرّوفر اور شاندار طریقہ پر مناتا تھا۔ بسنت کے متعلق اس کے کلیات میں (۱۴) نظمیں ہیں جو رنگینی اور برجستگی کے لحاظ سے خاص طور پر قابلِ تذکرہ ہیں۔ چونکہ وہ خود رنگین مزاج اور عیش پسند واقع ہوا تھا۔ اس لئے ان نظموں میں خصوصیت سے عریانی کا پہلو زیادہ ملتا ہے۔ ان نظموں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسنت کے موقع پر قصر و ایوانوں اور باغوں میں پھولوں کے انبار جمع کر دئے جاتے تھے۔ حوضوں کو رنگوں سے بھر دیا جاتا اور دل کھول کر رنگ کھیلا جاتا۔

ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا
تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا

نجھل کندن کے تاراں انگ جھونا
بندی ہوں جھند برسوں کر سنگارا

بسنت کھیلیں ہمیں ہور ساجنا یوں
کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

پیا پگ پر ملا کر لیا تی پیاری / بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگاداا

جوبن کے حوض خانے رنگ مدلو بھر / سورو مارو م چرکیاں لائے دھارا

بھیگی چولی میں بھئیں نس نشانی / عجب سورج میں ہے کیوں نس کوں ٹھلا

بسنت ونت جھمد ہو گندن گال اوپر / پھول یا آگ کیسری کی بہارا

ڈاکٹر زور کے الفاظ میں اس نظم کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"اے پیارے آؤ عشق کی بسنت کھیلیں کیونکہ تم چاند ہو اور میں تارا ہوں۔ میرا جسم خالص کندن کی طرح چمک رہا ہے۔ اور میں سنگار کر کے ہر طرح سے آراستہ ہوں۔

ہم اور ہمارا ساجن اس طرح بسنت کا رنگ کھیلیں جیسے آسمان شفق کی وجہ سے رنگا رنگ ہو جاتا ہے۔

شفق کے رنگ کے پیچھے سے جس طرح تارے جھلکنے لگتے ہیں اسی طرح ہمارا سورج کی کرنوں جیسے تاروں سے بنا ہوا لباس جھلکنے لگا۔

پیاری بسنت کو پیا کے قدموں تے مل کرلے آئی اور پھر اس طرح بسنت کھیلی کر رنگ رنگ کو سنگار حاصل ہو گیا۔

اپنے جوبن کے حوض خانوں میں عشق کا رنگ بھر کر جسم کے رویں رویں میں بجلی کی رو دوڑا دیتی ہے۔ رنگ سے بھیگی ہوئی چولی میں سے سر پستاں رات کی نشانی بن کر سیاہ نظر آتی ہے۔ اور اسکو تعجب ہوتا ہے کہ سورج (جیسے پستان) کے بیچ میں رات کو کیسی جگہ مل گئی۔

بسنتی رنگ کے جسموں اور کندنی گالوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیسر کی آگ کی بہار پھل پھول رہی ہے۔

پیا کے صدقے میں قطب شاہ نے ایسی دھوم دھام کی بسنت کھیلی کہ تینوں عالم رنگیلے ہو رہے ہیں"

سلطان محمد قلی کو پانی۔ سبزہ اور روشنی سے بڑی محبت اور دلچسپی تھی جس طرح موسم بارش اور آغاز بارش کے متعلق اس کی متعدد نظمیں ہیں۔ اسی طرح شب برات کے متعلق بھی اس نے دل کھول کر اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے۔ شب برات کے عنوان پر اس کی دس نظمیں ہیں۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شب برات کو کثرت سے روشنی کی جاتی تھی اور آتشبازی چھوڑی جاتی تھی۔ ایک نظم کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"شب برات کی وجہ سے تمام راتوں کو شرف حاصل ہوا اور سب راتوں میں شب برات ہی کو شرف حاصل ہے۔

کثرت چراغاں کی وجہ سے رات ایسی منور ہوگئی کہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سورج کے دن نکل آیا ہے۔

زمین کے ان چراغوں کا عکس جب آسمان پر پڑا تو وہ بھی آئینہ کی طرح چمکنے لگا۔ آتشبازی اور چراغوں کی وجہ سے دنیا ایسی روشن ہو جاتی ہے کہ اس اجالے کو دیکھ کر آفتاب شرما گیا اور اسی شرم کے مارے رات کو کبھی اپنا منہ نہیں دکھاتا۔

شب برات میں جو مہتاب چھوڑے جاتے ہیں ان کی تابانی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے ظلمات میں آب خضر۔ گلشن میں جب پھول جھڑیاں چھوڑی جاتی ہیں تو زمین پر سورج چاند اور تارے اتر آتے ہیں اور ان کی روشنی کی جھلک آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔

خدائے تعالی نے قطب شاہ کو ایسی تجلی بخشی کہ اس نے رات کو دن سے زیادہ روشن کر کے چمکا دیا۔"

سلطان محمد قلی نے اپنے شاہی قصر و ایوانوں اور باغوں مثلاً خداداد محل۔ محل کوہ طور۔ سجن محل۔ املی محل۔ باغ محمد شاہی وغیرہ پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ قصر و ایوان کی شان دار عمارات، ان کی شان و شوکت، باغوں کی سرسبزی و شادابی، پانی سے لبریز حوض، پھول اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت، انواع و اقسام کے میووں، ترکاری وغیرہ پر خوب خوب داد سخنوری دی ہے۔ افسوس ہے کہ مطبوعہ کلیات میں ایسے وہ طویل قصیدے، مثنویاں اور ترجیع بند نہیں ہیں جو اس نے اپنے قصر و ایوان، دیگر عمارتوں اور باغوں پر لکھے تھے۔ اگر یہ دستیاب ہو جاتے تو شائع شدہ کلیات کا حجم دوگنا ہو جاتا۔

یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ اس قسم کی نظموں کی تفصیل کی جائے یا ان کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ اس لئے ہم صرف ایک نظم کا خلاصہ پیش کرتے ہیں اور سلطان محمد قلی کے بیان کو ختم کرتے ہیں۔ یہ نظم باغ محمد شاہی پر لکھی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر زور کے یہ باغ اس جگہ تھا جہاں پر عالم کی بارہ دری ہے۔ دہلی دروازہ کے ایک طرف آئین الملک کا باغ تھا۔ جواب زنانہ دواخانہ

بنا ہوا ہے اور اس کے دوسرے طرف باغ محمد شاہی واقع تھا :۔

"محمد قلی کا یہ تمام چمن مُحمّدؐ کے نام سے سرسبز و شاداب ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے اپنے طوبیٰ جیسے درختوں کی وجہ سے یہ چمن کی طرح سُہانا معلوم ہوتا ہے۔

جس طرح فانوس کے اندر سے چراغوں کی روشنی خوبصورت نظر آتی ہے، اسی طرح دیواروں کے پیچھے سے میووں اور پھولوں کے جسم نظر آرہے ہیں۔

چمپا کی کلی ناک کی طرح نظر آرہی تھی جس کی دو دو پتیاں دو دو پھول کی طرح ہیں اور اس جگہ بھونرے کو تل کی طرح دیکھ کر سب کا دل حیران ہو گیا۔

لاکھوں انگوروں کے خوشے ثریا اور سنبلہ کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور اس انگور کے منڈوے کی تازگی کے سامنے آسمان پرانا نظر آتا ہے۔

اناروں میں دانے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے یاقوت تھیلیوں میں اور کھجوروں کے خوشے مرجان کے گچھوں کی طرح نظر آتے ہیں اور سیپاروں کے لال خوشے دن اور رات کی طرح سیاہ و سفید نظر آتے ہیں۔

ناریل کے پھل زمرد کے مرتبانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں اس کے تاج کو اہل دکن بیالگتے ہیں۔

جامن کے پھل بن میں سالم نیلم کی طرح نظر آتے ہیں اور اس کو اس لئے رکھا ہو کہ دوسرے میووں کو نظر نہ لگے۔

اس باغ کی تعریف و توصیف کے لئے سوسن نے بھی دس دس زبانیں کھولی ہیں اور دکن اپنی سب سُندریوں اور حسینوں کی وجہ سے کھلی نرگس کی طرح بارونق ہو گیا ہے۔

چمن کا شہرہ سُنکر بلبل سب آپس میں خوشی سے الاپ رہے ہیں اور ان کی آواز سُنکر جنت کی حوریں رقص کر رہی ہیں جس کو دیکھ کر درخت مست ہو رہے ہیں اور اپنے پتّوں جیسے ہاتھوں سے تالیاں بجا رہے ہیں۔

ڈالیاں پھولوں کی شراب جیسی خوشبو سے مست ہو کر ڈول رہی ہیں، شاید یہ شبنم کی شراب ہے یا کسی کے ہونٹوں کے عرق کا پیالہ۔ یہ بھی اچھا ہے اور وہ بھی اچھی بشرطیکہ اے محبوب تیرے ساتھ بل کر پینے کا موقع ملے"

سلطان محمد قلی نے اسی طرح اپنی نظموں میں تمدن اور معاشرت کا بھی اظہار کیا ہے۔ عیدوں،

تہواروں۔ شادی وبیاہ کے رسوم۔ کھیل اور تماشوں کے متعلق اس نے اپنے تخیل کی پرواز دکھائی ہے۔ ان کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا موجب۔

بہرحال سلطان کی شاعری میں ہم کو نیچرل شاعری کے نہایت عمدہ اور گراں بہا نمونے ملتے ہیں۔

نصرتی

دکن کا دوسرا زبردست شاعر جس کے کلام میں ہمیں نیچرل شاعری کے عمدہ نمونے دستیاب ہوتے ہیں وہ بیجاپور کا ملک الشعرا نصرتی ہے۔ اس کی تصانیف گلشنِ عشق۔ علی نامہ اور تاریخ اسکندری نہ صرف واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہیں بلکہ اگر ان پر نیچرل شاعری کی حیثیت سے بھی نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی نے وصف نگاری اور منظر نگاری کا بھی بہترین سرمایہ فراہم کیا ہے، اس کی مثنوی گلشنِ عشق اگرچہ کہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ مگر اس میں باغ کا منظر، صبح کا سماں، چاندنی کی کیفیت، کشتی کی روانی، سردی کا حال، تمازت آفتاب، وغیرہ کی کیفیت جس طرح واضح کی ہے۔ وہ منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

نصرتی کا دوسرا شہ کار علی نامہ ہے۔ جو ایک تاریخی اور رزمیہ مثنوی ہے۔ لیکن اس میں بھی نیچرل شاعری کا بہت اچھا ذخیرہ ہمدست ہوتا ہے۔ اس میں نصرتی نے بادشاہ کی تخت نشینی کے جشن، شہر کی آرائش و زیبائش، رعایا کی خوش حالی کا بیان نہایت خوبی سے کیا ہے۔ ایک قصیدہ میں موسم سرما کی حالت بیان کی ہے۔ سردی کی شدت، شبنم کی کیفیت، باغوں کی حالت، گل و گلشن کی پژمردگی کا حال جس قابلیت سے کیا ہے، وہ نصرتی کی اعلیٰ قابلیت پر بخوبی دال ہے۔

علی عادل شاہ کو جب صلابت خاں پر پوری طرح فتح مندی اور کامیابی حاصل ہوئی اور بادشاہ نے بعد فتح و فیروزی جشن منایا تو نصرتی نے اس موقع پر جو قصیدہ پیش کیا ہے، وہ بھی وصف نگاری کی حیثیت سے قابل ستائش ہے۔ شہر کی آراستگی، آئینہ بندی، دکانوں کی آرائش و زیبائش لوگوں کی مسرت اور شادمانی اگم گم خوشی و مسرت کے جلسوں کا ہونا، چراغوں کی کثرت سے رات کا شب مہتاب بن جانا، ہزاروں آدمیوں کا بادشاہ کی سواری کا منتظر بیٹھنا، جدھر دیکھو آدمیوں کا سمندر معلوم ہوتا، ان میں خورد و کلاں، جوان، بوڑھے، مرد اور عورت سب کا شامل ہونا منظر ان تمام واقعات کی نہایت عمدہ وصف نگاری کی ہے اور حق یہ کہ زندگی جاوید کا مستحق ہے۔

اسی طرح نصرتی نے ملیبار کی فتح پر جو قصیدہ پیش کیا ہے اس میں جس خوبی سے باغ کی تعریف و توصیف کی ہے۔ وہ منظر نگاری کی حیثیت سے قابلِ تعریف ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ڈوباتی رُو نیلاب مغرب میں وخش ۔۔۔ نکل آئی نس ہو ہٹو فیض بخش
چندر پاک چھاتی تے دھویا غبار ۔۔۔ سورج کا ہوا آئینہ تا بدار
لے جلوہ خوش نیسنی کے حضور ۔۔۔ کیا پردہ پردہ نشیناں تھے دُور
دینے جوش پر نور سیلاب کا ۔۔۔ ہوا تھا کوا چاند سیماب کا
گگن پر نہ ہو ٹھا رتا راد سے ۔۔۔ کٹورے بھریا سب او پارا دسے
صفائی سوں چندنے کے چار و رفن ۔۔۔ چھلکتی تھی بھوئیں صاف ابرک نمن
فلک اور زمیں سوا تھے نور میں ۔۔۔ چھپا تھا جنا مشک کا فور میں
مگر کھم پہ چادر مُرصّع کی ست ۔۔۔ زمیں پو بچھائے تھے اجلا نکٹ
یوں اپ وطن میں دھریا تھا قرار ۔۔۔ نہ کوئی پات ہلتا اتھا اس منھار
سہاتے تھے یوں پھول پھل ڈال پر ۔۔۔ پیالے ہیں چینی کے جیوں دودھ بھر

نصرتی کے منظر نگاری کا خلاصہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے الفاظ میں چاندنی کی کیفیت اس طرح واضح ہوئی ہے:۔

"رات نے اپنا مشکی گھوڑا مغرب کے دریا میں ڈالا اور فیض بخش دوست بن کر نکلی۔

پاک چاند نے اپنی چھاتی سے غبار دھویا اور سورج کا آئینہ (بدر) روشن ہوا۔ تاجدار شب کے حضور میں جلوہ دکھانے کے لئے سب پردہ نشینوں نے پردے اُٹھا دیئے۔

پر نور سیلاب کے جوش دینے کے لئے چاند سیماب کا کنواں بن گیا تھا۔ آسمان پر کہیں کوئی تا نظر نہ آتا تھا وہ بالکل ایک پارا بھر کٹورا معلوم ہوتا تھا۔

چاندنی کی بُراقی سے چاروں طرف زمین ابرک کی طرح چمک رہی تھی۔ زمین اور آسمان نور سے بھر پڑے تھے جس قدر بھی سیاہی تھی وہ سب کافور (روشنی) میں چھپ گئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آسمان پر مُرصع چادر تان دی ہے اور زمین پر شفاف روپیلی چادر بچھی ہوئی تھی۔

اس وقت کوئی پتہ تک نہیں ہلتا تھا۔ شائد ہوا وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔

ڈالیوں پر پھول پھل ایسے بھلے معلوم ہوتے تھے جیسے دودھ بھرے چینی کے پیالے۔

حوض میں پانی اس طرح ساکت کھڑا تھا گویا دودھ کا پنیر بنا کر رکھ چھوڑا ہے"

گلشن عشق کے نمونہ کی طرح ایک اقتباس علی نامہ سے بھی پیش کیا جاتا ہے :۔

"کوہستان کے منہ پر نہایت دشوار گزار گھاٹ تھا۔ جس کا تنگ راستہ معمے سے بھی زیادہ موہوم تھا۔

اس دشوار راستہ کا نام لیتے ہوئے زبان کا پاؤں ہمیشہ منہ میں پھسل پھسل جاتا تھا۔

اور اس گھاٹ کے نیچے جو کوکن کا علاقہ ہے۔ وہاں روز روشن رات کی طرح نظر آتی ہے۔

اندھیرا نور سے یوں ملا جلا نظر آتا ہے گویا دن شام و بجور کا جفت ہے۔ اندھیرا اس غضب کا تھا کہ دن کو تارے نظر آتے تھے۔ اور رصد والے وہاں بیٹھ کا کام کر سکتے تھے۔

اگرچیکہ وہ روئے زمین محجوب ہے لیکن سورج کی نظروں سے بھی حجاب میں ہے۔

زمین ایک صاحب جمال عورت ہے۔ اور یہ قطعہ زمین گویا اس کے چہرے کا خال ہے۔

اگرچیکہ سارے عالم کا اندھیرا وہاں جمع ہے۔ لیکن اندھیرے میں کئی لاکھ شمعیں روشن ہیں۔

گویا ایک رات میں ہزاروں سورج نکلے ہوئے ہیں اور گلستان کا نور چھایا ہوا ہے۔

طرح طرح کے حسین پرندے اپنے رقص اور نغموں سے عجب بہار دکھا رہے ہیں، درخت آپس میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ آسمان کو چھپا لیا ہے۔ اور زمین پر ستاروں کی طرف جھلک نظر آتی ہے۔

ایک ایک بانس کا یہ حوصلہ ہے کہ وہ آسمان کی چھت پر سے مکڑیوں کے جالے اتارنے کا خیال رکھتا ہے۔

بانس آسمانوں سے یوں بھڑے ہوئے نظر آتے ہیں گویا منصور تو ایک ہے اور داریں ہزاروں ہیں۔

اس زمین میں شیروں کے خاص گھر ہیں جن کے منہ پہ بانسوں کی گھنی جالیاں بنا رکھی ہیں۔

جابجا غار اور خون ریز کانٹے نظر آتے ہیں اور ہر قدم پر ہزاروں طشت اور نشتر موجود ہیں۔"

نصرتی نے علی نامہ میں جنگ کے واقعات اور حالات اس خوبی سے نظم کئے ہیں کہ بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس نے واقعہ نگاری کا بہترین نمونہ اپنی مثنوی میں پیش کیا جسکی صراحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔

شاہیؔ علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہیؔ وہ دوسرا تاجدار ہے جس نے منظر نگاری اور وصف نگاری کا سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس کے کلیات کا نایاب نسخہ جو ہم کو دستیاب ہوا تھا۔ اس کو دفتر دیوانی ومال نے اپنے کتب خانہ کے لئے خرید ا ہے۔ اس کلیات کے متعلق راقم کے دو مضمون رسالہ معارف اور رسالہ شہاب میں چھ سات سال پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی طرح شاہیؔ کے دیوان میں نظمیں نہیں ہیں، مگر قصائد وغیرہ میں منظر نگاری کا ذخیرہ موجود ہے۔ شاہیؔ کا ایک قصیدہ علی داد محل کے عنوان پر ہے۔ اس طویل قصیدہ میں اس نے وصف نگاری کا بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

اس نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ قصر کی بنیاد پاتال تک ہے، اس کی بلندی آسمان سے ہم کلام ہے۔ آفتاب اس سے نور حاصل کرتا ہے۔

طاقِ کسریٰ کی بلندی اس کا صرف زینہ ہے۔ حوض کا پانی اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ آسمان معلوم ہوتا ہے۔ فوارہ سے پانی اس طرح گرتا ہے کہ موتی بکھرے جا رہے ہیں۔

باغ میں قسم قسم کے پھولوں کے تختوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے کئی پھولوں کے نام گنائے ہیں چنبیلی، جوئی، گلاب، سیوتی، غرض کہ بیسوں نام گنائے ہیں۔ اس طرح باغ کے بیسوں درختوں۔ سرو شمشاد کی بہار اور دوسری طرف میووں کے درختوں کے اقسام بیان کئے ہیں، اور اچھوتی نسبتوں سے ان کو بیان کیا ہے ان سب کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی۔

قطب شاہی و عادل شاہی دیگر شعراء قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے دوسرے شعراء جنھوں نے ایک سے زیادہ مثنویاں لکھی ہیں، ان میں جابجا منظر نگاری اور وصف نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ ان کی مثنویوں میں صبح شام، طلوع آفتاب، رات، تاریکی جنگل، موسم بہار، محل، ایوان، باغ، گلشن، پھول، اور پھل وغیرہ پر جو اظہار خیال ہوا ہے وہ نیچرل شاعری کا نہایت عمدہ اور کارآمد سرمایہ ہے۔ اگر ان سب کا تذکرہ کیا جائے تو ایک دفتر درکار ہے۔ اس کیلئے یہاں وقت ہے اور نہ مجھے فرصت۔

قطب شاہی دور کے بعد مغلیہ زمانہ آتا ہے۔ جبکہ عالمگیر خلد آشیاں کے عہد میں بھی دکھنی زبان کی شاعری رائج رہی۔ اور اس زمانہ کے شعراء نے بھی اپنے پیش رو شعراء کی طرح مثنویاں

لکھی ہیں۔ مگر اس زمانہ میں عشقیہ مثنویاں یا رزمیہ مثنویوں کے بجائے زیادہ تر تصوف، اخلاقیات اور سیرت نبوی صلعم کے متعلق مثنویاں لکھی جاتی رہیں۔ جن کی تفصیلی صراحت میں نے اپنی زیرِ اشاعت کتاب "دکھنی مثنویاں" میں کردی ہے۔ اس قسم کی مثنویوں سے بھی منظر نگاری اور وصف نگاری کا مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔ اور وہ اس نوع کا بہترین سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

آخر میں ہم کو ولی کا تذکرہ کرنا ہے، جو اس دور کے آخر شاعر ہیں، اور جنھوں نے مثنویوں کے قدیم طرز کو چھوڑ کر غزلوں میں اظہارِ خیال کا طریقہ رائج کیا اور ان کے بعد ہی غزل گوئی پروان چڑھی۔ ولی نے بھی وصف نگاری کا ایک نمونہ چھوڑا ہے۔ چنانچہ اونھوں نے "سورت" کے متعلق جو نظم کہی ہے وہ وصف نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کے چند شعر حسب ذیل ہیں :-

عجب شہراں میں ہے پُر نور یک شہر — بلاشک وہ ہے جگ میں مقصد دھر
رہے مشہور اس کا نام سورت — کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور — رکھو اس نور سوں ہو چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب — ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب
سرج سُن آب اس کی جگ میں کانپا — سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا
کنارے اس کے اک دریائے تپتی — کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے بھٹی

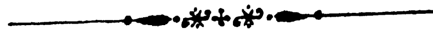
. . . .

عجب قلعہ ہے وہاں اک با قرینہ — انگوٹی میں دنیا کے جیوں نگینہ
نزک قلعے کے باڑا گھاٹ ہے وہاں — کہ دائم گل رُخاں کی ہاٹ ہے وہاں
رہے اس حاشیے پر جائے آرام — طلسمی باغ وہاں ہوتا ہے ہر شام

تبصرہ اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ قدیم اردو میں نیچرل شاعری کا بہت کچھ ذخیرہ موجود ہے۔ ہمارے شعرا نے نیچرل شاعری کی حیثیت سے بھی کافی بلند پایہ اور عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلام میں تخیل کی پرواز۔ اسلوب بیانی کی جدت۔ تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت قابل داد ہے۔ انھوں نے فطرت کے مختلف اشیاء کو اپنے سخن گوئی کا محور بنایا تھا

اور نیچرل طور سے نہایت عمدہ طور پر دادِ سخن وری دی ہے۔ ان کی جودتِ طبع اور ان کی رسائی ذہن ان کے بلند پایہ افکار ہر حیثیت سے مستحق ستائش ہیں۔ آج نیچرل شاعری کے نام سے جن امور پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔ اور جو خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں ان میں سے بہت سارے مضامین اور موضوع ایسے ہیں جن پر قدیم اردو کے شعرا نے بھی دادِ سخنوری دے دی ہے۔ صرف فرق یہی ہے کہ اس زمانہ کی زبان آج کل کی زبان کی بہ نسبت زیادہ شستہ اور رواں نہیں تھی لیکن چاہے ہماری زبان آگے چل کر اور زیادہ شستہ اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے اور چاہے آیندہ ہماری زبان اور زیادہ نازک اور دقیق مطالب کی مخزن کیوں نہ ہو جائے۔ ہم ابتدائی زمانہ کی ادبی کوششوں کی احسان مندی سے کبھی سبکدوش نہ ہوسکیں گے۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی



تعلیم بالغان کی ایک اسکیم

(از مولوی منظر الرحمٰن صاحب بچھرایونی)



چند سال تعلیم بالغان کے کام کا عملی تجربہ کرنے اور اس سلسلہ میں تھوڑا بہت مطالعہ کرنے کے بعد جو ضروری اصلاحات اور تجاویز سمجھ میں آئی ہیں وہ اس مختصر مضمون میں جمع کر دی گئی ہیں۔ تاکہ ملک کی بڑی انجمنیں، سرکاری محکمے اور تعلیم بالغان کا کام کرنے والے مدرس، منتظمین کے گوش گزار ہو سکیں اور اگر کوئی صاحب کسی ایک چیز بھی توجہ فرما کر اصلاح یا تجربہ کر سکیں تو دوسرے کارکنان کے لئے مشعلِ ہدایت بن جائیں۔

اس میں دو قسم کے قابلِ توجہ مضامین ہیں۔ اسلئے اُن کی فہرست علیحدہ علیحدہ پیش کی جاتی ہے تاکہ ساری اسکیم پر غور کرنے کا اگر وقت اور موقع نہ ہو تو صرف اپنے متعلقہ مضامین پر پوری توجہ دی جا سکے۔

انجمنوں اور سرکاری عہدہ داروں کی توجہ کے مضامین

۱۔ تعلیم بالغان کی ضرورت اور ہماری انجمنوں کا فرض۔
۲۔ اُستادوں کی ٹریننگ۔
۳۔ بالغوں کے اخبارات۔
۴۔ اخبارات میں تعلیم بالغان کے لئے مستقل عنوان۔
۵۔ مدت تعلیم مقرر کرنا مفید نہیں۔
۶۔ حلقے بنائے جائیں۔

مدرسین و منتظمین کی توجہ کے مضامین

۱۔ تعلیم بالغان کی ضرورت اور ہماری انجمنوں کا فرض۔
۲۔ پروپیگنڈا۔
۳۔ طریقِ تعلیم۔
۴۔ تعلیمی مرکز۔
۵۔ نصابِ تعلیم۔
۶۔ امتحانات، انعامات، اور سندیں۔

اس مضمون کو چند تجربہ کار ماہرینِ تعلیم نے بغور ملاحظہ کیا ہے اور بالغ کی ضروریات و استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے نصاب وغیرہ کی اصلاح کی ہے، اس لئے شاید یہ کاوش اس قابل ہو گئی ہے کہ دوسرے لوگ اپنا کچھ وقت اس کے مطالعہ اور غور و خوض میں صرف کر سکیں۔

منظر الرحمٰن۔

ہندوستان کی مردم شماری اور جہالت

ہمارا ملک (ہندوستان) آبادی کے لحاظ سے دنیا بھر کے ملکوں سے بلند مرتبہ ہے لیکن ابتدائی تعلیم، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لحاظ سے آخری اور بدترین درجہ رکھتا ہے۔ حرف شناسوں کی تعداد ہماری وسیع آبادی میں بہت ہی کم ہے۔

شعبۂ تعلیم امریکہ کے بلیٹن نمبر ۲۹ سنہ ۱۹۲۹ء میں دُنیا کے ۶۸ ممالک قرار دے کر انھیں دس حصوں میں خواندگی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے تقسیم کیا گیا، اس فہرست میں اوّل درجہ کے ممالک وہ ہیں کہ جن میں حرف شناسوں کی تعداد ۹۰ اور ۱۰۰ کے درمیان ہے۔ چنانچہ انگلستان اور جاپان کے دونوں ممالک اوّل درجہ میں ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان جو ان دونوں ممالک سے مردم شماری میں کہیں زائد ہے، لیکن ہندوستان کا حرف شناسوں کے اعتبار سے دسواں یعنی سب سے آخری نمبر ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ حرف شناسوں کی تعداد ہندوستان میں دس فی صدی سے بھی کم ہے۔

جاپان کی قابل تقلید ترقی

پچاس ساٹھ سال قبل جاپان کی تعلیمی حالت ہندوستان کی تعلیمی حالت سے زیادہ بہتر نہ تھی لیکن اُس ملک کے لوگوں نے جہالت مٹانے اور تعلیم کو عام کرنے کا تہیہ کیا اور حکومت نے، باہمی انجمنوں نے، جان توڑ کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہاں ایک ہزار آدمیوں میں صرف چار آدمی ناخواندہ ہیں۔ اُن کے یہاں سنہ ۱۹۲۲ء میں ۹۹ فیصدی بچے اسکولوں میں پہونچ چکے ہیں۔

ہماری یہ تعلیمی پستی آج پیدا نہیں ہوئی بلکہ سالہا سال سے ہے اور اس کے احساس کو بھی کافی زمانہ گزر چکا ہے۔ اُس کی مدافعت کے لئے بھی تدابیر کرتے ہوئے کم وبیش ساٹھ ستر سال گزر گئے لیکن اس سارے عرصہ میں جو ترقی ہو سکی ہے اُس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ سنہ ۱۸۸۱ء میں ہمارے خواندوں کی تعداد ۳،۵ فی صدی یا ۳۵ فی ہزار تھی، اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کے خواندوں کی تعداد ۸،۰ یا ۸۰ فی ہزار تک پہونچی۔

مندرجہ بالا پچاس سال کے اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک نے پچاس سال میں ۳،۵ سے ۸ فی صدی تک ترقی کی ہے یعنی ہر دس سال میں صرف ایک فی صدی سے بھی کم خواندہ بنائے جا سکے۔ اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ۹۲ فی صدی جاہل ہندوستان میں موجود ہیں۔

جبکہ ہندوستان سے بہت چھوٹے دوسرے ممالک میں ۹۲ فی صدی سے زائد خواندہ ہوتے ہیں۔

پُرانے زمانہ میں اشاعت تعلیم کا کام رعایا خود اپنے طور پر اور پوری ذمہ داری سے کرتی تھی۔ ہر مسجد اور مکان میں ایک مختصر مدرسہ ضرور ہوتا تھا جس کی کفالت اس کے قرب و جوار کے لوگ اپنے پر فرض سمجھتے تھے، اِن کے علاوہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے جو مدرسے تھے اُن کے مصارف اوقاف، اُمراء اور والیانِ ملک پورے کرتے تھے۔ طلباء کے لئے وظائف، کھانے، کپڑے کی ذمہ داری صاحب استطاعت کرتے رہتے تھے۔ فارغ طلباء کی قدر و منزلت ہوتی تھی اُن کیلئے تمام بڑے عہدے اور کام کھُلے ہوئے تھے جن پر وہ اپنی استعداد و ذہانت کے موافق ترقی کر کے پہونچتے اور قوم و ملک کی خدمت کرتے تھے۔ یہ تعلیمی نظام دوسرے دیہاتی نظاموں کی طرح مکمل اور رائج تھا جس کی تعریف ڈاکٹر لائٹنر پنجاب کے مشہور تعلیمی افسر نے کی ہے کہ:۔

> "ہندوستان کے ہر گاؤں کا نظام مکمل تھا جس طرح ہر گاؤں میں ایک مکھیا یا سردار معاملات طے کرنے کے لئے، ایک محاسب حسابات لکھنے کے لئے، ایک نگراں چور لٹیروں اور ڈکیتیوں سے حفاظت اور اُن کی سُراغرسانی کے لئے رعایا کی طرف سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا تھا۔ اسی طرح ایک میاں جی، یا پنڈت بھی بچوں کو پڑھانے کے لئے مقرر ہوتا تھا۔"

یہی سبب تھا کہ ہماری تعلیم ضروریاتِ زندگی کے مطابق تھی اور ہر امیر و غریب کا بچہ اپنے قریبی مکتب میں پڑھ لیتا تھا۔ بچوں کے پڑھانے کا مشغلہ اچھے باحیثیت لوگ اختیار کر لیتے تھے۔

لیکن جب مواضعات کا نظام ٹوٹا تو اسی کے ساتھ دیہاتی مکاتب بھی ختم ہو گئے۔ اور اُس کی بجائے موجودہ تعلیمی پالیسی نے دیسی نظام تعلیم، جس کو عوام اپنی خوشی سے چلاتے تھے، توڑ کر اُس کی جگہ ایک بے جان اور غیر موزوں نظام قائم کر دیا، جو محض ضوابط سے جکڑا ہوا ہے اور پُرانے نظام کی سی سہولتیں، کثرتِ مکاتب، مفت تعلیم، کامیاب طلباء کے لئے ترقی کی راہیں، بڑے عہدے اور تنخواہیں میسر نہ ہونے کے باعث تعلیمی ترقی کی رفتار بہت ہی سست ہو گئی۔

جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جن ریاستوں یا صوبوں میں اب بھی پہلے زمانے کی طرح گھروں پر مکاتب کا رواج ہے یا ہر بچہ کو پڑھانا ثواب سمجھا جاتا ہے، وہاں خواندوں کی تعداد دوسرے صوبوں اور ریاستوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔

جہالت ہماری دوسری ترقیوں میں بھی مانع ہے

ہماری اس عام جہالت ہی کا سبب ہے کہ صنعت، تجارت، مذہب، تمدن اور معاشرت میں ہم دوسرے ممالک سے پیچھے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہندوستان ہی میں کتنی چیزوں میں تعلیم یافتہ ہونا لازمی و ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن ہم اپنی تعلیمی کمی کی وجہ سے بڑی تعداد میں نہ شرکت کر سکتے ہیں اور نہ اُس چیز کو رائج کر سکتے ہیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ صرف ایک تعلیمی پستی کی بدولت ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں کوئی ترقی نہ ہو سکے گی۔

اسی طرح ایک جاہل آدمی جو خود علم کے فوائد اور وسعتوں سے واقف نہیں کس حد تک اپنے بچہ کو تعلیم سے دلچسپی پیدا کرا سکتا ہے اور کیا اُس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ بچہ کے رجحانِ طبع اور دلچسپی کے مطابق تعلیم و ترقی پر لگا سکے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑی تعداد میں بہت کم بچے ایسے نکلتے ہیں کہ جو پڑھنا شروع کر کے تکمیل کر سکیں اور کامیاب رہیں۔ اگر پڑھے لکھے بالغوں کی تعداد بڑھ جائے تو اُن کے بچوں کی ابتدائی تعلیم کی تعداد جاہل بالغوں کے بچوں سے کئی گنی زیادہ ہو جائے گی۔ اس طرح تعلیم بالغان کی تحریک ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے بھی ممد و معاون ہو گی۔

تعلیم بالغان کی تحریک کو رائج اور ہر دلعزیز بنانے کے سلسلہ میں صوبجاتی حکومتوں نے جو کچھ حصہ لیا ہے اُس سے تو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچا۔ اعداد و شمار، رپورٹیں، دفتری کاغذات بہت مکمل ملیں گے لیکن ٹھوس اور قائم رہنے والا کام اور حقیقی طور پر تعلیم سے دلچسپی پیدا کرا دینے کا کام بہت کم اور ناقابل اطمینان ہوا ہے۔

اس لئے اس کام کو ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ جیسی انجمنوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے اور پوری توجہ، انہماک اور زیادہ سے زیادہ صرف سے یہ کام کرنا چاہئے تاکہ جاپان کی طرح پچاس ساٹھ سال بعد ہماری باہمی انجمنوں، حکومت اور عوام کی محنتوں کا یہ نتیجہ نکلے کہ ایک ہزار آدمیوں میں صرف چار آدمی ناخواندہ رہیں اور ۹۹ فی صدی بچے اسکولوں میں پہونچ جائیں۔

اُستادوں کی ٹریننگ

بالغوں کا اسکول قائم کرنے سے پہلے ضرورت اس کی ہے کہ اس کام کیلئے خاص طور پر اُستادوں کو تیار کیا جائے۔ جس طرح بچوں کی تعلیم میں اُستاد کی ذاتی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ہونا بہتر نصاب سے زیادہ ضروری اور مفید ہے، اُس سے کہیں زیادہ بالغوں

کے مدرسوں کے لئے منکسر مزاج، گھل مل جانے والے، جذبۂ خدمت رکھنے والے، اپنے سے مانوس کرنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ جنھیں یہ سکھایا جائے کہ محض قصے و پہیلی اور اس طرح کی دوسری چیزیں مدرسے کے وقت سے پہلے وہ جمع کرسکیں جو بالغ طلباء کی دلچسپی اور مصروفیت کا سبب بن سکیں۔ اُن میں سے ہر بات وہ پوری طرح یاد و ذہن نشیں کرکے مدرسہ سے اُٹھنا چاہیں اور بغیر اس کے بالغ طلباء اپنے وقت کا زیاں محسوس کریں۔ یہ بات پیدا کرا دینے کے بعد آپ خواہ زبانی تعلیم دیں یا کتابی، اُس کا خاطر خواہ نتیجہ حاصل ہوگا۔

بچوں کے اسکول کی طرح کتاب لکھا پڑھا دینے والے اُستاد، بالغوں میں نہ اپنے سے لگاؤ پیدا کرسکتے ہیں، نہ وہ باتیں اُن کے پیش نظر ہوتی ہیں جو بالغ طلباء کی روزمرہ زندگی میں شامل اور مفید ہوں، نہ وہ اُن میں شوقِ مقابلہ و اُمنگ پیدا کرا سکتے ہیں، اس لئے کہ بچہ اور بالغ کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں اور اگر طریق کار ایک ہی ہو تو بالغ طلباء کے لئے عدم توجہی کا باعث بن جاتا ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اکتالیسویں اجلاس کے موقع پر آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان مرحوم نے اپنے خطبۂ صدارت میں تعلیم بالغان پر مبسوط بحث فرمائی ہے لیکن سب سے زیادہ زور اساتذہ کی ٹریننگ پر دیا ہے۔ ممدوح تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"انگلستان کے تجربے یہاں صرف کئے جانے چاہئیں، اور خود اُن معلموں کی تعلیم پر زور دینا چاہئے جو بالغین کی تعلیم کے لئے مقرر کئے جائیں۔"

———×———

یہ کام صوبجاتی حکومتوں اور ریاستوں کے کرنے کا ہے اگر وہ خود پیش قدمی نہ کریں تو کانفرنس کو چاہئے کہ مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج، استادوں کے مدرسہ جامعہ اور دوسری ایسی درسگاہوں میں کوشش کرے کہ بالغوں کے اُستادوں کے لئے بھی کوئی درجہ کھول دیا جائے۔ تاکہ تعلیم بالغان کے کام میں وسعت و سہولت پیدا ہو سکے۔

بالغوں کے اخبارات

اس تحریک کو رائج ہونے اور تجربہ کے دوران میں ضرورت محسوس ہوئی کہ بالغوں کے مذاق اور دلچسپی کے مطابق اُن کی تعلیمی استعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے رسالے یا اخبار ہفتہ وار، پندرہ روزہ پرچے شائع کئے جائیں۔ چنانچہ اس طرح کے چند

پرچے دہلی، لاہور، بمبئی سے شائع ہوتے ہیں۔

لیکن تعلیم بالغان کا کام کچھ اس طرح کے مختلف الخیال لوگوں میں کرنا پڑتا ہے جن کے لئے ایک اصول یا ایک طریق کار ہر جگہ کارآمد و مفید ثابت نہیں ہوتا۔ اسی لئے اُن میں سے کوئی پرچہ بھی ایسا نہیں کہ سارے ہندوستان کے بالغوں کی ضروریات و دلچسپی کا احاطہ کر سکے۔ اس لئے کہ بعض مقامات پر محض کاشتکار، دیہات کے مزدور مدرسوں میں آتے ہیں۔ بعض مدرسے محض ملوں کے مزدوروں اور کاریگروں سے آباد ہیں۔ کہیں آپ مذہبی اور رواجی پابندی کی دلچسپی پائیں گے۔ کسی مدرسہ کے طلباء میں نئی ایجادات، فیشن، نیم انگریزی بولی کا شوق طاری ہوگا۔

ان اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ ایک پرچہ میں ساری صفات اور ہر طبقہ و ہر گروہ کی دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا جائے، اس لئے صرف یہ کوشش کی جا سکتی ہے کہ موجودہ شائع ہونے والے پرچوں میں جس قسم کی کمی ہو، اُس طرح کا ایک رسالہ شائع کیا جائے اور یہ کام ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن ترقی اردو ہند، انجمن حمایت اسلام، جیسی بڑی انجمنوں یا سرکاری محکموں کے کرنے کا ہے۔

اس طرح اگر ہر ایک انجمن اور صوبہ کے محکمۂ توسیع تعلیم نے انفرادی طور پر توجہ کی تو اخبار و رسائل کی تعداد بھی زیادہ ہو جائے گی اور ہر مذاق و طبقہ کی ضروریات بھی پوری ہو جائیں گی۔

اخبارات میں تعلیم بالغان کے لئے مستقل عنوان تعلیم یافتہ طبقہ کو تعلیم بالغان کی ضرورت اور اہمیت پر متوجہ کرنے کے لئے مسلسل کوشش کی ضرورت ہے جس کے لئے چند صفحات رسالہ ''ہماری زبان'' دہلی۔ ''کانفرنس گزٹ'' علی گڑھ۔ ''ہمدردانِ جامعہ'' دہلی اور اس طرح کے دوسرے پرچوں میں مخصوص ہو جانے چاہئیں۔ جن میں مفید مضامین، تصاویر، کارٹون، نظموں، صوبوں اور ریاستوں کی رپورٹوں اور اعداد و شمار کے ذریعہ اپنے ناظرین کو اس تحریک میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی دعوت و ترغیب دی جائے۔

ان ہی صفحات میں اپنے حلقوں اور مدارس شبینہ کی رپورٹیں، طریق کار اور کارکنان کیلئے مفید ہدایات اور ترغیبی مضامین برابر شائع کئے جاتے رہیں، تاکہ ہر کارکن دوسرے کارکن کے تجربات سے فائدہ حاصل کر سکے اور اُن میں اپنے کام کو دوسرے سے بہتر پیش کرنے کی خواہش و اُمنگ

پیدا ہو۔ یا ان لوگوں کے کام کی تعریف اخبار میں شائع ہو اُس سے اُنھیں اپنی محنت کا صلہ وصول ہونے سے مسرت اور حوصلہ افزائی ہو سکے۔

اس طرح "کانفرنس گزٹ" وغیرہ کے تمام ناظرین تعلیم بالغان کے متعلق کانفرنس اور انجمنوں کی کوششوں، کاوشوں اور اس راہ کی دقتوں، دشواریوں اور تدریجی ترقی سے بڑی تفصیل سے واقف رہیں گے۔ اور کانفرنس وغیرہ سے ہمدردی روز بروز بڑھتی رہے گی۔ ممکن ہے کہ کانفرنس کی اپیل اور فرمائش پر تعلیم یافتہ طبقہ میں تعلیم بالغان کی طرف خاص توجہ اور رُجحان پیدا ہو جائے۔

مقامی انجمنوں کی امداد سے مدرسے جاری ہونا چاہئیں

بالغ مبتدی چونکہ طلب علم نہیں رکھتے، اور علم کے مفاد سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر نئی چیز سے وہ گھبراتے اور ڈرتے ہیں۔ اگر آپ کسی محکمہ کی جانب سے کوئی مدرسہ قائم کر دیں تو اُس میں آدمی خوشی سے خود نہیں آتے، کارکنان پر پورا بھروسہ نہیں کرتے۔ مدرس یا کارکن کے صرف مخصوص آدمی آتے ہیں۔ لیکن اگر مقامی انجمنوں کے مقاصد میں یہ تحریک بھی شامل کرالی جائے یا علٰحدہ تعلیم بالغان کے مقصد کے ماتحت کوئی انجمن بنا کر اس میں مقامی دوسری (پہلے سے قائم شدہ) انجمنوں تعلیم یافتہ حضرات اور با اثر پارٹیوں کو شریک کر لیا جائے تو اُن شرکا کے اثر، تعارف، اعتبار اور اُن لوگوں کے سمجھانے سے جلد اور زیادہ تعداد میں لوگ مدرسہ آجاتے ہیں۔

اس طرح تعلیم بالغان کا خیال اور یہ تحریک تمام بستی میں تھوڑا بہت اثر کرتی رہتی ہے۔ کارکنان کو تعلیم یافتہ اور با اثر لوگوں سے مدد ملتی ہے اور اُن کی نگرانی کا بھی خیال رہتا ہے۔ انجمنوں کے کارکنان یا دوسرے تعلیم یافتہ حضرات میں ایسے دو ایک آدمی بھی مل جاتے ہیں جو اس تحریک سے واقعی دلچسپی رکھتے ہوں۔ اور اس سلسلہ میں اُن کی معلومات اور نگرانی مدرسوں کے لئے بڑی نعمت ہو جاتی ہے۔

اس طرح رفتہ رفتہ مدرسہ کو بستی والے جاہل اور تعلیم یافتہ دونوں اپنے لئے مفید اور ضروری چیز سمجھنے لگتے ہیں اور کچھ دنوں بعد اس چیز سے ایک لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑی بہت توجہ اس کے استحکام اور ترقی پر کرتے ہی رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے اگر یہ تحریک محض محکمہ یا مدرس کی ذمہ داری پر چلائی جائے تو مدرس اور محکمہ کا کام سمجھ کر بستی کے عام لوگوں کو مدرسہ کی طرف کوئی خاص توجہ و دلچسپی نہیں رہتی۔

پُروپگنڈا کسی بستی میں تعلیم بالغان کو رائج کرنے اور مقبول و ہر دلعزیز بنانے کے لئے مسلسل پُروپگنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس میں ناخواندہ و تعلیم یافتہ دونوں کی دلچسپی اور توجہ حاصل کرنیکا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

تعلیم یافتہ طبقہ میں پروپگنڈا کرنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ لوگ آپ کے کاموں اور ضروریات سے باخبر رہیں گے۔ اپنے مفید مشوروں اور مالی امداد سے ہمدردی کریں گے، اُن کے ذریعہ ضلع میں جو محکمے اس طرح کے کام کر رہے ہیں اُن سے تعلقات پیدا ہوں گے، اُن کے تجربات اور امداد سے کارکنان کو فائدہ پہونچے گا۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی دلچسپی کو دیکھ کر، اُن کی تاکید اور اثر سے بالغ طالب علم زیادہ آسانی سے آپکے مدرسہ میں آئیں گے۔

اسی طرح ناخواندہ لوگوں کو آپ کے پروپگنڈے سے اپنے جیسے دوسرے ناخواندہ بھائیوں کو ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر ترغیب و تحریص ہوگی۔ تعلیم ضروری و مفید نظر آنے لگے گی۔ اور پڑھنا، لکھنا سیکھنا آسان دیکھ کر خود بھی شرکت کی خواہش پیدا ہوگی۔ نیز جو لوگ سیکھ رہے ہوں گے اُنکی حوصلہ افزائی ہوگی۔ وہ زیادہ جوش کے ساتھ اپنا کام کرنے لگیں گے۔

تعلیم بالغان کے لئے مندرجہ ذیل شکلوں میں پُروپگنڈا کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ **جلوس**۔ جھنڈوں پر مختصر ترغیبی جملے ہوں، تعلیمی کتبات (مرتبہ تعلیم و ترقی جامعہ)، باتصویر پوسٹر، نعرہ، نظم خوانی کے ساتھ ہر جلسہ وغیرہ کے اعلان کے لئے جلوس نکالا جائے۔ جس میں مقامی اسکول اور مدرسوں کے اساتذہ و طلباء کو خاص طور پر شریک کیا جائے۔ ممکن ہو تو چوراہوں پر تقریروں کے ذریعہ اپنے کام کی مختصر تفصیل اور مدارس شبینہ و تعلیمی مرکز کی جائے وقوع اور اوقات وغیرہ کا اعلان کر دیا جائے۔

۲۔ **جلسے**۔ مختلف عنوانات سے مثلاً سالانہ جلسہ، تقسیم انعامات کا جلسہ، عیدین، سیرۃ النبی صلعم، سال میں بہت سے اجتماع و جلسے چھوٹے بڑے پیمانہ پر ہوتے رہنا چاہئیں۔ جن میں سامان و مختلف دلچسپیاں جمع کی جائیں، مندرجہ ذیل خاکہ سے صحیح اندازہ ہو سکے گا:۔

(۱) سالانہ جلسہ ــ جس میں مقامی قرب و جوار کی مصنوعات، خاص خاص پیداوار اور ان کے مختصر حالات، (ضروری) میجک لالٹین کا فلم، اسکاؤٹنگ کے کھیل، کبڈی، کشتی، لکڑی وغیرہ کے مقابلے،

آپ کا نصاب تعلیم، تعلیمی مرکز کا سامان، نظم خوانی، مکالمہ، ڈرامہ، طلباء بالغان کے لکھے ہوئے کتبات، کی نمائش کے علاوہ فہرست تقسیم انعامات و اسناد، اور اپنی سالانہ تدریجی ترقی کے مختلف شکلوں کے گراف، نقشے، مقامی لائبریری کی کتابوں کو پیش کیا جائے۔

نوٹ:۔ تمام تقریروں، کتبات، نظم خوانی، طلباء کے لکھے کتبات میں تعلیم بالغان سے متعلق ترغیبی عبارتیں ہونی چاہئیں۔

(۲) ششماہی جلسہ (مئی، دسمبر)۔ جس میں نتائج امتحانات، فہرست تقسیم انعامات، تعلیمی مرکز کا سامان، تدریجی ترقی کے گراف و نقشے، ترغیبی پوسٹر، تعلیمی کتبات، تقاریر، نظم خوانی، ورزشی مقابلے وغیرہ کا اہتمام کیا جائے۔

(۳) سہ ماہی جلسہ (اپریل، جولائی، ستمبر، نومبر)۔ جس میں کسی مذہبی تیوہار کی اہمیت و تفصیل پر تقاریر، نظم خوانی، سامان تعلیمی مرکز، تدریجی ترقی کے گراف، طلباء کے کتبات۔

جلسوں کا پروگرام نمائشوں کی ترتیب مقامی ضروریات کے لحاظ اور طلباء و اساتذہ کے مشورہ سے طے ہونا چاہئے۔ مصنوعات، زراعتی سامان، میجک لالٹین وغیرہ کے حصول کے لئے ضلع کے محکمہ کو مسدھار، محکمہ حفظان صحت، محکمہ زراعت، محکمہ تعلیم سے مدد لینی چاہئے۔

۳۔ **مذہبی تیوہاروں کے اجتماع۔** عیدیں، عشرہ محرم، ہندو میلوں، عرسوں اور ایسے دوسرے مقامی اجتماع کے زمانہ میں کسی اچھے مجمع کی جگہ پر پوسٹر اور ترغیبی کتبات وغیرہ لگائے جائیں۔ ایک تختہ سیاہ پر آپ کے مدرسہ و تعلیمی مرکز کا پتہ، طلباء کی تعداد، اوقات مدرسہ وغیرہ واضح طور پر لکھے ہوں۔

۴۔ **تختۂ سیاہ۔** کسی عام گزرگاہ یا بازار کے چوراہے پر ایک تختۂ سیاہ لگایا جائے۔ جس پر روزانہ چاک سے نئی عبارتیں لکھی جایا کریں۔ جس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو ترغیب، کتب خانہ بالغان کی کتابوں اور اخبارات و رسائل کے نام، نتیجہ امتحانات، فہرست تقسیم انعامات، مدرسہ کی ماہانہ رپورٹ، نقل معائنہ جات وغیرہ درج ہوتے رہیں۔

۵۔ **ماہر تعلیم کو دعوت نامہ۔** قرب و جوار کے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور ضلع کے دوسرے تعلیم بالغان کا کام کرنے والے افسروں کو کبھی کبھی اپنے مدرسے دکھانے چاہئیں۔ اور ان کی

تشریف آوری کے سلسلہ میں کوئی عام جلسہ ہونا چاہئے کہ جس میں آپ کے کام پر وہ اظہار خیال کر سکیں۔ اور بستی کے لوگوں کو آپ کے کام کی تصدیق و وقعت ہو۔ آپ کے کارکنان اور طلباء کی ہمت افزائی و دلجوئی ہو۔ اُن کے معائنوں کی نقلیں تعلیم یافتہ طبقہ میں تقسیم کیجا سکیں تو بہتر ہے۔

۶۔ **تعلیمی ہفتہ منانا۔** سال میں صرف ایک ہفتہ (لیکن مسلسل) مندرجہ ذیل کام کروائیے:۔

(۱) اپنی انجمن کے ہمدرد بنائے جائیں۔ جو مالی امداد یا کم از کم طلباء کے داخلہ میں امداد کریں۔

(۲) ممکن ہو تو ناخواندہ، نیم خواندہ اشخاص کے گھر گھر پھر کر فہرست مرتب کی جائے۔ اس کام میں مدرسوں کے مدرسین اور طلباء بھی شرکت کر سکیں گے۔

(۳) محلے وار یا قوم وار گشت، جلوس، جلسے کئے جائیں۔

پروپگنڈے کے اس مفصل پروگرام میں سے جتنا جس جگہ ہو سکے وہ بہتر ہے لیکن تحریک کو عام کرنے اور کامیاب بنانے کے لئے اس طرح کے پروگرام جلد جلد مرتب ہوتے رہنا چاہئیں اور اس پر زیادہ سے زیادہ صرف تحریک کے لئے بنیادی مفاد و استحکام کا باعث ہوگا۔

مدتِ تعلیم مقرر کرنا مفید نہیں

تعلیم بالغان کا کام بہت ہی صبر آزما قسم کا کام ہے۔ بچوں کے اسکول کی طرح اس کا نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ سال بھر میں سو طالب علم داخل ہوئے اور اُن میں سے پچھتر کامیاب ہو گئے۔ اس لئے کہ طلباء کے سرپرست کو پڑھانے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور تعلیم کا فائدہ مند ہونا اُس کے ذہن نشین ہوتا ہے۔ طالب علم کے پیشِ نظر دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کی کامیابی اور بہتر زندگی ہوتی ہے جس کے باعث وہ خود بھی توجہ اور پابندی سے کام کرتا ہے۔ ایک اسکول کا طالبِ علم صرف تعلیم کو اپنا مقصدِ زندگی سمجھتا ہے۔ سماجی، گھریلو اور کمائی کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اس لئے اُسے کام کرنے کا وقت زیادہ ملتا ہے اور تمام تر توجہ صرف پڑھنے پر ہوتی ہے۔

برعکس اس کے بالغ مبتدی بالعموم کاروباری زندگی میں مبتلا ہوتا ہے جس سے اُس کا اور اُس کے متعلقین کے پیٹ پالنے اور تن ڈھکنے کا واسطہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں وقت کا بڑا حصہ اسی تگ و دو میں صرف ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی سماجی اور گھریلو مصروفیتیں تھوڑا بہت وقت

لے لیتی ہیں۔ بمشکل دو گھنٹہ رات کو اُس کے پڑھنے کے مل جاتے ہیں۔ وہ بھی اس حالت میں کہ تمام دن کا تھکا ماندہ اور خستہ ہوتا ہے، اِس کے علاوہ نہ اُس کو اپنی عمر کے باعث اس کا یقین ہوتا ہے کہ مجھے لکھنا پڑھنا آسکتا ہے۔ نہ یہ پڑھنے لکھنے کو اپنے کاروبار کی طرح اپنے کرنے کا کام اور ضروریاتِ زندگی میں شامل سمجھتا ہے، نہ اُس کے پیشِ نظر اُس ہی جیسے اُس کے دوسرے بھائیوں کی مثالیں ہوتی ہیں جن سے تعلیم کے فوائد اور تعلیم یافتہ آدمی کی بہتری و برتری کا احساس و یقین ہو۔

ان حالات میں کسی غریب جاہل کو پڑھانے سے پہلے اُس کو متوجہ کرنے، پابند کرنے، اُسے تعلیم حاصل کرنے کا یقین و توق پیدا کرانے میں بڑی مدت صرف ہو جاتی ہے اور جب وہ پڑھنا شروع کر بھی دے تو سال میں اپنی دوسری ضروریات و مصروفیتوں میں دس دس پندرہ پندرہ دن کر کے تقریباً تین مہینے نکل جاتے ہیں۔ بالخصوص کاشتکاری پیشہ بالغ کو ہر فصل کے شروع میں زمین کی تیاری اور بوائی کے موقع پر پندرہ بیس روز، ہر فصل کی کٹائی کے موقع پر اور پیداوار گھر تک پہونچانے کے لئے پندرہ بیس روز، شادیوں کے زمانہ میں مذہبی یا موسمی تیوہاروں کے سلسلہ میں بعض زمانے ایسے ہیں کہ مسلسل پندرہ بیس روز صرف کرنا ناگزیر ہوتے ہیں۔ یہ زمانے نکالنے کے بعد دو گھنٹہ یومیہ کی تعلیم مندرجہ بالا حالات میں کہ اُسے دلچسپی و یقین نہیں، کتنی تھوڑی مدت ہے۔

اس لئے نصابِ تعلیم کی مدت معیّن ہونا اور اُستاد کے لئے سال میں کوئی تعداد مقرر کرنا، لازمی طور پر اُستاد کو فرضی کارروائی پر مجبور کرتا ہے اور پھر اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اُستاد محض ضابطہ کی خانہ پُری کا عادی ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں شوقین بالغ مبتدی بھی اُستاد کی پوری توجہ سے محروم ہو جاتے ہیں اور خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

محکمۂ تعلیم کے ضوابط کی پابندی اصل مقصد کو فنا کر دیتی ہے اس لئے سب سے پہلے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے، افسرانِ محکمہ بجائے تعداد، اوسط حاضری، مدتِ تعلیم، عمر وغیرہ پر توجہ دینے کے ان اُمور پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں کہ طریقِ تعلیم کیا ہے؟ نصاب کیا ہے؟ مبتدی کو مزید تعلیم کی ضرورت ہی یا نہیں؟ تدریجی ترقی کر رہا ہے کہ نہیں؟۔ اس طرح کی چند چیزوں پر غور کرنا چاہئے۔ اور اُستاد پر کچھ بھروسہ ہونا ضروری ہے۔ اُستاد کو اپنے کام میں آزادی ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنی محنت اور

طریق تعلیم کا نفع یا نقصان محسوس کر سکے۔ اور بجائے معائنہ کنندہ کی ہدایت کے اپنے تجربہ اور اپنی سمجھ سے نفع و نقصان کا اندازہ لگائے اور خود فیصلہ کرے کہ زیادہ موثر، پائدار اور نتیجہ خیز طریق تعلیم کیا ہے یا کیا ہونا چاہئے۔

طریق تعلیم

بالغ مبتدی کا بچوں کی طرح کتاب اور حروف تہجی سے ابتداء کرنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ اور بالغ کی طبیعت ابتداہی سے اُلجھنے لگتی ہے اور اگر ابتداء میں اُسے دلچسپ اور سہل کام نظر نہیں آتا تو جلد وہ ہمت ہار دیتا ہے اور دل چھوڑ بیٹھتا ہے، پھر لاکھ آپ سمجھائیں وہ پڑھنے لکھنے کا ارادہ نہ کرے گا۔ جو کام بچّوں کے کرنے کے لئے مخصوص ہو گیا ہے وہ کام فطری طور پر بالغ کو کرنے میں تامّل و جھجک ہوتی ہے۔

اس کے لئے اوّل بالغوں کو ایک مقررہ جگہ پر جمع ہونے کی عادت پیدا کرانا چاہئے اور وہاں اُن کی دلچسپی اور ماحول کے لحاظ سے قصّے، خبریں سُنانے، گانے، صحت و صفائی اور عام معلومات پر تقریریں اور نظمیں، چٹکلے، لطیفے، پہیلیوں کا انتظام ہونا چاہئے جس میں مبتدیوں کو زیادہ سوچنے، سمجھنے اور بولنے کا موقع دیا جائے۔ جب اس اجتماع سے اُنھیں پوری دلچسپی ہو جائے گی اور آپ اُنھیں پڑھنے لکھنے کی خواہش پیدا کر دیں گے، تب درسی قسم کا کام بہت سہل ہو جائے گا۔ تھوڑے عرصہ میں زیادہ کام کر لیں گے۔ ان درسی تعلیم شروع کرنے والوں میں بہت کم بالغ طلباء ایسے ہوں گے جو بغیر تکمیل کئے درمیان سے کام چھوڑ بھاگیں۔

اس سلسلہ میں چند ملک کے اکابرین و مدبرین کی رائیں پیش کرنا مفید ہوگا۔ سر شیخ عبدالقادر کے، سی، ایس، آئی اپنے خطبۂ صدارت (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مدراس) میں تحریر فرماتے ہیں کہ پنجاب میں جن ماہرانِ فن نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے وہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ:۔

> "بالغ عمر کے آدمیوں کے پڑھانے کے طریقے میں نوعمر لڑکوں کی تعلیم کے طریقوں کی محض نقل نہیں ہونی چاہئے بلکہ جہاں تک ہو سکے بالغوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ جن چیزوں سے اُنھیں دلچسپی ہو اور جو اُن کے کام آنے والی ہوں، اُن کے ذریعہ سے اُنھیں تعلیم دی جائے اور ہر ایک کو موقع دیا جائے کہ اپنے میلانِ طبع کے موافق اور اپنی پسند کی رفتار سے ترقی کرے۔ گویا ہر فرد کے لئے حتی الوسع ایسی تعلیم ہونی چاہئے جو اُس کے لئے موزوں ہو۔ اور اُستاد کا کام زیادہ تر شاگرد کی طبیعت میں شوق پیدا کرانا اور رہنمائی کرنا ہونا چاہئے۔"

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان مرحوم اپنے خطبۂ صدارت (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اجمیر شریف) میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"بالغین کا طریق تعلیم کسی طور سے بچوں کی روشن تربیت کا مماثل نہیں ہو سکتا۔ حروف ہجا کی تعلیم بہت بعد از وقت بات ہوگی۔ اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ محض کتاب خوانی کی بجائے وہ گہرہائے معلومات عامہ سے اپنے جیب و دامن بھرلے۔ مدارس بالغان کی وُسعت محدود نہ ہونا چاہئے اور صرف یہ مقصود نہ ہونا چاہئے کہ مزارعین میں نوشت وخواند کی مہارت پیدا ہو، اُس میں دیہی کھیل، دعوتیں، مواعظ، عام موضوع پر بے تکلف و دلچسپ مباحثے اور میجک لینٹرنوں کے تماشے بھی شامل رہنے چاہئیں۔

حلقے بنائے جائیں کسی ایک قصبہ میں مدرسہ شبینہ اور اُس کے ساتھ تعلیمی مرکز قائم کیا جائے۔ اس پر پورا صرف کیا جائے، اچھے استاد اور کارکن جمع کئے جائیں۔ اُس قصبہ کے قریب قریب کے دوسرے دیہات میں مختصر سامان اور ایک اُستاد کے ذریعہ چھوٹے پیمانہ پر تعلیمی مرکز اور مدرسہ شبینہ قائم کیا جائے۔ قصبہ کے کارکنان کی نگرانی میں یہ دیہات کے مدرسے رہیں۔ قصبہ کے مرکز سے حسب ضرورت ان دیہات میں سامان جاتا رہے۔ اس لئے کہ قصبہ کے لوگوں سے قریب کے دیہات میں برادری یا زمینداری وغیرہ کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں کے لوگوں کو سمجھانے اور دلچسپی پیدا کرانے پر قصبہ کے لوگوں سے خاص طور پر امداد مل سکتی ہے۔

قصبہ اور دیہات کے مدرسوں کے مقابلوں، امتحانات اور جلسوں میں باہمی شرکت کرتے رہیں، تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو مدد ملے۔

اس طرح کام زیادہ منظم اور اچھا ہو سکے گا۔ کچھ ہی دنوں بعد آپ کا یہ قصبہ کا حلقہ مرکزیت اور نمونہ کی حیثیت اختیار کرلے گا۔ دوسرے محکموں اور اداروں کو اسے دیکھ کر کام کرنے میں سہولت ہوگی اور اس کے نئے نئے تجربات سے فائدہ اُٹھا سکیں گے۔

یہی نہیں بلکہ قرب وجوار کے دوسرے قصبات میں بھی یہ تحریک اور طریق کار پہونچے گا اور اس طرح آپ کا کام پھیلتا اور وسیع حلقۂ آبادی کو گھیرتا جائے گا۔

لیکن صدر دفتر کو خاص طور پر اس مرکز کی ضروریات اور سہولتوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ بہت توجہ سے ہدایات، روپیہ، مکمل سامان، اچھے کارکن، مہیا کرتے رہنا چاہئے جس سے کارکنان میں

حوصلہ، جوشِ عمل، اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا رہے۔ اور اس کے بہتر و مفید نتائج مرتب ہو سکیں۔

مرکز کے لئے مقام کا انتخاب کثرتِ آبادی، تعلیم یافتہ طبقہ کی وسعت یا ضلع کے صدر مقام کے قرب کا لحاظ نہ کیا جائے، بلکہ جہاں بہتر کام کرنے والے، زیادہ پڑھنے والے، آپ کی تحریک سے دلچسپی لینے والے دستیاب ہو جائیں۔ اُس جگہ مرکز قائم ہونا چاہیئے۔

مقام کا انتخاب صدر دفتر کی سہولت اور رائے پر نہ ہونا چاہیئے بلکہ کارکنان اور مقامی ہمدردوں کی رائے پر ہونا چاہیئے۔ اس کی صحت کی جانچ اور اطمینان صدر دفتر پوری طرح کر لے۔

تعلیمی مرکز جس طرح بچوں کے اسکول کے ساتھ لائبریری، ریڈنگ روم اور انڈور گیمس ضروری سمجھے گئے ہیں اور دلچسپی و معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسی طرح بالغوں کے مدرسہ کے لئے بھی کتب خانہ، دارالمطالعہ، اور تفریحی تعلیمی مشغلوں کا اہتمام و انتظام نہایت ضروری ہے۔

اس سے دو اہم فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ ابتدا میں بالغ طلباء کو تعلیم بار نہیں ہوتی اور دلچسپ مشغلوں کے ذریعہ ان کو اجتماع اور پابندی کی غیر محسوس طریقہ پر عادت ہو سکتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جو طلباء لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں (یا وہ بالغ جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں لیکن مشق نہیں رکھتے) اُن کو تعلیم سے لگاؤ اور تعلق باقی رہے اور یہاں کی حاضری سے اُن کے لکھنے پڑھنے کی مشق، اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔ اپنی روزمرہ زندگی کی ضروریات میں جرءت، کام کا شوق اور اُمنگ بڑھتی رہے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ ورزشی مقابلے۔ ۱۔ کشتی ۲۔ کبڈی ۳۔ گتکا ۴۔ لکڑی چلانا ۵۔ ابتدائی اسکاؤٹنگ۔

۲۔ علمی مشغلے۔ ۱۔ کتب خانہ بالغان (کتب مرتبہ تعلیم و ترقی جامعہ، حالی پبلشنگ ہاؤس وغیرہ) دارالمطالعہ۔ ۳۔ نظم خوانی۔ ۴۔ خوشخطی ۵۔ زبانی حساب ۶۔ تعلیمی تاش ۷۔ تعلیمی کھیل (کتاب مرتبہ مکتبہ جامعہ)

۳۔ معلوماتِ عامہ* ۱۔ تعلیمی اخبار قلمی ۲۔ تعلیمی کتابچے (جغرافیہ، ملکوں کی آبادی، حفظانِ صحت سے متعلق

* تعلیمی اخبار: ۔ ایک سادہ کاغذ پر دوسرے مطبوعہ اخبارات سے سُرخیاں، مختصر خبریں، تصاویر، نقشوں، کارٹون وغیرہ کو کاٹ کر چپکا دیا جائے۔ اور کوئی نظم، نصیحت، مختصر مضمون قلم سے لکھدی جائے۔ پرچہ کو دلچسپ اور دیدہ زیب بنانے پر خاص توجہ کی جائے۔ ہر ہفتہ یا پندرہ روز میں پابندی سے شائع ہو۔

۳- نقشے ۴- لیڈروں، بادشاہوں، مشہور شہروں، عمارات وغیرہ کی تصویریں (ان پر مختصر تقریر)

۴- تفریحی مشغلے — ۱- میجک لینٹرن فلم ۲- گراموفون ریکارڈس

لیکن ہر ہر مقام کی سہولت، ضروریات اور دلچسپی کے پیش نظر مقامی کارکنان کو اپنے مرکز کے لئے مشاغل کا انتخاب کرنا چاہئے۔

اگر کسی مدرسے میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہو تو اُن کے لئے کبڈی، گتکا، لکڑی کے مقابلے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ اسی کے ساتھ آپ ابتدائی اسکاؤٹنگ سکھا سکتے ہیں۔ جہاں میجک لالٹین اور گراموفون کا بندوبست ہو سکتا ہو، وہاں کے لئے تعلیمی فلم اور تعلیمی ریکارڈس بھی مفید و دلچسپ ہوں گے۔ جیسا کہ اُن کے ذریعہ صحت و صفائی والے بہت کچھ کام لے رہے ہیں۔ پنجاب میں محکمۂ توسیع تعلیم نے ان مقاصد کے لئے کچھ ریکارڈ اور فلم تیار کرائے ہیں۔

لیکن یہ کام اُستادوں کا ہے کہ وہ ہر مشغلہ کے بعد کوئی کام کی بات سُنا دیں یا تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا کام کرا لیں۔

تعلیمی مرکز کے لئے صرف ایک مرتبہ سامان جمع کرنے اور ترتیب دینے پر صرف کرنا پڑیگا۔ پھر وہ سامان سالہا سال تعلیمی مرکز اور پروپگنڈے کے سلسلہ کی نمائش اور جلسوں جلوسوں کے کام آتا رہے گا۔

نصابِ تعلیم

بالغوں میں تعلیم حاصل کرنے کے ضرورت مند ہمیں تین قسم کے ملتے ہیں :-

۱- ناخواندہ — جو بالکل لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، یا تھوڑا لکھ پڑھ کر چھوڑے ہوئے زیادہ عرصہ گزر گیا اور اب مثل ناخواندہ کے ہو گئے ہیں۔

۲- نیم خواندہ — جنھیں حرُوف کی شناخت ہے لیکن مرکب الفاظ نہیں پڑھ سکتے۔

۳- خواندہ — پڑھ سکتے ہیں، لکھنے کی مشق نہیں یا لکھ سکتے ہیں، پڑھ نہیں سکتے۔ یا بمشکل کچھ نکال سکتے ہیں، لیکن لکھنے پڑھنے کی مشق نہیں ہے اور حساب وغیرہ نہ جاننے کی وجہ سے اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے سے عاری ہیں۔ مشق اور خود اعتمادی نہ ہونے کے باعث اپنے کو پڑھے لکھوں میں شامل نہیں سمجھتے اور شرماتے ہیں۔

ان سب کے جُداگانہ نصاب، طریقِ تعلیم اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں مندرجہ ذیل استعداد پیدا کرا دینی چاہئے:۔

۱۔ ناخواندہ

(۱) اپنے دستخط کرنا۔		
(۲) حروف تہجی، مرکب چھوٹے جملے	لکھنا پڑھنا	بذریعہ نقل
(۳) گنتی پچاس تک	" "	
(۴) اوزان (سکہ، وزن، پیمائش کپڑا، زمین وغیرہ حسب ضرورت طالب علم		زبانی

۲۔ نیم خواندہ

(۱) مسلسل عبارت، نظم و نثر	لکھنا پڑھنا	بذریعہ املا
(۲) خط و کتابت یا کتاب کے عبارت	"	"
(۳) قرب و جوار کے حالات	"	خود لکھنا
(۴) ڈاکخانہ، محکمہ زراعت وغیرہ کے فارم بھرنے کی مشق		

(طلباء کی روزمرہ کی ضرورت کے مطابق فارموں کا انتخاب کرنا چاہئے)

(۵) گنتی سَو تک، پہاڑے، (ڈھونچا پونا وغیرہ)	لکھنا پڑھنا	زبانی یاد کرنا
(۶) جمع تفریق کے ابتدائی سوالات کی مشق		تحریری
(۷) زبانی حساب کی مشق (اُن کے کاروباری اور روزمرہ ضرورت کے مطابق)		زبانی
(۸) انگریزی، ہندی یا عربی مہینوں کے نام، ہفتہ کے دنوں کے نام		لکھنا پڑھنا اور زبانی مشق

یہ نصاب ختم کرنے کے بعد ایک بالغ طالب کو اپنی روزمرہ کی ضروریات کے قدر لکھنا پڑھنا آجائے گا۔ اور خواندہ کہلانے کا مستحق ہو جائے گا۔ اس لئے اس نصاب کا امتحان پاس کرنے پر طالبعلم کو سند دیدینی چاہئے۔

اب اُس کا مدرسہ آنا بند ہو جائے لیکن آئندہ مشق اور مشغلہ جاری رہنے کے لئے تعلیمی مرکز میں اُس کا آنا رہنا ضروری ہے اور اُس کے لئے کوئی مدت معین نہ کی جائے۔ جب تک اُس کا جی چاہے

بطور خود کتب خانہ و دار المطالعہ سے استفادہ کرنا ہے۔

۳۔ خواندہ

جو بالغ آپ کے مدرسہ سے سند حاصل کرکے نہ آئیں بلکہ نئے براہ راست داخل ہوں بعد اُن میں آپ کے مدرسہ کے ناخواندہ یا نیم خواندہ کے نصاب کی بعض چیزوں مثلاً حساب، فارم بھرنا، خط و کتابت، مہینہ اور ہفتہ کے دنوں کے نام لکھنا پڑھنا سکھا دئے جائیں۔ اُس کے بعد اُن میں مندرجہ ذیل استعداد پیدا کر دی جائے:۔

	مشاغل
(۱) تعلیمی مرکز کی تقریروں، ورزشی، اسکاؤٹنگ اور دوسرے تفریحی مشاغل سے استفادہ،	
(۲) کتب خانہ بالغان کی کتابیں، تعلیمی کتابات، پوسٹر، اخبار و رسائل، تعلیمی اخبار	پڑھنا
(۳) خطوط نویسی، اپنے گرد و نواح کے حالات، استاد کی ہدایت کے مطابق قصے کہانی کے طور پر لکھ کر دکھانا۔	لکھنا
(۴) اپنا (فرضی) کاروباری حساب لکھ کر دکھانا۔	حساب

مندرجہ بالا نصاب کی استعداد پیدا کرانے کے لئے تعلیم و ترقی جامعہ، صوبجاتی محکمہ توسیع تعلیم، اور ریاستوں کی مرتبہ کتابوں میں سے انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

لیکن صرف ایک سٹ کتابوں کا انتخاب کرنا کافی نہ ہوگا، اس لئے کہ دیہاتی اور شہری حلقہ ہندو مسلمان، کاشتکار، مزدور اور اہل حرفہ ان سب کے مذاق، ضروریات، اور گرد و پیش کے حالات میں بڑا اختلاف ہو جاتا ہے۔ اگر آپ شہر کے رہنے والوں، ملوں، ریلوں، سرکاری دوسرے دفاتر کے کام کرنے والوں کو دیہاتی صفائی، پرورش جانور، زراعت کے متعلق پڑھانے یا بتانے لگیں تو انھیں نہ کوئی دلچسپی ہوگی اور نہ اُن کے روزمرہ کام میں مدد ملے گی۔ اسلئے کتابوں کے انتخاب میں دیہاتی اور شہری آبادی کے مشاغل کا لحاظ رکھتے ہوئے مروجہ کتابوں میں سے چند سیٹ انتخاب اور رائج کرنے چاہئیں۔

امتحانات، انعامات اور سندیں

طلباء و اساتذہ کے کام کے اندازہ کے لئے جلد از جلد امتحان ہونا رہنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اُس سے طلباء میں تحریص، خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اساتذہ کو اپنی کامیابی کی مسرت کے علاوہ زیادہ مستعدی اور دلچسپی کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

طلباء کو انعامات تقسیم کرنا بہت مفید و ضروری ثابت ہوا ہے۔ انعامات میں اس طرح کی چیزیں جن سے گھروں میں تعلیمی پرچہ اور شوق ہو سکے یا وہ چیزیں انعام میں دی جائیں جن سے اُس شخص کے کاروبار کا تعلق ہو اور انعامی چیزوں سے اُس کا کام بہتر و سہل ہو سکے۔

بالغ طلباء کو اپنا نصاب ختم کر لینے کے بعد سند بھی ملنی چاہئے تاکہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں بھی پڑھا لکھا محسوس کر سکے اور اُس کے دوسرے ناخواندہ بھائیوں میں امتیاز حاصل ہو سکے۔ نیز وہ کسی ایسے کام یا ملازمت کی جرات کر سکے جس میں خواندہ ہونا ضروری ہو۔ اِس سے اُس کے گھر کا ماحول بدلے گا۔ اُس کے گھر کے آبائی اور قدیم پیشہ میں بہتر تبدیلی ہو گی۔ جس سے اُس کے گھر کے تمام افراد پر اچھا اثر پڑے گا۔

منظر الرحمٰن

حضرت محل

اودھ کی جاں باز ملکہ

(از سیدہ انیس فاطمہ۔ بیگم سید الطاف علی بریلوی)

تاریخی پس منظر ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے سازش کرنے کے بعد غیور اور بہادر روہیلوں کو مٹا کر اطمینان کا سانس لیا۔ اور بزعم خود یہ خیال کیا کہ اب سلطنت اودھ تمام خطروں سے محفوظ ہو کر مستحکم بنیادوں پر کھڑی ہو گئی۔ لیکن شجاع الدولہ کو کیا خبر تھی کہ روہیلوں کی بربادی خود اودھ کی تباہی کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ اور کمپنی بہادر کی جس ڈپلومیسی کا شکار آج روہیلے ہوئے کل کو اس سے ان کو بھی دوچار ہونا پڑے گا۔

آصف الدولہ روہیلوں کے بعد میدان صاف تھا۔ ایسے حریف کے مدِّمقابل ہونے کی جرات کسے ہوتی۔ کامیابی اور کامرانی نے جس کے قدم چومے تھے اور عروج واقبال نے جس کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی نیپالیوں کے خون اور ہندوستانی خزانوں نے اُس وقت کمپنی بہادر کو دوربست ملک پر قبضہ دلانے میں بڑی مدد کی۔ روہیلکھنڈ کے بعد پنجاب اور اب اودھ کی باری تھی۔ شجاع الدولہ کے جانشینوں نے کمپنی کی بزرگی و برتری، اپنی ہیچ مدانی اور ہیچ میرزی کو برابر ملحوظ رکھا۔ لیکن ان کی مہربان برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کی اس ناگزیر ضرورت کو کیا کیجئے جس نے انھیں اودھ کے لے لینے پر مجبور کیا۔ گورنر جنرل کا سکریٹری میک ناٹک رقم طراز ہے کہ:۔

"اودھ ہندوستانی حکومت کی مشین کا ایسا پُرزہ ہے جس کی بدولت ہم بہت سی آفات سے محفوظ رہتے ہیں۔"[۱]

شجاع الدولہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی کمپنی بہادر جملہ دوستانہ معاہدوں کو فراموش کر بیٹھی۔ اور اب اودھ کی مشین کا ہر صیقل شدہ پُرزہ بھی خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ شرارتوں کے گرانے کے لئے اب ایک نئے

---

[۱] "واجد علی شاہ" صفحہ ۵۷۔ مصنفہ تقی الدین احمد صاحب ایم۔ اے۔

آشیاں کی ضرورت تھی۔ آصف الدولہ کی تخت نشینی سے پہلے حسب ذیل مطالبات کئے گئے جن کو منظور کر لینے کے بعد انھوں نے مسندِ آبائی پر قدم رکھا۔

(۱) تمام پچھلے قرضے وصول کئے جائیں گے۔

(۲) انگریزی فوج متعینہ اودھ کے اخراجات میں مبلغ پچاس ہزار کا اضافہ کیا جائے گا۔

(۳) راجہ چیت سنگھ کی ریاست بنارس بجائے تمہارے ہماری سرپرستی میں رہے گی۔ اور راجہ سے بائیس لاکھ روپیہ بجائے تمہارے ہم وصول کریں گے۔[۵۲]

آصف الدولہ کا دور شروع ہوتے ہی کمپنی کے آہنی پنجوں کی گرفت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اور سخت گیری کا یہ دور جانگداز اُس وقت تک قائم رہا جب تک کہ حکومتِ اودھ کے جسمِ ناتواں سے زندگی کا آخری قطرۂ خون تک پانی پانی ہوکر نہ بہہ گیا۔ ان ہی کے عہد سے شاہانِ اودھ کے حدود فرائض متعین کرنے کا استحقاق کمپنی کو حاصل ہوا۔

چونکہ طبیعت میں جنگ جویانہ اسپرٹ موجود نہ تھی، اِس لئے خاموش ہو رہے۔

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"

ان کا اُصولِ حکمرانی بنا۔ میدانِ رزم و جنگ کی شہسواری کمپنی بہادر کے حصّہ میں آئی عشقیہ شاعری کو عُروج ہوا۔ محل سراؤں کے انتظام و انصرام، عمارات کی تعمیر میں غیر معمولی انہماک مذہبی رسوم کی ادائگی میں حد درجہ شغف، یہ ہے اُن کے پورے دَورِ حکومت کا لُبِّ لباب۔ اس کے ساتھ ہی سیر چشمی۔ فیاضی۔ رعایا پروری اُن کے کیریکٹر کی اہم خصوصیات ہیں۔ لیکن جہانداری و جہاں بانی کے لئے اس سے زیادہ "وسعتِ بیان" کی ضرورت تھی۔ رزم کے اذکار خرمنِ ہوش پر بجلیاں گرانے کا سبب بننے لگے۔ جنگ جیسی مُہیب چیز کا بے موقع یا باموقع صحبتِ شاہی میں ذکر کیا جانا بے ادبی اور مزاج ناشناسی ـــــ پر محمول کیا جانے لگا۔

اُولوالعزم اقوام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے کہ دُنیا نے ہیرے جواہر کے ساتھ نذرِ عقیدت عزّت واحترام کا تاج اُن ہی جانبازوں کے زیبِ سر کیا، جو بزم کے ساتھ میدانِ رزم کے بھی شہسوار تھے۔ امن وامان کے دَورِ فراغت و آسودگی میں علمی صحبتیں جمتیں، نکتہ ورانِ سخن کا اجتماع ہوتا۔ لیکن

---

[۵۲] (ہیسٹنگز اینڈ دی روہیلہ وار) بحوالہ حیاتِ حافظ رحمت خاں صفحہ ۳۰۳ ـ (مولفہ سید الطاف علی بریلوی)

جس وقت ملک و ملت کی آبرو کا سوال آتا، قلم کی جگہ شمشیر و سناں ہاتھ میں لے لی جاتی، علمی مباحثوں کے بجائے میدانِ جنگ کی خوں آشامیوں اور شعلہ سامانیوں کے تذکرے چھڑ جاتے۔

وزیر علی خاں

آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۷ء میں ہوا۔ ان کے بعد ان کے بڑے لڑکے وزیر علی خاں تخت پر بیٹھے۔ لیکن کمپنی کے نقطۂ نظر سے سلطنتِ اودھ کو سنبھالنے کے لئے جس "سیاسی شعور" کی ضرورت تھی، وہ اِن میں نام کو نہ تھا۔ آخر بھی سپاہی اوّل بھی سپاہی، پھر ایک سپاہی کو مصلحت بینی و دُور اندیشی سے کیا واسطہ اور تعلق ؎

نہ پیروئ قیس نہ فرہاد کریں گے ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

نتیجہ ظاہر تھا کمپنی اور وزیر علی خاں کے درمیان زبردست چپقلش شروع ہو گئی۔

ایک معمولی نجی مسئلہ پر نواب ناظر تحسین علی خاں سے کچھ ناراض ہوئے، اور اُن کو دربار میں طلب کیا۔ لیکن یہ ان (وزیر علی خاں) کے پاس آنے کی بجائے بوساطت خان علامہ رزیڈنسی میں پہونچ گئے۔ رزیڈنٹ چیری صاحب تو اُن سے خار ہی کھائے بیٹھا تھا۔ اِس چھوٹے سے معاملہ کو رائی کا پہاڑ بنا کر کلکتہ لکھدیا۔ سرجان شور جو اس وقت گورنر جنرل تھے مع افواج لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ وزیر علی خاں ہنوز پسِ پردہ کارروائی سے بے خبر صاف دلی کے ساتھ جاندہ اور پرتاب گڑھ تک مع خدم و حشم سرجان شور کے استقبال کو گئے، کئی بار وزیر علی خاں اور سرجان شور کی ملاقات بھی ہوئی اور بظاہر کسی ناگوار صورتِ حال کے رونما ہونے کا قطعاً اندیشہ نہ تھا۔ لیکن یہ چیز نواب ناظر، رزیڈنٹ اور دوسرے بدخواہوں کو گورنر جنرل کے سامنے سُرخ روئی حاصل کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ اِس لئے ان لوگوں کا آپس میں مشورہ ہوا۔ ایک محضر نامہ تیار ہوا جس میں وزیر علیخاں کو آصف الدولہ کا فرزند ہونے سے انکار کیا گیا تھا۔

گورنر جنرل نے ایک جلسۂ عام میں تمام محلات کے علاوہ عمائدِ شہر کے بھی دستخط لئے۔ نتیجہ ظاہر تھا تخت سے علٰحدگی کا فرمان صادر کر دیا گیا۔ اور پھر اس پر بھی بس نہیں کیا بلکہ جلا وطنی کی سزا بھی تجویز ہوئی۔ بنارس میں دُرگا کنڈ میں نظر بند ہوئے۔

"اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں"

عافیت کوشی اور عزلت گزینی سے بے چین طبیعت کس طرح میل کھاتی۔ حکومت جانیکا داغ دل سے

کسی طرح مٹائے نہ مٹتا تھا اپنی بے گناہی اور دوستوں کی بے وفائی دل کا خون کئے دیتی تھی ؎

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ محشر کوئی پرسشِ دادخواہاں نہیں

بنارس کے زمانۂ اسیری میں راجہ بُندیلکھنڈ گُسائیں ہمت بہادر کو اپنی معاونت پر آمادہ کرکے ہنگامہ کی تاریخ مقرر کی۔ اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ لیکن اس اقدام کی پاداش میں رزیڈنٹ اور گورنر جنرل نے بنارس کے بجائے کلکتہ میں رہنا تجویز کیا۔ وزیر علی خاں رزیڈنسی میں بلوائے گئے جہاں رزیڈنٹ چیری صاحب نے مذکورہ تجویز کے ساتھ ہی کچھ الفاظ ناشائستہ بھی ان کی شان میں استعمال کئے۔ جس پر اُنھوں نے غضب ناک ہوکر ایسا تلوار کا ہاتھ مارا کہ چیری کا کام تمام ہوگیا ؎

آخر تو کوئی لائیں گے آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

رزیڈنٹ کے اس سنسنی خیز قتل کا کئی دن تک ہنگامہ گرم رہا۔ کلکتہ سے فوج کثیر بھی مع توپ خانہ کے آپہونچی۔ وزیر علی خاں دو ایک لڑائیوں میں قلیل جاں نثاروں کے ساتھ لڑے۔ لیکن پاؤں اُکھڑ گئے اور فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔

ایک عرصہ کی صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کے بعد منشی باقرؔ اور راجہ جے نگر کی سازش سے گرفتار ہوکر کلکتہ میں قید ہوئے۔ ایک بنگلہ میں رہتے تھے کسی کو اِن کے پاس جانیکی اجازت نہ تھی۔ شاعر بھی تھے۔ چنانچہ قیدِ فرنگ میں اُنھوں نے اپنی حالت کا حسب ذیل دردانگیز مرقع کھینچا[۱] دُکھے دل کی فریاد اور اُس کی تاثیر ملاحظہ ہو :؎

جوں سبزہ رُندتے رُندتے ہی پاؤں کے تلے ہم اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سایہ کے تلے ہم
زاندان مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں رہتے ہیں وزیریؔ ہی سے دن رات ملے ہم

ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے
نرگس کے نہالوں میں تھے آصفؔ[۱] کے پلے ہم[۲]

---

۵۱ محضرنامہ کی طرف اشارہ ہے۔
۵۲ "کمپنی کی حکومت" صفحہ ۱۵۱ مصنفہ باری صاحب۔

گوروں کا ڈبل پہرہ ہر وقت رہتا تھا۔ ۱۸۱۷ء میں جبکہ صرف ۳۶ سال کی عمر تھی قیدِ فرنگ اور قیدِ حیات دونوں سے نجات مل گئی ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

کاسی باغ میں ٹیپو سلطان کے بیٹے کے مرقد کے پاس دفن ہوئے[۵۱]۔ مقبرہ ابھی تک مقفل رہتا ہے۔ شاید اس خیال سے! ؎

کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے
اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود

سعادت علی خاں

وزیر علی خاں کے عبرت انگیز انجام نے ان کے جانشینوں کے دلوں پر کمپنی کی ہیبت ہمیشہ کے لئے بٹھا دی۔ ان کے بعد نواب سعادت علی خاں نے اودھ کا کانٹوں بھرا تاج زیبِ سر کیا۔ انھوں نے پُر امن طریقہ پر انگریزی اقتدار کا خاتمہ کرنا چاہا اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے وہ مطالبات جن کی وجہ سے سیاسی اختیارات سُرعت کے ساتھ سلب کئے جا رہے تھے اُن کو پورا کر دینے کا تہیہ اور انتظام کیا۔ ایک مُعاہدہ کمپنی اور سعادت علی خاں کے درمیان ہوا۔ جس کی رُو سے آدھے سے زیادہ ملک پر کمپنی کا در و بست تسلط ہو گیا۔ سعادت علی خاں نے مسلسل چار سال تک اس کی تکمیل میں مزاحمت کر کے کافی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ ایک دن کرنیل اسکاٹ رزیڈنٹ نے سعادت علی خاں کے وکیل مولوی سبحان کو بلایا اور کرِچ نکال کر ان کے سامنے رکھ دی کہ اس کا جواب لاؤ۔ مولوی صاحب نے فرمایا اس کا جواب معرکہ بکسر میں ختم ہو گیا۔ اب کس کی مجال جوابِ ثانی کی ہے[۵۲]۔

سعادت علی خاں کو قدرت نے غیر معمولی دل و دماغ عطا کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ان کو اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کے جوہر دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔ جزرسی کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ آصف الدولہ کی فراخ دلی اور سخاوت دیکھے ہوئے تھے وہ اِن کو کنجوس کہتے تھے۔

سی، ایم ایلیٹ ان کے متعلق لکھتا ہے :۔

"سعادت علی خاں امورِ سلطنت نہایت عمدہ طریقہ سے انجام دیتے تھے اور ان کا جتنا وقت رزیڈنٹ

---

[۵۱] قیصر التواریخ صفحہ ۲۹۴، جلد اوّل۔ [۵۲] قیصر التواریخ صفحہ ۱۰۵۔ ۱۷۶۴ء کے معرکہ بکسر میں شاہ عالم شجاع الدولہ اور میر قاسم کو شکست ہوئی اور اس کے بعد بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو حاصل ہوئی۔

کے سمجھانے بجھانے سے بچتا اُسی کو وہ حساب کی جانچ۔ صوبہ داروں کی کام کی نگرانی اور احکام کے اجرا میں صرف کرتے۔"[۵۱]

اس انتظام اور جزرسی سے اُنھوں نے دو کروڑ کی رقم جمع کی تاکہ اس سے اپنے بزرگوں کا کھویا ہوا ملک کمپنی سے واگزاشت کرائیں۔ لیکن قبل اس کے کہ مقصد کی تکمیل ہوتی ان کا انتقال ہوگیا۔

غازی الدین حیدر

سعادت علی خاں کے بعد ۱۸۱۴ء میں غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے۔ وہی سعادت علی خاں کی جمع کی ہوئی رقم تاج شاہی کے معاوضہ میں کمپنی بہادر کو نذر کرنی پڑی۔ نیز شہنشاہِ دہلی کو نیچا دکھانے کی غرض سے بھی بادشاہ کا خطاب کمپنی بہادر کی ایمائے اختیار کرنا پڑا۔

غازی الدین حیدر کے تخت نشین ہوتے ہی کمپنی کے ہر گماشتے کے گھر میں روپیہ کی بارش ہونے لگی۔ سعادت علی خاں کی کفایت شعاری نے غازی الدین حیدر کو "حاتم دوراں" کے خطاب سے مخاطب کرایا۔ ان کے مرنجان مرنج طرزِ عمل نے بھی کمپنی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور خوب نبھتی رہی۔ ان کے بعد

نصیر الدین حیدر

نصیر الدین حیدر تختِ شاہی پر متمکن ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے دس سالہ عہدِ حکومت کی منازلِ راہ کو اپنے والد کے نقشِ وفا پر طے کیا اور ۱۸۲۷ء میں عزت آبرو کے ساتھ اس کٹھن آزمائش سے گزر گئے۔

کمپنی کا اقتدار ان کے عہد میں سیلاب کی طرح اُمڈا حتیٰ کہ بادشاہ نے انگریز مصاحبوں کی صحبت اور انگریزی لباس و معاشرت بھی اختیار کر لی۔ مصنف شبابِ لکھنؤ رقم طراز ہے کہ :۔

"میری تقریب ملاقات بڑے صاحب[۵۲] سے ہوئی۔ یہ لندن میں ایک معمولی حیثیت کے آدمی تھے لیکن یہاں ان کے اختیارات ایک بادشاہ اور اس کی پچاس لاکھ رعایا پر ایسے لامحدود تھے جو یورپ میں کسی بادشاہ کو حاصل نہیں ہو سکتے۔"[۵۳]

محمد علی شاہ

چونکہ یہ لاولد تھے اس لئے نواب سعادت علی خاں کے بڑے لڑکے نصیر الدولہ محمد علی شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھے۔ ان کی عمر کافی تھی۔ نیز صحتِ جسمانی جواب دے چکی تھی۔ پانچ

---

۵۱ "واجد علی شاہ" مصنفہ تقی الدین ایم۔اے۔ صفحہ ۹۰ ۔ ۵۲ "رزیڈنٹ"

۵۳ شبابِ لکھنؤ صفحہ ۱ مصنفہ یکے از انگریز مصاحبین نصیر الدین حیدر ۱۸۳۵ء مترجمہ محمد زاہد علی بی۔اے ۱۹۱۳ء ۔

سال کے قلیل عرصہ میں حکومت کے بارِ گراں سے فراغت حاصل کرلی حسبِ سابق ان کے اور کمپنی کے درمیان ایک اور نیا عہد نامہ ہوا۔ جس کی رُو سے افواج اور محاصل پر وبست کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ ان کے بعد

امجد علیشاہ ان کے بڑے لڑکے امجد علی شاہ ۱۸۴۲ء میں بادشاہ ہوئے۔ اور انھوں نے ۱۸۴۷ء میں انتقال فرمایا۔

واجد علی شاہ ان کے بعد واجد علی شاہ ۱۸۴۷ء میں مسندِ آبائی پر رونق افروز ہوئے۔ اجداد کے بنائے ہوئے ڈگر سے ہٹ کر کچھ آزادانہ روش اختیار کرنی چاہی۔ ملکی اصلاح پر توجہ مبذول کی نئے دفاتر کھولے۔ افواج کی تنظیم کا کام کیا۔ ایک اخبار بنام "امیر" منشی مظفر علی کی ادارت میں جاری کرایا۔ اس پرچہ میں سلطنت کے متعلق سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔ بادشاہ اخبار سنتے تھے جب جلوس شاہی نکلتا تو دو ترک سوار صندوقچہ لے کر ساتھ چلتے۔ راستہ میں جو مستغیث عرضی دیتا صندوقچے میں داخل کردی جاتی۔ اس کا نام "مشغلۂ نوشیروانی" رکھا تھا۔ ملکی حالات و واقعات سے زیادہ سے زیادہ باخبر ہونے کا انتظام کیا۔ اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔

انڈین میوزیم میں محفوظ سکوں کی فہرست میں ان کے سکہ کی بیت درج ہے۔[۵۱]

پیادوں اور سواروں کی پلٹنیں مرتب کیں۔ اور ان کے عجیب و غریب نام رکھے۔ ترچھا۔ اختری۔ نادری۔ ان کی قواعد کے لئے فارسی زبان میں اصطلاحیں مقرر کیں۔ بہ نفس نفیس پریڈ کے میدان میں جا کر فوج کی قواعد۔ نیزہ بازی۔ شمشیر زنی اور تفنگ اندازی کی مشق ملاحظہ فرماتے اور تین۔ تین۔ چار۔ چار ساعت تک گھوڑے پر سوار ہو کر دھوپ میں کھڑے رہتے۔ اکثر خوش ہو کر انعامات تقسیم کرتے۔[۵۲]

ایک جدید محکمہ قائم کیا جس میں ترحم کے مقدمات طے ہوتے تھے۔ لیکن چشم و دل کی یہ بینائی اور ہوشمندی کمپنی کی فاتحانہ سرگرمیوں میں سدِ راہ ہونے لگی۔ اس لئے؎

سرِ چشمہ باید گرفتن بہ بیل ۔۔۔ چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

کے ناصحانہ مقولے پر عمل کرتے ہوئے رزیڈنٹ نے وزیر اعظم علی نقی خاں کے ذریعہ فہمائش کی کہ اصلاح حال

۵۱؎ "تاریخ اودھ" مصنفہ مولوی نجم الغنی خاں رامپوری جلد پنجم صفحہ ۱۸۰ ۔

۵۲؎ " " " " " " صفحہ ۱۲۵ ۔

ناگزیر ہے۔ نہ ائش تھی۔ حکم تھا۔ عرضداشت تو نہ تھی۔ جس سے اغماض برتا جاتا۔ ایک ہی اشارے نے بساطِ سیاست کو اُلٹ دیا ؎

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی   اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی

طبیعت میں اختراع و جدّت کا جو مادہ قدرت نے ودیعت کیا تھا اُس نے اب عیش و عشرت کے دور میں نئے نئے شگوفے کھلائے۔ اور آگے چل کر رنگینیِ ہستی نے پختہ ہو کر "پیا جانِ عالم" کا خطاب دلوایا۔ نغمۂ و طرب کے ساز چھڑے، پری وشنوں کا ہجوم بے پناہ۔ ان کی کرشمہ سازیوں اور ناز آفرینیوں میں ایسے محو ہوئے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ؎

الفراق اے صبر و تسکیں   الوداع اے عقل و دیں

ان کی مشہور تصانیف جن کو "آپ بیتی" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اسی دورِ خود فراموشی کی یادگار ہیں۔ حُزنِ اختر۔ مصائب اہلِ بیت۔ دفترِ پریشاں۔ رسالۂ ایمان۔ سینکڑوں سلام۔ مثنویاں وغیرہ وغیرہ۔ بادشاہِ اودھ اب محض اقلیمِ سخن کا حکمراں رہ گیا تھا۔

ہنومان گڑھی کا واقعہ واجد علی شاہ کے عہد کا ایک اہم سیاسی واقعہ ہنومان گڑھی اور اُس کے سلسلے میں مولوی شاہ غلام حسین صاحب۔ مولوی محمد صالح صاحب اور مولوی امیر علی شاہ صاحب کی شہادت ہے۔ قانونِ فطرت ہے کہ تخریب کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعمیری کام بھی ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ قدرت کے اسی قانون کے تحت سید احمد صاحب شہید رائے بریلوی کی اسلامی تحریک غازی الدین حیدر کے زمانہ میں رونما ہوئی تھی جو اگرچہ "بالاکوٹ" میں مجاہدین کی شہادتِ عظمیٰ کے بعد بظاہر ختم ہو گئی۔ لیکن سید صاحب کے بعض خلفائے اس کو پھر بھی جاری رکھا۔ وہ تلوار جو ٹیپو سلطان۔ میر قاسم۔ سراج الدولہ اور حافظ رحمت خاں کے ہاتھ سے گر گئی تھی، اُس کو باوجود تہی دامانی و درماندگی، علماء و مجاہدینِ اسلام نے اُٹھا لیا۔ اور اس وقت تک اُسے نیام میں نہیں کیا جب تک کہ ع

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید!

کے ہر دو مقاصدِ عالیہ میں سے کم از کم ایک حاصل نہ ہو گیا۔ سید صاحب کے بعد ان کے جانشین پوری نصف صدی تک درباریوں کی مسموم زہریلی فضاؤں سے عوام کو بچانے اور اُن کے سپاہیانہ جذبہ کو قائم رکھنے کے لئے حتی الامکان سرگرمِ عمل رہے۔ جہاں اور جس محاذ پر کفر اسلام پر اور حق باطل کے سامنے

سربسجود ہوتا نظر آیا۔ علماء و مجاہدین کی یہی جماعت اپنی خانقاہوں اور گوشوں سے نکلی۔ عوام کو ساتھ لیکر سینہ سپر ہوئی۔ اور اسلام اور مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔

تھوڑی نہ بہت آج تک مساجد جو بابر، عالمگیر اور اُن کے اولوالعزم سپہ سالاروں نے وقتاً فوقتاً تعمیر کی تھیں۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں برادرانِ وطن نے کمال دیدہ دلیری سے مسلمانوں کو نہ صرف اُن میں اذان اور نماز سے روک دیا بلکہ جب موقع ملا منہدم کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اور یہ سب کچھ کمپنی بہادر کی تھپکیوں اور اشاروں سے کیا جاتا رہا۔ پہلے مولوی شاہ غلام حسین صاحب اور مولوی محمد صالح صاحب نے علمِ جہاد بلند کرکے "ہنومان گڑھی" میں بیراگیوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔ لیکن زندہ لاشوں کے اس شہرِ خموشاں میں جس کا نام "دربارِ شاہی" تھا کوئی ان مظلوم مجاہدینِ اسلام کی شہادت پر دو آنسو بہانے والا نہیں تھا۔

حکومت کی بے چارگی و بے بسی اور ذی اثر طبقہ کا حق پژوہی سے احتراز و اغماض نے عوام اور علماء کے طبقہ میں ایک آگ سی لگادی۔ مولوی امیر علی صاحب نے "امیٹھی" جا کر محمدی جھنڈا اُٹھایا۔ واجد علی شاہ نے امیر علی صاحبؒ کے خلاف کفر کا فتویٰ شائع کرایا جس پر عوام کو دامِ تزویر میں پھنسانے کے لئے بعض مشہور علماءِ وقت کے دستخط کرائے تھے جن میں مولوی فضل حق خیر آبادی، مولوی عبدالرزاق فرنگی محلی۔ اور مولوی سعد اللہ قابلِ ذکر ہیں۔ مگر خدا کی دین تو دیکھئے آگے چل کر اوّل الذکر نے جہاد فی سبیل اللہ میں جان دے کر بقاءِ دوام حاصل کی۔ اور نام نیک پایا۔

امیر علی شاہ کا انجام وہی ہوا جو اس سے پہلے اِن کی پیش رو جماعت کا ہوا تھا۔ شہادت کے وقت حسب ذیل شعر مولوی صاحبؒ کی زبانِ مبارک پر جاری تھا ؎

بذکرِ حق سراپا گوش دارم ۔۔۔ سرمیداں کفن بردوش دارم

اِن کی شہادت کے صرف تین ماہ بعد انتزاعِ سلطنت کا واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص نے دیوانِ حافظ سے فال نکالی، تو یہ شعر نکلا ؎

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را ۔۔۔ چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

انتزاعِ سلطنت

۱۸۵۶ء میں جبکہ واجد علی شاہ کو حکومت کرتے ہوئے صرف نو سال ہوئے تھے۔ جنرل اوٹرم نے جو تھوڑے سے اختیارات باقی تھے وہ بھی سلب کرلئے۔ پورے

اَودھ پر انگریزی قبضہ کرکے بارہ لاکھ پنشن اور پانچ میل کے گرد میں لکھنؤ کی جاگیر دیے جانے کا حکم سُنا دیا گیا۔

اپیل کرنے کی غرض سے ناچار کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ لیکن جن تغافل شعاریوں میں پھنس کر سلطنت کھوئی تھی۔ کمپنی کے چابک دست ہاتھوں نے وہی سنہرا جال "مٹیا برج" میں بھی بچھایا۔ لکھنؤ کی تمام دلچسپیاں وہاں جمع کر دی گئیں۔ پھر اُس مقصد کی طرف کس طرح توجہ مبذول ہوتی جس کے لئے غربتِ وطن کی صعوبتیں اور دشت نوردی کی کلفتیں برداشت کی گئی تھیں۔

اپنی والدہ حضرت عالیہ کو طوافِ "لندن" کے لئے روانہ کرکے "داستانِ این و آں" سے مخلصی حاصل کرنے ہی میں اپنی عافیت کا پہلو نظر آیا۔

بوجھل زنجیروں کی جکڑبندیوں کے باوجود شب و روز رنگ رلیاں منائی جاتیں۔ انتہا یہ کہ اسی قیدِ فرنگ کی حالت میں اپنا ایک جشنِ شاہی بھی رچایا۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر رقم طراز ہیں:۔

"حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتہ میں ایک دوسرا لکھنؤ آباد ہو گیا ہے اور اس کی تخب صحبت "مٹیا برج" میں چلی گئی تھی۔ مٹیا برج لکھنؤ تھا۔"[۵]

گویا رند بھی وہی، ساقی بھی وہی اور رنگِ محفل بھی وہی تھا۔ لیکن مئے دو آتشہ میں وہ تیزی باقی نہ رہی تھی جو دلوں کو گرما کر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتی۔ سلطنت کے ہنگاموں سے دور عافیت کی پُرسکون زندگی بسر ہوتی تھی۔ جہاں تک لفاظی کا تعلق تھا شہنشاہیت کا لطف اُٹھانے میں بھی بخل روا نہ تھا۔ رستمِ زماں، سکندرِ دوراں، شاہِ زمین و زماں کے خطابوں سے تشنگیٔ اقتدار کی سیرابی کر لی جاتی ــــــ حکومت جا چکی تھی مگر اس کا خمار ہنوز باقی تھا۔

حضرت محل

وزیر علی خاں کے بعد اَودھ کے تخت پر کوئی پھر اُن جیسی "جی دار" شخصیت متمکن نہیں ہوئی۔

اس حال کو پہونچے ترے قصہ سے کہ اب ہم!!

راضی ہیں گو اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا!!!

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کے جانشین بجز سعادت علی خاں کے امورِ سیاستِ ملکی سے جس قدر بے پروا، کمزور اور پست ہمت تھے اُسی قدر بیگمات اودھ بہادر، دلیر اور اولوالعزم تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی

۵ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۹۱۔

سرگرمیاں محلات سے گزر کر اُمورِ سلطنت میں اثر انداز تھیں۔

انتزاعِ سلطنت کے بعد جب حکومت کا نقشہ حرفِ غلط کی طرح مٹتا نظر آیا تو اس کو بچانے کے لئے شاہی خاندان کی دو بیگمات نے دُنیا کے سامنے اپنی خدمات پیش کیں۔ ایک حضرت عالیہ والدہ واجد علی شاہ۔ دوسری حضرت محل۔ ایک نے قانونی حدود کے اندر رہ کر سلطنت کی واگزاشت کے لئے جدو جہد کی۔ دوسری نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی آگ میں نہ صرف حصّہ لے کر بلکہ اس کی قیادت و رہنمائی کی آگ ہاتھ میں لے کر سلطنتِ اودھ کو بچانے کی سعی و کوشش کی۔ آج حضرت محل کی جدو جہد اگر بارآور ہو جاتی تو ان کا نام بھی رضیہ سلطان، چاند بی بی، اور نور جہاں جیسی فخر روزگار خواتین کی صف میں نظر آتا۔ دستورِ دُنیا ہے کہ وہی اس سے خراجِ تحسین وصول کیا کرتے ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن شومئی قسمت سے جو لوگ کہ منزلِ راہ کا شکار ہو گئے۔ اور گوہرِ مقصود ہاتھ نہ لگا، اُنھیں کامیاب ہیرو کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ واجد علی شاہ کی ولیعہدی کے زمانہ میں جبکہ ان کی عیش کوشی شباب پر تھی۔ ایک کم سن لڑکی اُمراؤ جان نامی داخل پری خانہ ہوئی حُسنِ صورت کے ساتھ قدرت نے حُسنِ سیرت بھی بدرجۂ اتم عطا کیا تھا۔ اسی جہت سے واجد علی شاہ کی مردم شناس نگاہوں نے اُن کو "حضرت محل" کا سنجیدہ خطاب دیا۔ انھیں کے لڑکے مرزا برجیس قدر تھے جنھیں ۱۸۵۷ء میں تختِ اودھ پر بٹھایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ اولوالعزمانہ منصوبہ تھا جس کی وجہ سے حضرت محل شاہ معزول کے ہمراہ کلکتہ نہیں گئیں تھیں۔ اور لکھنؤ میں مقیم رہ کر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف جنگِ آزادی کی قیادت کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی

۱۲ مئی کو خاص دار السلطنت میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے شروع ہوئے۔ حضرت محل کی پشت پناہی کے لئے علماء اور مجاہدینِ اسلام کی منظم جماعت اودھ میں پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا سب سے پہلے ایک سردار آغا مرزا عرف کمبل پوش نے صرف دو سو مجاہدین کو ساتھ لیکر محمدی جھنڈا بلند کیا۔ لیکن رزیڈنٹ کے حکم سے ان سب کو گرفتار کرلیا گیا۔ قیصر التواریخ میں مرقوم ہے کہ:-

"ان لوگوں نے ہر مرد آدمی کو دیکھا اُس کو جہاد کی ترغیب دینے لگے۔ کوتوال سعادت گنج نے ان سب کو گرفتار کرلیا۔ جلو خانہ کا دروازہ ان کی شہادت گاہ بنا۔ یہاں پر آغا مرزا کے ساتھ ۱۴۱ مجاہدین کو پھانسی کی سزا دی گئی۔"[۵]

[۵] قیصر التواریخ صفحہ ۱۹۲

اس کے بعد کمپنی بہادر کے گماشتوں نے معافیٔ عام کے اشتہارات تمام اضلاعِ اودھ میں تقسیم کئے جن میں بغاوت کنندگان کو اُن کے "مجرمانہ گناہوں" کی اگر وہ اُن سے سرزد ہوئے ہوں۔ معاف کردینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عوام اور شاہی خاندان سے ہتھیار لے لینے کی پالیسی عمل میں لائی گئی۔ جس کی وجہ سے عوام اور بالخصوص علماء کے طبقہ میں سخت ہیجان اور اشتعال پھیل گیا۔ کیسلر بھی اور اُن کی جماعت کی قربانی رائگاں کیسے جاتی۔ تمام اودھ مثل کوہِ آتش فشاں شعلۂ جوالہ بن گیا۔ عوام علماء کی سرپرستی میں باوجود بے سروسامانی اور تہی دامانی ایک قہار اور باجبروت طاقت کے مقابلے میں سربکف ہو کر میدانِ عمل میں آ گئے ــــــ حمیتِ ملی اور حرارتِ دینی نے تمام مصلحتوں سے بے پروا بنا دیا۔ صرف ایک مقصد پیشِ نظر تھا اور وہ یہ کہ۔ ع

مجاہد کو خدا کی راہ میں قربان ہونا ہے

برجیس قدر کی تخت نشینی

۵ رجولائی ۱۸۵۷ء کو احمد حسین کی تحریک اور نواب مموخاں کی تائید سے برجیس قدر حضرت محل کے بیٹے تختِ واجدی پر متمکن ہوئے۔ شہاب الدین اور سید برکات احمد رسالدار نے مندیل شاہی برجیس قدر کے سر پر رکھی۔ تمام افسروں نے تلوار نذر گزرانی۔ ۱۲۱ ضرب توپ سلامی کی سر ہوئیں۔ شہر میں غلغلۂ مسند نشینی ہوا[۱]۔ شہر میں منادی ہوئی "خلق خدا کی۔ ملک شاہ دلی کا۔ حکم برجیس قدر کا" دوسرے روز تمام اہل وثائق پنشن یافتہ قدیم و جدید دربِ دولت پر حاضر ہوئے۔ اور اپنے عہدوں پر بحال ہوئے۔ برجیس قدر کے نام کا سکہ بھی جاری ہو جس پر حسبِ ذیل شعر اُس پر کندہ تھا:

نصاریٰ پہ قہرِ خدائی ہوا!
جواں مال سلطانِ لکھنؤ ہوا!

تمام بیگمات جمع ہوئیں۔ سب نے حضرت محل کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے برجیس قدر کی تخت نشینی پر رضامندی ظاہر کی۔ چونکہ برجیس قدر کی عمر اُس وقت صرف دس سال کی تھی۔ اس لئے حضرت محل اُن کی مختارِ کُل بنیں۔[۲]

مقابلہ کی تیاری

حضورِ عالیہ لندن میں تھیں اور واجد علی شاہ کلکتہ کی قیدِ فرنگ میں۔ غدر جیسے پُرآشوب زمانہ میں حضرت محل نے ان تمام باتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے قیادت کے

---

[۱] قیصر التواریخ صفحہ ۲۲۶
[۲] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۵۸ و ۵۹

بارِ گراں کو بظاہر اپنے نازک، لیکن حقیقتاً مضبوط کاندھوں پر اُٹھا کر غیر معمولی جرأت و بہادری کا ثبوت دیا۔
عام بھرتی کا اعلان ہوا۔ تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے نام احکامات جاری ہوئے کہ:۔

"ملک آبائی خدا نے اب ہم کو عطا کیا۔ دفع کفار فرنگ لازم ہے۔ باہم شریک ہوکر باقی ماندگان بیلی گارڈ کو قتل کرو۔ جو اُن کو قتل کرے گا اُس کا نصف علاقہ اُس کو معاف ہوگا۔"[۵۱]

چنانچہ مذکورہ حکم نامہ کے جواب میں جو رؤسا، اور تعلقہ داران اودھ مع فوج کثیر و زرِ خطیر لکھنؤ پہنچے اور تحریک میں شامل ہوکر اُنھوں نے نام نیک پایا۔ اور بقائے دوام حاصل کی۔ ان میں سے چند کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

نواب علی خاں رئیس محمود آباد، درگیج سنگھ، منشی محمد حسین قدوائی، اولاد حسین سیدپور، حشمت علی سندیلہ، منصب علی رسول آباد، کلو خاں نان پارہ۔[۵۲]

تمام اُمورِ سلطنت کو حضرت محل، نواب ممو خاں اور مولوی احمد اللہ شاہ صاحب کی رائے سے مرتب کرتیں۔ غدر کے زمانہ میں عمارت "چولکھی" میں ان کا قیام تھا۔ اور اسی عمارت میں ان کا دربار ہوتا تھا۔[۵۳]

حضرت محل کے تدبر، اعلیٰ دماغی قابلیت اور استقامت نیز نواب ممو خاں اور مولوی احمد اللہ شاہ کی حسن تدبیر نے تحریک کو اس کامیابی سے چلایا کہ مدت کی سپاہیانہ زندگی سے علیحدگی نے طبیعتوں میں جو بے حسی اور جمود پیدا کر دیا تھا وہ یکدم رخصت ہوگیا۔ جو ہتھیار زنگ آلود ہوکر بے کار ہوگئے تھے، وہ صیقل کئے گئے۔ ان کی جھنکار پھر فضائے آسمانی میں گونج کر یخ بستہ دلوں کو گرمانے لگی ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

حضرت محل کی بہادری اور جوش کا یہ عالم تھا کہ باوجود پردہ میں رہنے کے گھوڑے پر نکلتیں اور دس ماہ کے قریب انگریزوں کا مقابلہ کیا۔[۵۴]

عوام کی عقیدت اور محبت کی یہ کیفیت تھی کہ بر جیس قدر کو بلا کر گلے لگاتے، اور کہتے کہ تم کنھیا ہو، باپ کی طرح غافل نہ ہو جانا۔ اپنے "شملہ والوں" سے ڈرتے رہنا، ورنہ تمھیں خراب کریں گے۔[۵۵]

---

۵۱ قیصر التواریخ صفحہ ۲۲۹ ۔
۵۲ قیصر التواریخ صفحہ ۲۲۴ ۔
۵۳ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۵۶ ۔
۵۴ "روشن مستقبل" صفحہ ۹۰ ۔
۵۵ قیصر التواریخ صفحہ ۲۳۰ ۔

کمپنی کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت سُرعت سے بڑھ رہا تھا۔ مولوی ذکا راللہ لکھتے ہیں :۔

"صرف گیارہ روز میں اَودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عملداری خواب معلوم ہوتی تھی۔"[۵۱]

مسٹر ہنری لارنس اپنی ایک چٹھی میں جو اُس نے لفٹنٹ گورنر کو بھیجی تھی۔ رقم طراز ہے :۔

"سارے اضلاع ہماری حکومت سے نکل گئے اور ہر روز حالت بگڑتی جاتی ہے۔ سارے تعلقہ دار مسلح ہو رہے ہیں اور بعض نے دیہات پر قبضہ کر لیا ہے۔"

دارالسلطنت کا ذکر ہی کیا ۔۔ گاؤں اور قصبات تک کی یہ حالت تھی کہ :۔

"قصبہ اناؤ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں جس کا رقبہ صرف پون میل تھا، لڑنے والوں سے بھرا پڑا تھا اور گاؤں کے تمام گھروں میں ریتیاں بنی ہوئی تھیں۔"[۵۲]

"منادی ہوئی کہ پرسوں بیلی گارڈ پر حملہ ہوگا۔ مسلمانوں نے قرآن شریف اور ہندوؤں نے گنگاجل اُٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک محصورین کو تہِ تیغ کر کے بیلی گارڈ کو زمین کے برابر نہ کر دیا جائے گا۔ کھانا۔ پینا اور اپنا ذاتی کام کرنا سب حرام ہے۔ کل انگریز نہیں یا ہم نہیں۔"[۵۳]

جنگ کی گھماگھمی

۳۱ جولائی کو پہلا حملہ مولوی احمداللہ صاحب کی سپہ سالاری میں بیلی گارڈ پر ہوا۔ مولوی صاحب نے تمام فوج میں اعلان کیا :۔

"بیگم کے حکم سے لڑنے جاتے ہو۔ تنخواہ بھی وہی دیں گی۔"

حملے کے روز حضرت محل کو رات بھر نیند نہیں آتی تھی لوگ ان کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتیں۔ اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتیں۔[۵۴]

معرکۂ عالم باغ کے سلسلے میں راجہ مان سنگھ کو ان کی غیر معمولی جاں فشانی کے صلے میں علاوہ خلعت رومال اور دوشالہ کے "فرزند خاص" کا خطاب اور ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت کیا اور فرمایا کہ بعد فتح کے بہت سا روپیہ اور جاگیر دے کر خوش کروں گی۔[۵۵]

اگست میں لڑائی کا زور بہت زیادہ بندھ گیا۔ چونکہ کانپور کی شکست خوردہ فوج کی کافی تعداد

---

۵۱ "عروجِ عہدِ انگلشیہ" صفحہ ۸۱۰ و صفحہ ۸۱۶

۵۲ "عروجِ عہدِ انگلشیہ" صفحہ ۸۶۲

۵۳ قیصر التواریخ ۔

۵۴ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۵۸ ۔۔ ۵۹ ۔

۵۵ " " صفحہ ۲۶۷ ۔

فدا حسین رسالدار کی معیت میں مع توپ خانہ کے لکھنؤ آگئی تھی۔

جنرل سید برکات احمد اور کپتان صوبہ سنگھ نے اپنے اپنے رسالوں کے ساتھ بیلی گارڈ پر زبردست حملہ کیا۔ انگریزی مورچوں کے اندر بھو کے پیاسے گھس گئے۔ دست بدست تلوار چلنے لگی۔ ایک مولوی صاحب نیزہ علم لے کر آگے بڑھے اور مورچے کی خندق میں مارے گئے۔ ہر مورچہ پر جدا جدا رنگ سے لڑائی ہوتی تھی۔ مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں :۔

"بیلی گارڈ پر اس قدر زبردست حملہ کیا گیا کہ اُس کی سب سے بڑی خندق اُڑ گئی۔ باغی زینے لے کر آگے بڑھے اور دیواروں پر چسپاں کر دئے۔ اور توپ کی زدوں میں گھس گئے۔ آج وہ دلیری سے حملہ کرنے آئے تھے۔ انگریزی سپاہ کو پریشان کرنے کے لئے رات کو گھنٹوں شور و غل مچاتے "[۵۱]

جنرل نکلسن لکھتا ہے :۔

"باغی کسی ایسے موقع کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے جس میں ہمارے سپاہیوں کو بھگانے کا کام نہ کرتے ہوں"[۵۲]

ایک روز علی محمد خاں نے علم اُٹھایا اور قرآن شریف کو مثل جنگ صفین اُس میں باندھا اور کلمات یاس کہتے رہے۔[۵۳]

ایک فقیر منش بزرگ جن کو عوام عقیدت سے شاہ جی کہتے تھے ان کے جوش و خروش کی یہ کیفیت تھی کہ یکہ و تنہا تلوار ہاتھ میں لیکر بیلی گارڈ پر اشعار ذیل پڑھتے ہوئے حملہ آور ہوئے ؎

درمیانِ ایں و آں گردد بسے جنگِ عظیم
قومِ عیسیٰ را شکستِ بے گماں پیدا شود

دلی کی شکست کی خبر نے تازیانہ کا کام کیا اور حملوں کا زور بہت بڑھ گیا۔ ایک اشتہار شائع ہوا جس کا مضمون یہ تھا :۔

"سب خاص و عام بگوش ہوش سنیں کہ ان کافروں نے جب دلی کو فتح کیا، وہاں کسی کو جیتا نہ چھوڑا۔ اسی طرح تمہارے بال بچے بھی مار ڈالے جائیں گے۔ مقام غیرت ہے کہ آنکھوں کے سامنے عورات اور بچے

---

۵۱ "عروج عہد انگلشیہ" صفحہ ۸۴۹ ۔
۵۲ "عروج عہد انگلشیہ" صفحہ ۸۴۹ ۔
۵۳ "قیصر التواریخ" صفحہ ۲۰۷ ۔

مارے جائیں یا ذلیل ہوں۔ لے بہادرو یہ گوشے ۵۰۰ سے زیادہ نہیں اگر انھیں مار لو تو تمام عمر چین سے رہیں گے۔"[51]

فیروز شاہ[52]۔ نانا راؤ[53] اور جنرل بخت خاں[54] بھی اس وقت آ گئے تھے اور حضرت محل کے یہاں بطور

---

[51] "قیصر التواریخ" صفحہ ۲۶۴ -

[52] فیروز شاہ ناظم بخت کے لڑکے اور فرخ سیر بادشاہ دہلی کے نواسے تھے۔ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ اندور پہونچے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء برپا ہوا۔ ہنگامہ کی خبر سنکر وہیں ٹھیر گئے۔ مجاہدین کو لیکر گوالیار سے اکبر آباد آئے، آگرہ کا محاصرہ کیا، شکست ہوئی، میوات آئے۔ جنرل عبد الصمد خاں اور فضل علی رسالدار کو ساتھ لے کر لکھنؤ۔ شاہجہاں پور ہوتے ہوئے بریلی آئے۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ دلی اور لکھنؤ کی شکست کے بعد بیکانیر وغیرہ کے جنگلوں میں گھومتے رہے۔ وہاں سے کابل اور ایران چلے گئے۔ لوگوں نے حجاز میں گیروا لباس میں دیکھا۔ اور پہچانا کہ فیروز شاہ ہیں۔ خان بہادر خاں نے جو اس وقت حاکم بریلی تھے۔ بڑا اعزاز و احترام کیا۔ بگھیا کے پل پر جو بریلی سے چند کوس کے فاصلہ پر ہے انگریزوں کے مقابلہ میں خوب داد شجاعت دی۔ خان بہادر خاں کی شکست کے بعد لکھنؤ آکر حضرت محل کے مہمان ہوئے۔ احمد اللہ شاہ صاحب سے کسی مسئلہ پر اختلاف ہوا۔ لکھنؤ کو خیرباد کہا۔ محمود آباد آئے۔ یہاں پر بہت کافی فوج جمع کر لی۔ اور لڑائی شروع کرنیکا ارادہ کیا۔ ایک نہایت مؤثر تقریر کی جو کہ حسب ذیل ہے:۔

"میں نے تن برگ دیا ہے، جسے مرنا ہو میرا ساتھ دے ورگرنہ اختیار ہے کہ چلا جائے۔" کہتے ہیں کہ اُس دن شہزادہ کو تیسرا فاقہ تھا۔

[53] نانا راؤ مرہٹہ خاندان کا آخری راجہ ہے غدر ۱۸۵۷ء کی اسکیم اُس نے اور جنرل عظیم اللہ نے مرتب کی۔ اور کانپور میں بڑے زور شور کے ساتھ تحریک کو شروع کیا۔ اس کے بہادرانہ اوصاف کا اندازہ اس کے حسب ذیل خط سے ہو سکتا ہے جو اُس نے اپنی ایک انگریز محبوبہ کو لکھے ہیں اور جو کانپور کی لوٹ میں نانا راؤ کے سامان میں ایک فوجی کو ملے۔ ایک آخری خط میں وہ اپنی محبوبہ کو لکھتا ہے:۔

"ہم مشرقی لوگ زندگی کو بہت حقیر سمجھتے ہیں میرے ملک کو میری ضرورت ہو وہ جذبے جسے دنیا حب وطن کے نام سے پکارتی ہی مجکو مرتعش کئے ہوئے ہی تمام ملک پر تاریکی چھائی ہوئی ہے لیکن میں پُر امید ہوں کہ شاید میرے مرنے کے عرصۂ دراز کے بعد میری قربانی کا تخم زمانہ کے ہاتھوں بار آور ہو، امید افزا پھول بن جائے میں نے دونوں ہاتھ زندگی کی آتش فروزاں پر گرم کر لئے ہیں اور کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہ اب قریب ہے" (مکتوبات فرنگ)

کانپور کی شکست کے بعد تانتیا ٹوپی کو تحریک کا قائد بنا کر لکھنؤ آئے۔ حضرت محل نے شیش محل میں اُتارا۔ گیارہ ضرب توپ سلامی کی ہوئی۔ ۲۵ ہزار دعوت کے دو شالہ رومال اور خلعت اس کے علاوہ عطا ہو۔

[54] جنرل بخت خاں دلی کی شکست کے بعد لکھنؤ آئے۔ غلہ منزل میں سلطان بہو صاحبہ کے یہاں بسبب قرابت قریبہ قیام پزیر ہوئے اس کے بعد حضرت محل سے ملاقات کو گئے۔ ۵ ہزار دعوت کے علاوہ خلعت اور رومال ملا۔ جلال آباد پر مورچہ بھی لگایا تھا۔ ان کے ہمراہ ۵ ہزار فوج ۳ سو عورتیں، اس کے علاوہ دلی اور فرخ آباد کے بھی بہت سے لوگ تھے۔ لکھنؤ کی شکست سے پہلے خدا جانے مع تمام فوج کے کہاں روپوشس ہو گئے۔ (مفصل سوانح کے لئے ملاحظہ ہو "مصنف علیگڑھ" بابتہ جون ۱۹۲۵ء)

مہمان خاص کے قیام پزیر تھے، ان ہر سہ فدائیانِ وطن کی موجودگی اور حضرت محل کے استقلال نے جنگ کو مارچ تک جاری رکھا۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ :-

"ستر، اسّی ہزار آدمی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے۔ جن کو قومی عزت، مذہبی دیوانگی نے جواں مرد عورت حضرت محل نائب السلطنت کے علموں کے نیچے شہر میں جمع کیا تھا۔"[۵۱]

ایک انگریز فیلڈ ٹانگ نامی لکھتا ہے :-

"غدر کے زمانہ میں انگریزی فوج کی تعداد بہت کم تھی۔"[۵۲]

مجاہدین کے متواتر حملوں نے تعداد کو اور بھی گھٹا دیا، چنانچہ ہنری لارنس نے کالن کیمبل کو تحریر کیا :-

"اگر کمک نہیں آئیگی تو وہ دس پندرہ روز سے زیادہ ریزیڈنسی کو اپنے اختیار میں نہیں رکھ سکیں گے۔"[۵۳]

اندرونی غداری

لیکن بنگال اور دلی کی طرح اودھ میں بھی اندرونی غداری کا سلسلہ جاری تھا۔[۵۴] اور بیلی گارڈ کی یہ سخت جانی انگریزی فوج کی بہادری کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ غدارانِ وطن کی مہربانیوں کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ مصنف قیصر التواریخ رقم طراز ہیں :-

"انگریزوں نے جب پہلا حملہ کیا تو بموجب حکم حضرت محل قیصر باغ کے دروازے بند کر دیے گئے ـــــ عجیب آبادی تلنگے شہر والوں کو برا بھلا کہتے تھے اور کہتے اگر یہ لوگ رسد وغیرہ بیلی گارڈ میں نہ پہونچاتے تو انگریز فاقوں سے مر جاتے۔"[۵۵]

ناکامی کے دوسرے اسباب

مہاراجہ بال کرشن ۔۔۔۔۔ جو بظاہر حضرت محل کے سامنے بہت خیر خواہی کا اظہار کرتا تھا۔ انگریزوں سے ملا ہوا تھا، اس نے کسی تدبیر سے تمام تعلقہ داروں کو اپنے علاقوں میں واپس جانے پر آمادہ کر لیا۔ چونکہ اُس وقت روپیہ کی سخت قلت ہو رہی تھی، حضرت محل بھی اُس کے دامِ تزویر میں آگئیں۔ بال کرشن نے تاویل یہ پیش کی کہ اگر یہ لوگ اپنے علاقوں میں نہیں جائیں گے تو رعایا سے تحصیل زر کس طرح ہوگا۔ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔ مارچ تک تعلقہ داروں کا

---

۵۱ عروج عہد انگلشیہ۔
۵۲ رسالہ "نیسویں صدی" ماخوذ از "الہلال" کلکتہ جلد ۳ - مطبوعہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۳ء۔
۵۳ عروج عہد انگلشیہ۔ مقالہ بر "عہد فرنگ" از مولانا ابوالکلام آزاد صاحب۔
۵۴ قصائد غدریہ۔ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی کی وہ قلمی منظوم آپ بیتی جو انھوں نے بزبان عربی کالے پانی میں بیٹھ کر مرتب کی تھی۔
۵۵ قیصر التواریخ صفحہ ۲۳۳۔

مع افواج کے چلے جانے سے تحریک میں اضمحلال پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن پھر بھی حضرت محل کی ہمت مردانہ میں شمہ بھر فرق نہیں آیا۔ اور پورے زور شور کے ساتھ معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

جنگ بہادر نیپال کی انگریزوں کو مدد

عین اُس وقت بہادر جنگ وزیر اعظم نیپال نے ایک جمعیت کثیر کے ساتھ اپنے ملک سے نکل کر اودھ کا رُخ کیا۔

کالن کیمپل اور جنرل آوٹرم بغاوت کو فرو کرنے میں مسلسل کوششوں کے باوجود ناکام رہے تھے اس کو جنگ بہادر اور اُس کی فوجوں نے قابو میں کر لیا۔

کیمبل اور اوٹرم نیپالی بندوقوں اور تلواروں کے سایہ میں اودھ کو فتح کرنے کے لئے اُٹھے، وہ اودھ جہاں گورنر جنرل لارڈ کیننگ کے الفاظ میں سب سے زیادہ باغی جمع تھے۔[۵۱]

دوست نے خاطر دشمن سے کیا مجھ کو ہلاک

لیکن علماء اسلام اور مجاہدین نے اپنے خون کے دریا بہا کر نیپالی فوجوں کے راستوں کو مسدود کر دیا۔ پھر بھی جنگ بہادر ۱۴ر فروری کو گورکھ پور سے دارالسلطنت جانے کے لئے روانہ ہوا۔ اُس کے ساتھی جنرل روکرافٹ کو معلوم ہوا کہ پھول پور میں باغی بھرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جنگ بہادر نے براہ سلطان پور لکھنؤ کی راہ لی۔ راستہ میں دو خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ اور باغیوں نے نیپالیوں کا خوب مقابلہ کیا۔[۵۲] گورکھ پور سے لیکر سلطان پور تک ۴۳ میل کے فاصلہ میں باغی بھرے ہوئے تھے۔ اُن کا سب سے بڑا مقام سنگ رامپور اور چاندا تھا۔ ان کے مہر لشکر بندہ حسین اور مہدی حسین تھے فرنیکس صاحب اور نیپالیوں کی افواج نے جب ان مقامات پر قبضہ کر لیا۔ تو ذکاء اللہ لکھتے ہیں:۔

"مہدی حسن پھر بھی مایوس نہیں ہوا۔ اور بادشاہ گنج میں نیپالیوں کے سد راہ ہونے کے لئے پراگندہ اور شکست یافتہ سپاہ کو جمع کیا۔[۵۳] مرزا جعفر بیگ سپہ سالار نے گھرے نالے کے نیچے جس پر ایک سڑک لکھنؤ کو جاتی تھی۔ صف آرائی کی۔ اور سب سے بڑا توپ خانہ سڑک کے کنارے لگایا۔"[۵۴]

شکست و فتح تو قسمت سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

فرینکس صاحب امیٹھی میں جو لکھنؤ سے آٹھ میل تھی فروکش ہوا۔ اس کے پاس کمانڈر انچیف کا حکم آیا کہ آگے نہ بڑھو۔ قلعۂ داؤدی میں باغی بہت بھرے ہوئے ہیں۔[۵۵]

---

۵۱ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۴۴
۵۲ " " صفحہ ۵۲
۵۳ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۵۰
۵۴ " " صفحہ ۵۳

معرکۂ لکھنؤ

نیپالیوں اور انگریزوں کا پہلا متحدہ حملہ عالم باغ پر ہوا۔ حضرت محل کی کوٹھی پر بڑی سخت لڑائی ہوئی جس کے اردگرد باغیوں کی سیکڑوں لاشیں شمار کی گئی تھیں[۵۱]۔ قریب تھا کہ چولکھی پر قبضہ ہو جائے کہ عین اُس وقت خان علی خاں ایک ہزار سپاہ کے ساتھ آ گئے۔ خوب رن پڑا۔ چمن پر خون کی نہر جاری تھی۔ پیچھے سے جنگ بہادر نے باڑ ماری۔ سیکڑوں گر پڑے۔ خان علیخاں بھی زخمی ہوئے[۵۲]۔ حضرت محل کسی طرح چولکھی چھوڑنے کا نام نہیں لیتی تھیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب سے زیادہ حملہ کا رُخ چولکھی کی جانب ہے۔ مصنف قیصر التواریخ رقمطراز ہیں:۔

"ایک روز صبح کو بکی یہ داشارہ حضرت محل کو نواب ممتو خاں نے بہت سمجھایا۔ لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا[۵۳]۔ کمپنی کی فوجوں کے چو طرفہ حملوں نے اب مجاہدین کو امان لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس وقت جنگ نے بھی جارحانہ کی بجائے مدافعانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ ملک کے تمام حصص پر "برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی" کا تسلط ہو چکا تھا۔ لہٰذا اُس نے آلاتِ حرب کی کثیر تعداد جن میں بہت زیادہ توپیں تھیں، مع قواعد داں توپچیوں کے خاص دارالسلطنت لکھنؤ میں اُن مجاہدین کے مقابلہ پر لا کر جمع کر دیا جن کے پاس جدید قسم کی توپوں اور ہتھیاروں کی کمی تھی۔ لے دے کر صرف ایک اوسط درجہ کا پرانا توپ خانہ تھا۔ وہ کہاں تک مقابلہ کرتا۔ آخر شکست ہوئی۔ اور انگریزی فوج کا تسلط ہو گیا۔"

حضرت محل کی پسپائی

شکست کے بعد حضرت محل سراسیمہ اور پریشان تھیں کیونکہ ان کی گرفتاری کا خدشہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لئے سرزمین وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ ان کی چولکھی سے روانگی کا منظر حد درجہ درد انگیز تھا۔ مصنف قیصر التواریخ رقمطراز ہیں:۔

"حضرت محل بحال تباہ مع دیگر بیگمات اور شاگرد پیشہ عورات و ملازمین پھاٹک سے نکلیں۔ اس طرح کہ وہ آگے تھیں اور سب پیچھے صف بستہ۔ برجیس قدر ایک سپہ کی گود میں تھے۔ پیادہ پائی کی وجہ سے ہر ہر قدم پہ ٹھوکریں کھاتی اور اُلجھتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گزر کر پل مولوی گنج پر پہونچیں۔ تلنگے ہر طرف متلاشی سواری تھے۔ رات کو غلام رضا کے یہاں قیام کیا۔ پھر وہاں سے شرف الدولہ کے گھر گئیں۔ وہاں سے

---

۵۱ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۷۰

۵۲ قیصر التواریخ صفحہ ۳۲۳

۵۳ قیصر التواریخ صفحہ ۳۳۲

محل سرائے حسین آباد آگئیں۔ شام تک جتنا عملہ شاگرد پیشہ تھا سب جمع ہو گیا۔ اور ان کی حفاظت کو پہرے کھڑے ہوئے تھے"۔[۵۱] ملی رضا کے یہاں جنرل اوٹرم کا پیغام پہونچا کہ ہم زمانہ واجد علی شاہ کا بدستور تم کو تمہارا ملک دیں گے۔ جنگ سے دست بردار ہو جائیے فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ مسافران کلکتہ ولندن کو بیس نبوا دیں گے۔ حضرت محل نے اوٹرم کی اس پیشکش کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا کر صلح نامہ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔"

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

بچپن سے لیکر اب تک جس سرزمین پر زندگی کے بہترین ایام گزارے تھے اُس سے جدا ہونے کو کسی طرح جی نہ چاہتا تھا۔

عجب ہے مسلک راہ وفا بھی
قدم محدود ہو کر رہ گیا ہے

لیکن ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔ نیپال کا رُخ کیا۔ نواب ممو خاں اور احمد حسین کے علاوہ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں:۔

"ایک لاکھ کا مجمع بھی ان کے ہمراہ تھا۔ مولوی احمد اللہ شاہ نے اپنے بعد لڑائی جاری رکھ کر برجیس قدر اور حضرت محل کے لئے آزادی کے ساتھ چلے جانے کا موقع پیدا کر دیا تھا۔"[۵۲]

نیپال میں پناہ گزینی، بے مثال خودداری اور مصائب

حدود نیپال میں داخل ہو کر ہر قسم کی تکالیف اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلے حضرت محل کوہ بٹول پر قیام پذیر ہوئیں۔ جہاں آصف الدولہ کی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ یہاں ان کو مہاراجہ نیپال کا ایک تہدید نامہ ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ:۔

"آپ انگریزوں سے صلح کریں یا کسی اور طرف کو چلی جائیں۔ ہم سے توقع کسی طرح کی امداد و اعانت کی نہ رکھئے گا ہم انگریزوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔"[۵۳]

حضرت محل کی طرف سے نواب ممو خاں نے اس نامۂ پُر نخوت کا جواب بہت تلخ الفاظ میں دیا اور لکھا:۔

"ہم کسی طرف نہیں جائیں گے یہیں رہ کر انگریزوں سے لڑیں گے۔ کچھ تمہارے بھروسہ پر اُن سے نہیں بگاڑا ہے۔"[۵۴]

---

۵۱ قیصر التواریخ صفحہ ۳۳۴
۵۲ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۶۰
۵۳ قیصر التواریخ صفحہ ۳۴۰
۵۴ قیصر التواریخ صفحہ ۳۴۱

اس کا جواب یہ آیا:-

"ادھر سے انگریز اور اُدھر سے ہم تمہیں ماریں گے۔ یہاں سے نکل جاؤ۔"

اِس خط وکتابت کا یہ نتیجہ نکلا کہ صرف حضرت محل، برجیس قدر اور اُن کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو نیپال میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ مجاہدین کی کثیر تعداد کو نیپال کے پہاڑوں میں درندوں کی خوراک بننے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

اس عرصہ میں جنگ بہادر اودھ پر انگریزوں کا دروبست قبضہ کرا کر نیپال کو واپس آ گیا تھا۔ نواب ممّو خاں اور نیپالیوں سے روزانہ جنگ آزمائی ہوتی تھی۔ بہادر جنگ کا خیال تھا کہ جن بھڑکتے ہوئے شعلوں کو وہ شاید ہمیشہ کے لئے دبا کر ابھی ہندوستان سے آیا تھا کیا اُس کی چند بجھی ہوئی چنگاریاں نیپال کے خرمنِ امن پر گر کر اس کو تباہ و برباد نہیں کر سکتی ہیں؟ جب کوئی صورت کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو جنگ بہادر کو ایک رکیک چال سوجھی جس سے نواب ممّو خاں اور اُن کی فوج کا بہ آسانی خاتمہ ہو گیا۔ اب یہ شیر کوہسار بھیڑ کی کھال اوڑھ کر نمودار ہوا تھا۔ اسی دوران میں بہادر جنگ نے نواب ممّو خاں سے تعلقات بڑھانا شروع کئے۔ اکثر ملاقات ہوتی، یہاں تک کہ جنگ بھی موقوف ہو گئی تھی۔ ایک روز حسب معمول باتیں کرتے کرتے جنگ بہادر نواب ممّو خاں کو اُس پہاڑی پر لے آیا، جہاں ایک انگریز بیلی صاحب عربی لباس پہنے مع کچھ آدمیوں کے چھپا بیٹھا تھا۔ ممّو خاں اس ناگہانی آفت سے قطعی بےخبر تھے۔ اس لئے کچھ پیش نہ گئی اور گرفتار ہو کر لکھنؤ لائے گئے۔ پھانسی کی سزا ہوئی لیکن یہ لیسے بڑے مجرم کے لئے ناکافی خیال کی گئی اور حبس دوام بعبور دریائے شور ہوا۔ وہیں فوت ہوئے۔[۵۱]

نواب ممّو خاں کی گرفتاری کے بعد ان کی جماعت منتشر ہو گئی۔ حضرت محل اور برجیس قدر کے قیام پر جنگ بہادر کو کوئی اعتراض نہ تھا اس کی دو وجہیں ہو سکتی تھیں۔ اوّل یہ کہ عورت ہونے کے باوجود اُنھوں نے اب تک جس غیر معمولی جرأت اور اولوالعزمی کا ثبوت دیا تھا، اُس سے اُس کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کے پاس جو کثیر التعداد قیمتی ہیرے، جواہرات تھے اُنھوں نے ——— اُن سب کو حکومتِ نیپال کو نذر کر دیا۔[۵۲]

خدا کی قدرت ہے، کہاں وہ محلاتِ شاہی جن پر بلا شبہ جنتِ ارضی کا گمان ہوتا تھا۔ کہاں نیپال کی

---

۵۱ حکایاتِ عجیب مصنفہ مولوی جعفر تھانیسری۔ ۵۲ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۷۳

سنسان اور ویران پہاڑیاں۔ دیارِ غیر میں نشیمن کے لئے چند تنکوں کی تلاش و جستجو اور پھر اس پر مستزاد صیاد کی برق آسا نظروں کا قیامت خیز سامنا۔ لیکن پائے ثبات کو لغزش ہو۔ ناممکن۔ ع

"آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود" کا اس سے زیادہ اچھا اور کون سا مظاہرہ ہو سکتا تھا۔ عرصہ تک انگریزوں کی یہ خواہش بلکہ کوشش رہی کہ حضرت محل ہندوستان واپس آجائیں۔ ایک انگریز مصور جو برجیس قدر کی تصویر کھینچنے گیا تھا اُس کے ذریعہ انگریزوں نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ حکم سرکار ہے فیض آباد۔ لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں آجائیں۔ تنخواہ کے علاوہ احترام شاہانہ بھی کیا جائے گا۔[۵۱]

لیکن جب تک زندہ رہیں نہ خود آئیں اور نہ برجیس قدر کو جانے دیا۔ ان کے انتقال کے بعد برجیس قدر ہندوستان آئے اور کلکتہ میں اقامت پذیر ہوئے۔ ایک دعوت کی تقریب میں کسی نے زہر دے دیا۔ مع فرزند اور بیوی راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔[۵۲]

احمد اللہ شاہ کی شہادت

حضرت محل کے ساتھ تحریک کے تمام دوسرے سربرآوردہ لوگ یا تو اودھ سے چلے گئے یا مارے گئے۔ لیکن مولوی احمد اللہ شاہ صاحب نے ابھی تک میدان سے منہ نہیں موڑا تھا۔ اور مصروفِ کارزار تھے۔ حضرت محل کی روانگی کے بعد سعادت گنج پر مورچہ لگا کر توپ کو تڑاہے پر گاڑا۔ لیکن قضا و قدر کا فیصلہ ان کے خلاف ہو چکا تھا۔ ہزیمت فاش ہوئی۔ عقیدت کیشوں اور مریدوں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر زبردستی میدان سے ہٹایا۔ اور راجہ کی گڑھی پر جا کر سب اکٹھے ہوئے۔ لیکن راجہ نے نہ صرف پھاٹک بند کر لیا۔ بلکہ اوپر سے بندوقوں کی باڑ مار دی۔ آپ شہید ہوئے۔ راجہ نے سر کاٹ کر بطور تحفہ کمپنی بہادر کی خدمت میں بھیجا۔ اس کے صلہ میں پچاس ہزار روپیہ انعام اور جاگیر ملی۔ مسافر اپنا سفر ختم کر چکا تھا۔ جنگ فی سبیل اللہ میں ایک مسلمان کی سب سے بڑی تمنا شہادت یا فتح ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کا حاصل ہو جانا ہی اس کی معراج ہے۔

سر گشتہ بر نیزہ میزد نفس ۔ کہ معراجِ مرداں ہمین است و بس

اودھ پر تسلط کے بعد کمپنی کے مظالم

بقول ڈاکٹر ہنٹر:۔

"بغاوت اور تعصب تو اُس غیر ملکی حکومت کے لازمی نتائج ہیں"۔[۵۳]

---

۵۱ قیصر التواریخ صفحہ ۳۶۰
۵۲ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ صفحہ ۷۳
۵۳ ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۲۰۹

لیکن مسلمانوں نے اس لازمی جذبہ کے گناہوں کی پاداش میں جو ذلتیں اور ایذائیں برداشت کی اُن کی تلخ یاد دلوں سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔

جنرل ہیولاک صاحب نے نیل کو لکھا تھا:۔

"جس وقت آپ آگئے تو میرا ارادہ ہے کہ فوراً ہی ایک ایسا صدمہ پہونچاؤں کہ اس سے سارا ہندوستان ہِل جائے۔"[۵۱]

لکھنؤ کی فتح کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ ہر ہندوستانی کو خواہ سپاہی ہو یا دیہاتی بیدریغ تہہ تیغ کیا گیا۔ نہ کوئی سوال کیا جاتا اور نہ کسی قسم کا تکلف، بلکہ سیاہ رنگ ہونا ہی اس کے مجرم ہونے کی کافی دلیل سمجھی جاتی[۵۲] مصنف قیصر التواریخ لکھتے ہیں:۔

"لکھنؤ کی فتح کے بعد پندرہ دن تک شہر لٹا۔ ادھر سپاہیوں سے کوئی جگہ محفوظ نہ تھی۔ اس غارت گری میں صاحبان فوج بھی کمربستہ تھے جشن عباس میں تین سو پردہ نشین عورتوں کی گوروں کے ہاتھ سے آبروریزی ہوئی۔"[۵۳]

ڈاکٹر رسل اپنی چشم دید رپورٹ میں رقمطراز ہیں:۔

"لوٹ کا حال بیان نہیں ہو سکتا جس مکان کے کواڑوں کو توڑا وہ سونے چاندی کے ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ لوٹ کا عجب تماشا تھا۔ ہنوز نسیم کال کے تر چکنے تھے۔"[۵۴]

اس کے بعد پھر صاحب موصوف لکھتے ہیں:۔

"صاحب غیرت عورات، لڑکیاں گوروں کی صورت دیکھتے ہی کنوؤں میں گر کر مر گئیں۔۔ رعایا پر بڑی آفت تھی۔ ہر کوچے سے دہشت برستی تھی۔ خونِ ناحق کی بو آتی تھی۔"[۵۵]

رینالڈ کو نیل نے لکھا:۔

"بعض دیہات کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ جہاں کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔"[۵۶]

اودھ کے بہادر مرد اور عورتیں

مسلمانانِ اودھ کی بہادری اور صفاتِ مردانہ کے قصے آج موجودہ نسلوں کے لئے افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ کمزور نحیف

---

۵۱ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۸۶
۵۲ علماء کا شاندار ماضی صفحہ ۵۷
۵۳ قیصر التواریخ صفحہ ۴۶
۵۴ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۹۱
۵۵ " " صفحہ ۲۳۶
۵۶ علماء کا شاندار ماضی صفحہ ۶۳

اور نازک بدن ہونا باشندگانِ اودھ کی آج خاص صفت سمجھی جاتی ہے، دراں حالیکہ صرف سنو سال پہلے اُن کے اسلاف کے متعلق مصنف "شبابِ لکھنؤ" نے تحریر کیا تھا کہ :-

"میرا گزر اِس عجیب ملک میں ہوا جہاں کے خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں، جن کے بُشرے سے جنگ جوئی ٹپکتی ہے۔ مہیب صورت۔ سیاہ ڈاڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس نظر آتے ہیں۔ باشندگانِ اودھ کا خاص قدرتی مذاق مبارزت ہے۔" [51]

اس کے بعد پھر صاحب موصوف لکھتے ہیں :-

"گلے ٹھلے کے پٹھان ڈھال تلوار لگائے تیوریاں چڑھائے شانے سے شانہ نہ کرتے اور ہر طرف گھورتے ہوئے نکل گئے۔" [52]

اس کے بعد پھر صاحبِ "شباب لکھنؤ" لکھتے ہیں :-

"جب وہ لوگ گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک پہنے ہوں مگر تیغ کی جوڑی ڈھال دونوں لگائے ہوں گے بھینسے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال اکثر بائیں جانب کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ لکھنؤ ایسے ہتھیار بند آدمی اِن شہروں میں کہیں نہ دکھائی دیں گے۔" [53]

"ذرا ذرا سی بات پر جدال و قتال کر بیٹھنا گویا مرغوب طبع ہو گیا ہے۔ خیر اس سے اس قدر فائدہ ہوتا ہوگا کہ ہتھیاروں میں زنگ نہ لگتا ہوگا۔" [54]

علماء مجاہدین اور عوام کے علاوہ بیگمات نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اُن سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ مصنف شباب لکھنؤ رقمطراز ہیں :-

"میں نے بچشم خود ان کو قواعد کرتے دیکھا۔ یہ عورتیں پوری طرح سے بندوق چھتانے۔ آگے بڑھنے۔ پیچھے ہٹنے۔ بندوق بھرنے۔ نشانہ لگانے سنگین چڑھانے کے کام اسی ترتیب سے کرتیں۔ جیسے بارکوں میں ہوتے ہیں۔ ان کی جماعت میں سارجنٹ بھی ہوتے تھے۔" [55]

اس کے بعد پھر صاحب موصوف لکھتے ہیں :-

"ان زمانہ سپاہیوں کی دو کمپنیاں تھیں۔ غازی الدین حیدر اپنے بعد نصیر الدین حیدر کو تخت دینا نہیں چاہتے تھے اس پر نصیر الدین حیدر کی ماں بڑی جرأت و استقلال کے ساتھ لڑیں۔ انھوں نے اپنے سپاہیوں کو مسلح کر کے ذاتی

---

[51] شباب لکھنؤ صفحہ ۳
[52] شباب لکھنؤ صفحہ ۱۰۰
[53] " " صفحہ ۱۲ - ۱۳
[54] " " صفحہ ۱۱۰
[55] " " صفحہ ۱۰۳

مردانگی سے بہت اچھی مثال قائم کی تھی۔ بالآخر فتح مند ہوئیں اور بادشاہ نے شکست کھائی۔"[۵۱]

"نصیر الدین کو زہر دیا گیا تو ان ہی بیگم صاحبہ نے از سر نو ہنگامہ اٹھایا۔ اپنی زنانہ فوج کو بھیج کر رزیڈنسی کا محاصرہ کر لیا اور نصیر الدین کے لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا۔ اگر بیگم صاحبہ کسی اور زمانہ میں پیدا ہوتیں تو یقینی انکے کارہائے نمایاں دنیا کی تاریخ میں روشن حروف میں لکھے جاتے۔" ان کی شجاعت پر صد آفرین کہنا چاہیئے۔[۵۲]

نواب ممو خاں کی گرفتاری کے بعد ان کی فوج جس پر حکومت نیپال نے رسد تک بند کر دی تھی اس کی بہادری کا اندازہ صرف ذیل کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ہر گھاٹی میں فوج باغیہ کی شکل بن مانس کی سی بن گئی تھی۔ جسم پر کوئی کپڑا تک نہ تھا، صرف تلوار بندوق اور سنگین باقی رہ گئی تھی۔

جلاوطنی اور قتل و غارت کرنے کے بعد بقیہ آبادی سے ہتھیار چھین لینے کی پالیسی تیزی سے عمل میں لائی گئی۔ ایک سال تک سب قسم کے ہتھیار چھکڑوں پر بار ہو کر داخلِ مال خانہ سرکار ہوئے۔[۵۳]

کسی بہادر قوم کو نہتہ کر کے بزدل بنانے کی اس سے زیادہ موثر اور کون سی تدبیر ہو سکتی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد بزدلی اور پست ہمتی کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ اپنے کو جنگ جوؤں کی اولاد کہلاتے ہوئے جھجک محسوس کرنے لگے اور جب مولوی عبد الحلیم صاحب شرر نے اپنی کتاب مرتب کرنے کے سلسلہ میں ماہرانِ فنونِ جنگ کا باب ترتیب دینا چاہا تو انھوں نے نہایت اندوہ و ملال کے ساتھ تحریر کیا کہ :-

"موجودہ نسل اپنے اجداد کے شجاعانہ کارناموں اور سپہ گری کے کاموں سے بالکل ناآشنا ہے اور آج جو ہم نے ان فنون پر قلم اٹھایا ہے تو کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس سے حالات معلوم ہوں۔ صرف مسعود ندرا اور ایک بزرگ سلیمان خاں صاحب[۵۴] فنونِ جنگ کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں اُن ہی کی مدد سے ہم لکھ رہے ہیں۔"

برعکس اس کے وہ عیوب و نقائص جو عوام کے تو نہیں ہاں بادشاہوں کے مشاغل ضرور تھے۔ وہ جن کو اب فنونِ لطیفہ اور آرٹ کے خوشنما الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ اُن کے تدوین کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ ہیبت ناک مظالم نے پوری قوم کو کیسے عبرت ناک انجام پر پہونچا دیا۔ لیکن نہ معلوم کیوں سب کچھ مٹ جانے پر بھی ڈاکٹر ہنٹر نے ہم غریبوں کے بارے میں انگریزوں کو متنبہ کیا ہے کہ :-

"اِن کے معاملہ میں معمولی سی شکایتیں بھی عظیم الشان سیاسی غلطیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔"[۵۵]

---

[۵۱] شباب لکھنؤ صفحہ ۱۰۴ [۵۲] شباب لکھنؤ صفحہ ۱۰۵
[۵۳] قیصر التواریخ صفحہ ۶۶ [۵۴] نواب سلیمان خاں مؤلف تاریخ سلیمانی۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی اولاد سے تھے۔
[۵۵] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۰۵

نواب صدر یار جنگ بہادر[۱]

(از جناب مولوی عبدالشاہد خاں صاحب اورینٹل اسسٹنٹ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

وہ اولوالعزم ذاتِ گرامی جسے علامہ اقبال مرحوم جیسا حکیمِ امت اپنے خطوط میں استاد کا درجہ[۲] دے چکا ہو، اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسا یگانۂ روزگار ادیب دانشِ پرداز اپنی علمی و ادبی و تاریخی مکاتبت و مراسلت کے لئے منتخب کر چکا ہو، اس کے متعلق مجھ جیسا بے بضاعت تہی مایہ انسان لکھے تو کیا لکھے، سب سے بڑھ کر جس چیز نے مجھے اب تک باز رکھا وہ سوانح نگاری کا مشکل ترین مرحلہ تھا۔ علی العموم ہوتا یہ ہے کہ ہر سوانح نگار صرف ایک پہلو ہی اپنے سامنے رکھ کر یہ فرض انجام دیتا ہے، حالانکہ محاسن کے ساتھ معائب، اور مناقب کے ساتھ مثالب ہر ہستی کے دامن سے وابستگی رکھتے ہیں، حضرات انبیاء کرام کی ذاتِ مقدسہ اس کلیہ سے ضرور مستثنیٰ ہیں۔ وہ خدا کی طرف سے معصومیت کا جامہ پہنکر خاکدانِ عالم میں تشریف لاتے ہیں، ان کے ہر قول و عمل کی تقلید موجبِ نجات وسببِ فلاح ہے، دوسرے انسانوں کی خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں پیروی و اتباع انھیں افعال و اعمال میں کیجا سکتی ہے جو اُسوۂ حسنہ کے مطابق ہوں، تو اب کسی شخصیت کو سامنے لانے کا مطلب یہی ہوا کہ اس کی خوبیوں کو موجودہ و آیندہ نسلیں نہ صرف سراہیں بلکہ خود بھی ان پر عمل کریں اور اس کی برائیوں سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی روکیں۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ ہر ملک و قوم میں ہر دور و زمانہ میں معدودے چند ہی ایسی ہستیاں عالمِ وجود میں آتی ہیں جو اپنے کردار و افعال، بلند حوصلگی و اولوالعزمی علم و دانش اور فضل و کمال میں ممتاز درجہ رکھتی ہوں، ان میں بھی ایسی ہستی جس نے دنیا میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا ہو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔

---

[۱] یہ مقالہ شروانی کلب علی گڑھ کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ (مدیر)

[۲] "اقبالنامہ" صفحہ ۵ و ۶ و ۸۔ خطوط بنام نواب صدر یار جنگ بہادر۔

ہمیں فخر ہے کہ ہندوستان کے دوسرے چند مخصوص خاندانوں کی طرح ہمارا شروانی خاندان بھی اپنی پرانی تاریخ، پرانی تہذیب، اور پرانی معاشرت و روایات رکھتا ہے۔ امتدادِ زمانہ کے باوجود اپنی دیرینہ خصوصیات کا کچھ نہ کچھ حامل ہے۔ خاندان کے افراد ہند و بیرونِ ہند کی تعلیم جدید کے ماہر ہیں، مگر کسی نے اپنے آبائی طریق اور مشرقی تہذیب کو اس وقت تک خیرباد نہیں کہا۔ آج بھی بکثرت افرادِ خاندان اپنے بزرگ خاندان کی وہی عزت کرتے ہیں جو اب سے ایک صدی قبل کی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم اسی طرح شرفائے قدیم کے طریق پر ہوتی ہے، مذہب کا پورا احترام اور شریعت کی پابندی بدستور ہے، طریقِ رہائش، لباس، آداب، اطوار سب پرانے طریق پر ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ اس بقاءِ خصوصیات میں نواب صدر یار جنگ بہادر کی ذاتِ گرامی کو بڑا دخل ہے، اگر یہ ہستی عرصۂ دراز سے آبیاری نہ کرتی ہوتی تو بادِ فیشن کے تند و تیز جھونکوں نے اس خاندانی سرسبز و شاداب چمن کو کب کا نذرِ خزاں کر دیا ہوتا۔

یہ خاندان ہندوستان میں کب سے آباد ہے، اس کی صحیح تاریخ تو ملنا مشکل ہے۔ البتہ لودھی سلاطین کے زمانہ میں اس خاندان کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ بہلول لودی سنہ ۸۵۵ھ میں بادشاہ بنا۔ اور سنہ ۸۹۴ھ میں وفات پائی۔ عمر خاں شروانی اسی کے زمانے میں با اقتدار تھے۔ بہلول کے بعد سکندر لودی کو تخت سلطنت پر عمر خاں نے ہی بٹھایا تھا اور پھر اس کے وزیر بھی ہوئے۔ عمر خاں شروانی کے علاوہ اعظم خاں شروانی، بابو خاں شروانی، ابراہیم خاں شروانی، جبار خاں شروانی، ہیبت خاں شروانی، احمد خاں شروانی، سعید خاں شروانی کا بھی تاریخ فرشتہ وغیرہ میں ذکر موجود ہے۔ لودیوں کے زمانہ میں اعظم ہمایوں سپہ سالار افواج کا لقب ہوا کرتا تھا۔ ابراہیم لودی کے عہد میں اعظم ہمایوں ایک شروانی ہی تھے۔ بابر نے شاہزادہ ہمایوں کے ولیعہد ہونے کے بعد اس لقب کو موقوف کیا تھا۔ اکبر کے عہد میں خان زماں خاں لودی حاکم جونپور کی شکست کے بعد میر محمد خاں شروانی جونپور کے صوبے دار مقرر ہوئے۔ علی گڑھ کا مشہور و معروف قلعہ جو اب مٹ کر محلہ بالائے قلعہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ عمر خاں شروانی وزیر سکندر لودی کے لڑکے محمد خاں شروانی نے سنہ ۱۵۲۵ء میں ابراہیم لودی کے زمانے میں تعمیر کرایا اور اپنے نام پر محمد گڑھ نام رکھا۔ اسی قلعہ کو نواب ثابت خاں نے (جنھوں نے موجودہ جامع مسجد علی گڑھ سنہ ۱۱۴۱ھ میں تعمیر کرائی ہے) سنہ ۱۷۱۵ء عہدِ فرخ سیر میں دوبارہ تعمیر و درستی کرا کے ثابت گڑھ

اپنے نام سے موسوم کر دیا۔ ۱۷۴۰ء و ۱۷۵۰ء کے درمیان میں سورج مل جاٹ نے آگرہ و کول پر قبضہ کر کے قلعہ ثابت گڑھ کو رام گڑھ بنا دیا۔ ۱۷۵۷ء میں نواب مرزا نجف خاں کے دورِ وزارت اور شجاع الدولہ کے عہدِ تسلط میں اس قلعہ رام گڑھ کو علی گڑھ کر دیا گیا۔ اور اب قلعہ کے بجائے شہر کا نام ہو گیا۔

شیر شاہ کی چیرہ دستی اور بنگال میں سلیمان خاں و داؤد خاں کے مقابلوں نے سلاطینِ مغلیہ کا طرزِ عمل شروانیوں کی طرف سے بدل دیا۔ شروانیوں نے مضافات کا رُخ کیا۔ عہدِ اکبری و شاہجہانی میں کچھ لوگ ضلع علی گڑھ و ایٹہ میں آ کر آباد ہوئے۔ سب سے پہلے بعہدِ اکبری ۹۶۳ھ ۱۵۹۶ء موضع رہچوئی میں آباد ہوئے، جو اب ویران کھیڑہ ہے متصل جنوبی موضع بہادر پور حال زمینداری ریاست بوڑہ گاؤں قریب نیم ندی، ندی سے غرباً واقع ہے۔ رہچوئی سے بھجوئی آئے۔ یہاں زمینداریاں پیدا کیں، کچھ لوگ پنجاب چلے گئے۔ ریاست مالیر کوٹلہ کے فرمانروا شروانی ہی ہیں، نواب والا جاہ کی رفاقت میں کچھ لوگ مدراس پہنچ گئے جن کا سلسلہ اب تک وہاں موجود ہے۔

سب سے پہلے ہندوستان میں تین حقیقی بھائی غلزئی، لودی، اور شروانی آئے تھے اور جب لودیوں کو سلطنت مل گئی تو شروانیوں کو بھی عروج ہوا۔ نواح علیگڑھ و ایٹہ میں آنے والوں میں محمد میر اور محمد مغیث دو[۲] بھائیوں کا نام معلوم ہو سکا ہے۔ محمد میر کی اولاد تاؤلی پردرہ وغیرہ جا کر رہی۔ محمد مغیث کے تین[۳] لڑکے ہوئے۔ سالار الدین، رکن الدین، بہاء الدین۔ سالار الدین کی اولاد بھموری، بھیکن پور، منڈولی، کنوبی، بھاموں، کناوہ، ڈھولنہ وغیرہ آباد ہوئی اور سار دھول کہلائی۔ سار دھولی سلسلہ میں بارہ[۱۲] گاؤں آتے ہیں۔

گہنونہ، بھرسولی وغیرہ میں بقیہ دونوں بھائیوں کی نسل کا سلسلہ جاری ہوا۔ موجودہ خاندانی دیہات میں بھموری اور کناوہ کو قدامت حاصل ہے۔ یہیں سے زمینداریوں پر شروانیوں نے قبضہ کیا ہے۔

یہ سلسلۂ کلام کہ قبضہ کب[۱] اور کیوں کر ہوا۔ لفظ شروانی[۲] صحیح ہے یا سروانی، شروانی[۳] کسی مورث کی طرف نسبت ہے یا شہر کی طرف، شروانی نسلاً پٹھان ہیں یا سید۔ اِن بحثوں کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔

مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی برلوی ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے "تاریخ خاندانِ شروانی" مکمل کرلی ہے۔ اس پر نظرِ ثانی کرنا باقی ہے۔ سُنّی وقف کمیٹی یو۔ پی کے سیکریٹری ہو جانے کی وجہ سے مشغولیت و مصروفیت بڑھ گئی ہے، اس لئے یہ کام معرضِ التوا میں پڑ گیا ہے۔ انشاء اللہ جلد کتاب کی صورت میں شائع ہوکر آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گی تفصیلی معلومات اس سے فراہم ہوسکیں گی۔

مختصراً یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس خاندان کا سلسلۂ نسب ملک طالوت سے جاکر ملتا ہے جنکا ذکر قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ پارہ ۲ سیقول۔ رکوع ۲۲

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

بخت نصر کی فلسطین و بابل پر فوج کشی کے موقع پر طالوتی نسل کو منتشر ہونا پڑا تھا۔ کچھ لوگ افغانستان آکر بھی آباد ہو گئے تھے۔ انھیں میں قیس ابن عیص بھی تھے جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار گہربار میں حاضر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوئے، اسلامی نام عبدالرشید رکھا گیا صاحب "حیاتِ افغانی" نے لکھا ہے کہ عبدالرشید کا عقد نکاح حضرت خالد بن ولید کی صاحبزادی سے ہوا۔ جن سے تین صاحبزادے متولد ہوئے سربن، غورغشت، بیھن، اس نسل میں۔ ہے سب سے پہلے ہندوستان میں تین حقیقی بھائی غلزئی، لودی، سروانی پہنچے۔ آخر الذکر کی طرف ہی اس خاندان کی نسبت ہے۔ کثرتِ استعمال سے سروانی کا شروانی ہوگیا۔ اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ افغانستان میں شروان قصبہ بھی ہے اور یہ کہ نواح قندھار میں ابتک اس خاندان کے افراد پائے جاتے ہیں۔

مضافات علیگڑھ و ایٹہ میں آکر آباد ہونے والے شروانیوں میں سب سے زیادہ نامور و قابلِ فخر ہستی محمد باز خاں رئیس بھیکم پور کی گزری ہے۔ آپ کی دوراندیشی، بہادری، تہوّر و تدبر نے خاندان کو موت کے گھاٹ اترنے سے بچایا۔ جاٹ گردی کے زمانے میں اس خاندان کو اپنا گھربار چھوڑ کر گنگا پار چلا جانا پڑا۔

مدت دراز کے بعد باز خاں صاحب اپنی حکمت عملی سے ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ انگریزی حکومت کے شروع دور میں علاقہ بائیں اور چوراسی کے اکثر دیہات کے مالک و نمبردار مستقل ہوئے، اس سے قبل اپنے ان دیہات پر عہد پرن صاحب فرانسیسی میں بصورت مستاجری قابض ہو چکے تھے۔

باز خاں صاحب کی سخاوت و شجاعت کے قصے مشہور ہیں، ان دو واقعات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف کیسی نیک نامی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔

ایک مرتبہ ایک سائل نے آکر موصوف کی سواری کا خاص گھوڑا مع سامان مرصع مانگا اُنھوں نے اس کی نذر کر دیا وہ چھوڑ کر یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بھیکن پور میں باز پیدا ہوا ہے صرف یہ دیکھنا تھا کہ واقعتہً باز ہی ہے، کوا تو نہیں ہے!

آخر عمر ۱۲۴۱ھ میں جب حج کے لئے مع قافلہ جانے لگے تو اجمیر شریف بھی حاضر ہوئے۔ راستہ بھر خیرات و مبرات کا سلسلہ رہا۔ آستانۂ غریب نوازؒ پر پہنچ کر میر فضل علی صاحب مرحوم خادم آستانۂ عالیہ کی وکالت میں قیام کیا۔ علاوہ نذرانہ کے خاص بھیکن پور میں پچاس بیگہ پختہ زمین مزار مبارک کے مصارف کے لئے بہ تولیت میر فضل علی صاحب وقف کر دی اور ایک تحریر لکھ کر میر صاحب کے حوالہ کی جو اُن کے خاندان میں سید محمد عظیم صاحب کے پاس اب بھی موجود ہے۔ حج کو جاتے ہوئے بڑودہ پہنچ کر آپ کی وفات ہوگئی۔ کچھ دن کے بعد میر فضل علی صاحب وہ تحریر لے کر بھیکن پور پہنچے۔ اخلافِ صدق اور وارثانِ حقیقی نعمان زماں خاں صاحب، حاجی داؤد خاں صاحب، حاجی غلام محمد خاں صاحب نے جب یہ وقف نامہ اور پدر بزرگوار کی تحریر دیکھی، سر آنکھوں پر رکھی، میر صاحب کو زمین کا معائنہ کرایا۔ میر صاحب نے انھیں حضرات کو مختار بنا کر سال بہ سال منافعہ لینا شروع کر دیا۔ اس زمین میں پختہ چاہ بھی تھا، جو اب نیل کی کوٹھی کے پاس واقعہ ہے۔ امتدادِ زمانہ سے اب صرف پچاس بیگہ خام زمین بجائے پختہ رہ گئی ہے۔ خدا اسے برقرار رکھے۔ تاکہ خاندانی سعادتوں میں سے ایک سعادت یہ بھی حاصل رہے۔ آستانۂ غریب نوازؒ سے اس خاندان کو جو والہانہ شغف رہا ہے اور اب بھی بحمداللہ ہے اس کا ثبوت زمانۂ عرس شریف میں اب بھی جا کر دیکھا جا سکتا ہے۔

باز خاں صاحب کی تعلیم و تربیت کا آپ نے اثر دیکھا کہ تینوں صاحبزادگان نے والد بزرگوار کی تحریر کو کس طرح بطیبِ خاطر عملی جامہ پہنایا۔ باز خاں صاحب کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حاجی محمد داؤد خاں صاحب

خاندان کے بزرگ ہوئے جو اپنی دینداری، فیاضی اور کنبہ پروری میں بہت مشہور تھے۔ ان کی صداقت و دیانت کا اس درجہ شہرہ تھا کہ لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرل ہند نے ان کو آگرہ کا صدرالصدور مقرر کیا۔ اس وقت ہندوستانیوں کے لئے یہ عہدہ معراج کمال تھا۔ کچھ عرصہ ملازمت کے بعد اس سے مستعفی ہو کر ۱۸۴۹ء میں ایک بڑے قافلہ کے ہمراہ منزل بمنزل سفر کر کے بیت اللہ شریف حاضر ہوئے جبتک ملازمت کی کسی مسلمان پر مسلمان کے سود کی ڈگری نہیں کی۔ جمعہ کے دن ہمیشہ بعد نماز جمعہ اجلاس پر تشریف لیجاتے تھے، آپ کے صاحبزادے محمد عنایت اللہ خانصاحب بڑے علم دوست تھے، سرسید کے خاص دوست اور مددگار رہے تھے، یونیورسٹی میں ان کی بہت یادگاریں موجود ہیں، یکی بارک کے اکثر کمروں پر آپ کے نام کے کتبے موجود ہیں، اسٹریچی ہال میں آپ کا کتبہ نصب ہے، دیوار احاطۂ یونیورسٹی پر بھی آپ کا نام نامی موجود ہے۔

یونیورسٹی کا سب سے بڑا کارآمد کنواں آپ ہی کا بنوایا ہوا ہے جس کی تاریخ بنا "حُفِرَ بِئرٌ مِن عنایت اللہ" ہے ایک نہایت خوبصورت فوارہ آپ کا عطا کردہ سوئمنگ باتھ میں قابل دید ہے۔ نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم نے انھیں عم بزرگوار کے ظل عاطفت میں پرورش پائی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ مسلم یونیورسٹی اور دوسرے اسلامی و قومی تعلیمی اداروں پر بے دریغ لاکھوں روپیہ صرف کیا۔

باز خاں صاحب کی نسل میں محمد عبدالشکور خاں صاحب عرف منجھلے خاں صاحب نے بھی بڑی عزت و شہرت حاصل کی، آپ کی داد و دہش اور مسافر نوازی نے بھیکن پور کو نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی مشہور کر دیا تھا۔ آپ کی "ٹھہرو" ابتک مشہور ہے۔ کوئی امیدوار ملازمت آجاتا تھا تو اس کے لئے ایک ہی حکم ہوتا کہ "ٹھہرو" جب تک اسے ملازمت یا انکاری جواب نہ ملتا دونوں وقت خوراک ملتی اور اہل وعیال کی بسراوقات کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ملتا رہتا۔ بعض امیدواروں کو سالوں ٹھہر کر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ غرباء و معذورین کو کئی من آٹے کے تندور یک کر تقسیم ہوتے۔ گویا صبح سے شام تک لنگر جاری رہتا۔

پیدائش و تربیت و تعلیم

یوں تو اس نسل میں ہر دور میں ایک سے بڑھ کر ایک جوہر قابل ہوتا رہا لیکن نواب صدر یار جنگ بہادر ڈاکٹر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

کی ذاتِ گرامی سب پر فوقیت لے گئی، باز خاں کا تہور و تدبر، داؤد خاں کی دیانت و صداقت، عنایت اللہ خاں کی علم دوستی و دوست نوازی، عبد الشکور خاں کی شفقت و سخاوت قدرت نے ایک ذات میں مجتمع کر کے ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری ۔ کا مصداق بنا دیا ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ ۲۸ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء دسمبر ۱۲۷۴ف اپنے آبائی قلعہ بھیکن پور میں بوقتِ صبح پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حاجی محمد تقی خاں صاحب اپنے عم زاد بھائی حاجی غلام احمد خاں پدر بزرگوار نواب بہادر سر محمد فضل اللہ خاں کی طرح کار و بار ریاست سے بے تعلق اور یادِ خدا میں مصروف رہتے۔

اپنی دلچسپی کے لئے آپ نے بھیکن پور سے چار فرلانگ کے فاصلہ پر جانب مشرق موضع کھلاؤلی میں بلند مقام پر گڑھی بنوائی، جس کا نام ہونہار بلند اقبال صاحبزادے کے نام پر حبیب گنج رکھا۔ جو اب سارے ہندوستان میں اسی نام سے مشہور ہے، گڑھی کے متصل ہی وسیع و عریض باغ لگایا۔ اس کے دیکھنے سے موصوف کے سلیقہ اور نفاست پسندی کا پتہ چلتا ہے، دو چار ضلعوں میں اس زیب و زینت اور شان و شوکت کا چمن نظر نہیں آتا۔ اس میں پہنچنے کے بعد انسان کچھ دیر کے لئے دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ روشوں پر دو رویہ رنگا رنگ پھولوں کے گملے گلاب و بیلا وغیرہ کے جدا جدا تختے کچھ عجب بہار پیدا کئے ہوئے ہیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خوش ذوقی نے اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔ اس چمن کے وسط میں پختہ تالاب اور اس کے کنارے پر خوبصورت بنگلیا دلکش مناظر پیش کرتے ہیں۔

حسب دستور شرفاءِ قدیم پانچویں سال میں آپ کی بسم اللہ ہوئی، حضرت مولانا عبد الغنی خاں صاحب مؤفرخ آبادی، استاذ العلماء حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڈھی، حضرت مولانا شیخ حسین عرب محدث بھوپالی، جیسے اکابر علماء واعاظم صلحاء سے کسب علم و استفادہ کا موقع ملا۔ انھیں بزرگوں کی توجہ اور دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ نصف صدی سے مشاہیرِ ہند کی پہلی صف میں آپ کا نامِ نامی نظر آتا ہے۔

انگریزی تعلیم بھی انٹرنس تک ہے، اُس دَور کا میٹرک پاس بلا مبالغہ اِس زمانہ کے بی۔ اے

اور ایم۔ اے پر ترجیح رکھتا ہے۔ پہلے حاجی عبدالرشید خاں مرحوم علیگ سے پھر سینٹ جانس کالجیٹ اسکول آگرہ میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ورزش اور کھیلوں میں ڈنڈ، مگدر، لکڑی، بنوٹ، شہسواری، تفنگ اندازی سے شوق رہا۔

ذوقِ ادب و مطالعۂ کتب

بچپن ہی سے مطالعۂ کتب اور شعر و سخن کا شوق رہا۔ مطالعۂ کتب کی وجہ سے کتابوں کے مہیا کرنے کا جذبہ پیدا ہوا جس نے بڑھ کر کتب خانہ کی شکل اختیار کر لی، اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر فرماتے ہیں، یہ ذوق بدستور باقی ہے۔ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی اور علامہ شبلی نعمانی سے مشورۂ سخن فرماتے رہے۔ حسرت تخلص فرماتے ہیں۔ اردو و فارسی کا علحدہ علحدہ ذخیرۂ کلام دیوان کی ترتیب پر حبیب گنج کتب خانہ میں موجود ہے، خدا کرے یہ ادبی جواہر پارے اشاعت پذیر ہو کر جلد از جلد ادبی لٹریچر میں قیمتی اضافہ کریں۔ موتی صدف سے نکل کر ہی قیمت و شہرت حاصل کرتا ہے، موتی صدف میں بھی موتی ہی رہتا ہے مگر نہ تو اپنی آب و تاب سے دنیا کو جگمگا سکتا ہے نہ دنیا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتی ہے۔

خان بہادر حاجی غلام محمد خانصاحب حافظی مرحوم رئیس دادوں و موہن پور کا اردو دیوان اور نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خانصاحب مرحوم کا فارسی دیوان نظر نواز ہو چکا ہے، امید ہے کہ دیوان حسرت بھی جلد شائع ہو کر ہمارے علمی و ادبی لٹریچر میں قیمتی اضافہ کا باعث ہوگا۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ مقالہ ایسی حالت میں تحریر کر رہا ہوں کہ میرے پاس کوئی مواد موجود نہیں ہے، وقت کی تنگی کا حال اچھی طرح اس جلسہ کے صدر عزیز گرامی محمد ریاض الرحمٰن خاں شروانی جانتے ہیں۔ یہ بطور واقعہ ہے کہ صرف دو راتیں مل سکی ہیں اور محض یادداشت پر واقعات لکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے فارسی و اردو کے دیوان ہوتے تو آپ حضرات کو کچھ اشعار سنا کر ان کی قدر و قیمت بتا سکتا۔ پھر بھی "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے مطابق دو چار اشعارِ فارسی پیش کرتا ہوں، خواجہ آصفی کی غزل پر ۱۹۰۱ء میں غزل لکھی تھی، آصفی کا مطلع یہ ہے ؎

زجام لعل تو مستم شراب را چہ کنم | خوشم بسوزِ دلِ خود کباب را چہ کنم

حسرت شروانی لکھتے ہیں :؎

زچشم مست تو مستم شراب را چہ کنم | زتاب حسن تو سوزم کباب را چہ کنم

حدیثِ دوست بگوشم رسد ز پردۂ دل　　حکایتِ نے و صوتِ رباب را چہ کنم
نہ کردہ جلوہ بتِ شوخ و یافتم دلِ دیں　　اگر بر افگند از رُخ نقاب را چہ کنم

ان اشعار پر میری نہیں علامہ شبلی جیسے فاضل روزگار اور ادیب جادونگار کی رائے سنئے، غزل حسب عادت ملاحظہ میں پیش کی گئی، حیدرآباد سے ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو تحریر فرمایا (یہ تحریر نواب صاحب کے پاس محفوظ ہے) خدا کی قسم غزل کی غزل مرصع ہے اور یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کا ہے۔ اگر بر افگند از رُخ الخ

یہ تو تھی علامہ کی رائے، ۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کے ایک طویل خط میں نواب صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ اشعار لکھے۔ اس سحر طراز خطیب اور یگانۂ زمانہ ادیب کی رائے بھی سُن لیجئے۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کے گرامی نامہ میں جواباً لکھتے ہیں :۔

"آپ کی غزل پر علامہ شبلی کی تحسین بڑی سے بڑی سند ہی، جو اس عہد میں مل سکتی ہے، یہ شعر کتنا رواں اور ڈھلا ہوا نکلا ہے ؎

حدیثِ دوست بگوشم رسد ز پردۂ دل　　حکایتِ نے و صوتِ رباب را چہ کنم

اور نقاب کے قافیے میں تو واقعی ردیف چیخ اُٹھی ہے — اگر بر افگند از رُخ نقاب را چہ کنم"

دونوں با کمال ہستیوں کی رائے میں پورے چالیس سال کا فصل ہے مگر اس بُعد زمانی سے قرب آرا میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ان دو مشاہیر ہند کی رائے آپ نے سن لی، اس سے کلام بلاغت نظام و فصاحت التیام کے محاسن کا اندازہ کر لیا ہوگا۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ حکومتِ متسلطہ کے جہاں اور "برکات" ہیں ایک "برکت" یہ بھی ہے کہ ہندوستانی عموماً اور مسلمان خصوصاً اپنی تہذیب و معاشرت اور مشرقی علوم سے بیگانے ہوتے جا رہے ہیں۔

اِس اجتماع میں جہاں خاندانِ شروانی کا تعلیم یافتہ طبقہ جمع ہے۔ کتنے ہیں جو ان صاف اور سادے اشعار کا ترجمہ کر کے مطلب بتا سکیں گے، اگر کچھ پُرانی صورتیں اس جگہ نظر نہ آتی ہوتیں (جو جدید اصطلاح میں تعلیم یافتہ تو نہیں کہی جا سکتیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اکثر و بیشتر جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد سے باوجود معمولی و سطحی تعلیم ہونے کے بھی فارسی زبان اور شعر و سخن سمجھنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں) تو فارسی اشعار لکھنا اور ان کے متعلق کچھ کہنا بھی لاحاصل ہوتا۔ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ہمارے نونہالوں میں مشرقی علوم کے حامل نہیں ہیں، ہیں اور ضرور ہیں، مگر وہی جن کے والدین و سرپرست حضرات ذی حس اور دور اندیش ہیں۔

مثال کے طور پر اس جلسہ کے صدر کو لے لیجئے، اپنے جدِ بزرگوار کی طرح آج نہیں تو کل مجمع البحرین نظر آئیں گے۔ اگر ایک طرف بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر رہے ہیں تو دوسری طرف ہدایہ و مشکوٰۃ شریف بھی زیرِ درس ہیں، فارسی کا ذوق ورثہ میں پایا ہی ہے۔

اگر یہی تعلیمی امتزاج باقی رہتا تو مغرب زدگی کی جو شکایت پیدا ہو چکی ہے وہ نہ ہوتی، اور وہ خاندان جس کی عربی و فارسی زبان میراث کا درجہ رکھتی تھی یوں ماتم کناں نہ ہوتی، میں نے میراث اس لئے لکھا کہ ملک عبدالرشید جدِ اعلیٰ تو افغانی تھے ہی جدۂ علیا بھی عربی نژاد تھیں، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ صاحبِ حیاتِ افغانی کی تحقیق کے مطابق حضرت خالد بن ولید کی صاحبزادی سے ملک عبدالرشید کی شادی ہوئی تھی۔ گویا عربی و فارسی زبان ترکۂ مادری و پدری ٹھہری۔ پھر جب دنیاوی میراث کو قبضہ کرنے کے بعد ایک بھائی دوسرے حقیقی بھائی کو بھی حصہ دینا نہیں چاہتا اور ناجائز قابض رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس سرمایۂ آخرت، میراث کو ضائع کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ان میں سے ایک زبان ہماری مذہبی زبان ہے، قرآن و حدیث کی زبان ہے۔ دوسری بلاواسطہ مذہبی تو نہیں مگر بالواسطہ مذہبی ضرور ہے۔ کیونکہ مذہبی اور دینی لٹریچر کا کافی حصہ اسی زبان میں ہے، پھر اس کی شیرینی و لطافت، نمکینی و نظافت بجائے خود کشش رکھتی ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

دو تین اشعار سامنے آگئے ہیں وہ اور سامعہ نواز کرتا چلوں، اوپر کے اشعار تو پورے ۴۰ سال پہلے کے لکھے ہوئے تھے، جبکہ سنِ مبارک ۴۵ سال تھا جسے یوں کہنا چاہئے کہ ع

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

یہ اشعار اسی سال کے ہیں جبکہ پیرانہ سالی اور ضعیفی کا دور ہے۔ ۸۰ سال کی عمر ہے، مگر بقول یگانہ ع

وہی شباب کی چہلیں، وہی شباب کا رنگ

اس میں بھی جھلک رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیل سے رہا ہو کر بحالیٔ صحت کے لئے کشمیر پہنچتے ہیں تو "اسیر آنا دجیب" کا دل ؎

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم   بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

کے مطابق تڑپ اُٹھتا ہے اور دل کی صدا کو صفحۂ کاغذ کے ذریعہ ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء کو کشمیر پہنچاتے ہیں، لکھتے ہیں:

محو نظارۂ گل مرغ نگاہے دارم — کز خیالش بہ دل زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بہ حضورش گزری — عرضہ دہ شوق کہ در جان فگارے دارم
در بہر سد کہ مگر شوق پیامے دارد — سر فرو دآرد زمن گوئے کہ آرے دارم

آخر میں صائب کا یہ شعر بھی تھوڑے سے تغیر کے ساتھ درج کر دیا ہے:

دور دستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت ست — ورنہ ہر نخلے بہ پائے خویش افشاند ثمر

اشعار مذکورہ سے شوقِ لقا، اخلاص وصفا پوری فصاحت وبلاغت کے ساتھ کیسے والہانہ انداز میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اُردو اشعار کا اندازہ "قیاس کن زگلستان من بہار مرا" کے طور پر خود لگا لیجئے۔ افسوس ہے کہ میرے سامنے کچھ اشعار نہیں ورنہ بطور نمونہ نذر ورپیش کرتا، یہ فارسی کے چھ اشعار بھی خطوط کے فائل میں نکل آئے اس لئے درج کر دئے گئے۔

ساتھ ہی ساتھ نثر کا نمونہ بھی ملاحظہ فرماتے چلئے ایک خط میں جو وسط ستمبر ۱۹۴۸ء کو لکھا گیا تحریر فرماتے ہیں۔

"خلوص سدا بہار ہے۔ اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمتِ ابدی ہے۔"

ان فصیح وبلیغ دو جملوں کے متعلق خود کچھ لکھنے کے بجائے جی چاہتا ہے کہ مولانا آزاد ہی کی برجستہ عبارت نقل کر دوں۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کے خط میں جواباً لکھتے ہیں:۔

"آپ نے ایک بات کیا خوب لکھی ہے کہ۔۔ خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔۔۔ کیا کہوں اس جملے نے دل پر کیا اثر کیا۔ اس کلمۂ حق کی شرح میرے دلِ دردمند سے پوچھئے۔ اکاون برس کی عمر ہو چکی۔ چند ماہ بعد باون برس پورے ہو جائیں گے۔ گویا انگریزی محاورہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاسویں کے دانگ مائل میں پوری طرح آ چکا۔ عام طور پر لوگوں کی ہوش وآگہی کا زمانہ بیس بائیس برس کے بعد شروع ہوتا ہے، مبدءِ فیاض کی بخشش خاص نے تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں اس مرحلہ سے گزار دیا تھا۔ اس طرح گویا ایک کم چالیس برس ہوش وآگہی کے گزر چکے۔ اس چالیس برس کے اندر کار فرمائے غیب کی دستگیریوں نے صدیوں کی مسافتیں طے کرائیں، صورت ومعنی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جس سے طلب نے تغافل اور آگہی نے پہلو تہی کی ہو، اور فکر وعمل کی شاید ہی کوئی بلندی

دلچسپی ہوگی جس کی پیمائش میں قدم نے کوتاہی اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو، لیکن اگر آپ پوچھیں کہ مدۃ العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا ہاتھ آیا! تو بلا تامل کہوں گا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہ دی۔ ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی، اس لئے کسی نہ کسی مقصد کی لگن ضرور رہنی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ و تمتعات ہیچ ہیں، حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ نہیں، ہاں اگر بیشِ حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اس میں ہے کہ دو دلوں میں اخلاص و محبت ہو، جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں، زندگی کا حاصل اور عیش دنیا کا سرمایہ ہے۔

ہر آں کو خاطر مجموع و یارِ نازنیں دارد | سعادت ہمدم او گشت و دولت ہم قریں دارد

حبیب کے دو جملوں نے آزاد کے قلم سے کیسی غیر فانی و لاثانی عبارت نکلوا دی، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

کتب خانہ علم و ادب کے ذوق نے کتب خانہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ حبیب گنج میں ایک مستقل وسیع عمارت کتب خانہ کے لئے علیحدہ ہے۔ اس وقت سات ہزار کتابیں ہیں۔ تعداد کتب کے اعتبار سے تو کتاب خانہ کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ البتہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان میں اپنا جواب آپ ہے۔

مخطوطات میں بعض ایسے نادرات بھی ہیں جو سوائے حبیب گنج کے اس وقت تک کی تحقیقات کے مطابق ساری دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ انھیں میں سے "مونس الاحرار" کتاب بھی ہے جو صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے، شعراءِ فارسی کے تذکرہ میں ہے۔

اس کتاب خانہ کی کتابیں برلن (جرمنی) اور بغداد وغیرہ مقابلہ کے لئے جاتی رہتی ہیں، خدا کا شکر ہے کہ یہاں کا نسخہ بہتر ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے فہرست کتب نہیں ورنہ نادرات اور حامل خصوصیات نسخے پیش کرکے ان کے متعلق کچھ لکھتا۔

کتب خانہ کے نوادر میں محی الدین اورنگ زیب بادشاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کا خنجر بھی ہے جسے "ظفر تکیہ" کہا جاتا ہے اس کی سند بھی کتاب خانہ میں موجود ہے۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے نوادر ہیں، خدا کے فضل سے ان میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ اس کتاب خانہ سے متعلق مہمان خانہ بھی ہے۔ اکثر ہندوستان اور بیرونِ ہند کے محقق آ آکر تحقیقات کرتے ہیں۔ دنوں بلکہ مہینوں رہتے ہیں۔ ان کی آسائش و آرام کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔

۱۲۹۹ھ کا اخبار "اسلام میرٹھ" کا فائل بھی مجلد ہو کر کتب خانہ میں موجود ہے جس پر جابجا موصوف کے نوٹ بھی ہیں۔ اس اخبار کی تاریخ اجراء "مظہر اسلام" ۱۲۹۹ھ ہے۔

شادیاں اور اولاد آپ کی پہلی شادی ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۱۰ھ میں عم بزرگ حاجی محمد عبدالشکور خانصاحب کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے تین۳ صاحبزادے اور دو۲ صاحبزادیاں ہوئیں۔ جن میں سے تین۳ خدا کے فضل سے بقید حیات اور صاحبِ اولاد ہیں۔ دوسری شادی محمد عابد خانصاحب شروانی مرحوم رئیس بھیکن پور کی ہمشیرہ سے ۳۰ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ کو ہوئی یہ جلد داغ مفارقت دے گئیں، ان سے صرف ایک صاحبزادے ہوئے۔

تیسری شادی استادِ مرحوم مولانا عبدالغنی خاں صاحب مؤفرخ آبادی کی صاحبزادی نفیس دلہن صاحبہ سے ۲۸ شعبان ۱۳۲۱ھ کو ہوئی جو خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں اور اپنی علمی و ادبی قابلیت کی بنا پر طبقۂ نسواں میں ایک مخصوص امتیازی جگہ کی مالک ہیں، علمی و ادبی مضامین معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں، آپ سے سلسلۂ توالد جاری نہوا۔

بڑی صاحبزادی، خانصاحب چودھری احمداللہ خانصاحب رئیس سہاور ضلع ایٹہ اور چھوٹی خانبہادر حاجی مولوی محمد مونس خانصاحب شروانی رئیس دتاؤلی ضلع علیگڑھ سے منسوب ہیں، دونوں ماشاءاللہ کثیرالاولاد ہیں۔

بڑے صاحبزادے خان بہادر حاجی محمد عبیدالرحمٰن خانصاحب شروانی ایم۔ ایل۔ اے۔ ٹریژرر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ہیں جن کی خوش خلقی و بذلہ سنجی کی تعریف ہے، انتظام ریاست حبیب گنج بھی زمانۂ دراز سے آپ ہی کے سپرد ہے، ہر کام ذمہ داری اور محنت سے کرتے ہیں، آج کا کام کل پر چھوڑنے کی بہت کم عادت ہے۔

چھوٹے صاحبزادے مولوی مسعودالرحمٰن خانصاحب شروانی ہیں، حضرت مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم و مغفور کے شاگرد ہیں، تقریر شستہ اور جوش و خروش سے کرتے ہیں، خانبہادر صاحب کے دو۲ صاحبزادے اور دو۲ صاحبزادیاں ہیں، چاروں ناکتخدا ہیں، دونوں صاحبزادے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں زیر تعلیم ہیں، بڑے کا نام ریاض الرحمٰن خاں اور چھوٹے کا محبّ الرحمٰن خاں ہے۔

یہ پورا خاندان مشرقی تہذیب و معاشرت کے سلسلے میں ایک نمونہ ہے، بڑے کا سختی کے ساتھ لحاظ لباس و وضع میں قدیم روش، نماز و جماعت کی حتی المقدور پابندی، اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

اخلاق وعادات آپ کے اخلاق وعادات کے بارے میں جی چاہتا ہے کہ صرف یہ شعر لکھ کر چھوڑ دوں۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

جاکر ملئے جی خوش ہو جائے۔ بزرگوں کی حکایتیں، اسلاف کی داستانیں، صحابۂ کرام کے حالات، اسوۂ حسنہ کی تعلیمات، لسان الغیب حافظ کے دیوان کے اشعار، یہی مجلس کی گفتگوئیں اور یہی محفل کی باتیں۔

مجھے سال بھر تک کتاب خانہ میں کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ کبھی کسی کو تعظیم کے لئے کھڑا ہونے دیا! اکثر و بیشتر سلام میں تقدیم کرتے، کوئی ملنے پہنچتا ہے تو اس کی خیریت، گھر کی خیریت، دوسرے حالات دریافت کرتے ہیں، مفید مشورے بھی دیتے ہیں۔ بہرحال جب آدمی مجلس سے اٹھ کر جاتا ہی تو یہ حسرت ضرور ساتھ لے کر جاتا ہے کہ کاش کچھ دیر گفتگو کا موقع اور ملتا۔

عقیدہ وبیعت عقیدہ کے اعتبار سے سنی حنفی ہیں، حتے المقدور سنت پر عامل اور بدعات سے مجتنب رہتے ہیں، نماز پنجگانہ جماعت سے مسجد میں ادا کرتے ہیں۔ حضرت شاہ مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت وارادت ہی۔ آپ کے پیرو مرشد بڑے پایہ کے بزرگ اور قطبِ وقت تھے، علم و فضل میں بھی یگانہ تھے۔

مضمون نگاری وتصانیف عنفوانِ شباب ہی سے فطری صلاحیتوں کی وجہ سے ملک کے مشہور معیاری اخبارات و رسائل میں مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں مولوی غلام محمد خاں تپش کے اخبار "مشیر قیصر لکھنؤ" سے ابتدا ہوئی، مسٹر بلنٹ کی کتاب "فیوچر آف اسلام" (مستقبل اسلام) مترجمہ لسان العصر اکبر الہ آبادی پر تبصرہ شائع ہوا۔ اسی طرح "الندوہ" "اودھ اخبار"۔ "آزاد"۔ "دلگداز لکھنؤ"۔ "شحنہ اخبار آگرہ"۔ "البشیر اٹاوہ"۔ "سرمور گزٹ ناہن"۔ "اکمل الاخبار" "نظام المشائخ دہلی"۔ "انسٹی ٹیوٹ گزٹ"۔ "معارف"۔ "علیگڑھ میگزین"۔ "خاتون"۔ "اردوئے معلیٰ علیگڑھ"۔ "مخزن لاہور"۔ "زمانہ کانپور"۔ "معارف اعظم"۔ "اردو اورنگ آباد" وغیرہ میں مسلسل مضامین شائع ہوتے رہے۔

"رسالہ حسن امرتسر" میں ۹۲-۱۸۹۱ء میں شاہ بابر پر مضمون شائع ہونے پر اشرفی کا انعام بھی حاصل کیا۔ اب "معارف اعظم گڑھ" اور "مصنف علیگڑھ" جیسے معیاری رسائل میں کبھی کبھی رشحاتِ قلم شائع

ہوتے رہتے ہیں۔

عرصہ تک "الندوہ لکھنؤ" کے ایڈیٹر رہے اور "کانفرنس گزٹ علیگڑھ" کے زمانۂ دراز سے مستقل نگراں ہیں۔

تقریباً دو درجن تصانیف ہیں، جن میں علمائے سلف اور نابینا علماء بڑی کامیاب کوشش ہے۔ ملک میں ان دونوں کا پورے طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ تقریباً سب تصانیف دو دو مرتبہ شائع ہو چکی ہیں۔ اہلِ علم اور قدر داں حضرات کو مفت عنایت فرماتے ہیں۔ باہر بھیجنے میں مصارفِ ڈاک بھی خود برداشت کرتے ہیں۔

مضمون نگاری کا شوق انگریزی کے استاد حاجی عبدالرشید خاں علیگ مرحوم کی بہتر تعلیم و تربیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اردوئے معلیٰ اور گلزارِ داغ سے مطالعہ کی ابتدا ہوئی۔

علمی و تعلیمی خدمات

بیسیوں علمی و تعلیمی اداروں کے نہ صرف رکن و سرپرست رہے اور ہیں بلکہ دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح حصہ بھی لیا ہے، جس کی شہادت ان اداروں کی روداد یں دیتی ہیں۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ[1]، الٰہ آباد یونیورسٹی[2]، یو۔پی ہسٹاریکل سوسائٹی[3]، انجمن ترقی اردو[4]، مسلم گرلز کالج علیگڑھ[5]، وقف کرنال[6]، وقف دادوں[7]، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ[8]، انجمن حمایت اسلام[9] لاہور، طبیہ کالج دہلی[10]، دار المصنفین اعظم گڑھ[11]، ندوۃ العلماء لکھنؤ[12]، دار العلوم دیوبند[13]، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس[14] علیگڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد[15]، دائرۃ المعارف حیدرآباد[16]، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد[17]، مجلس اشاعت علوم[18] و فنون حیدرآباد، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ[19]، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد[20]۔

جہاں تک میرے حافظے اور معلومات نے کام کیا یہ وہ ہندوستان کے مشہور و معروف ادارے ہیں جن سے نواب صدر یار جنگ بہادر کا قدیمی تعلق ہے۔ رکن و ممبر تو ہر ادارہ کے پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں اکثر اداروں کے صدر و سکریٹری بھی رہے ہیں، جامعہ عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں ندوۃ العلماء کے جوائنٹ سکریٹری، بزمانہ محسن الملک محمڈن کالج کے ٹرسٹی، کمیٹی تعلیم دینیات اہل السنۃ والجماعۃ کے سیکریٹری بھی رہے ہیں، سنہ ۱۹۲۰ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس امراؤتی (برار) میں سکریٹری منتخب ہوئے۔ اِس وقت بھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری، دار المصنفین اعظم گڑھ کے صدر، وقف کرنال کے ناظم اعلیٰ ہیں۔

ان اداروں کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے سے
کیسی کیسی اہم خدمات انجام دلائی ہیں ؎

لیسَ لِلّٰہِ بمستنکرٍ   اَنْ یَجمعَ العالمَ فی واحدٍ

حقیقت یہ ہے کہ خاندانِ شروانی میں ایسی جامع صفات ہستی آج تک پیدا نہ ہوسکی اور نہ آئندہ ہی
کوئی توقع ہے۔ ہمارا سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ مشاہیرِ ہند کی صفِ اوّل میں نواب
صدر یار جنگ کا نامِ نامی جلی حرفوں میں نظر آرہا ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم نے صرف رئیس کی حیثیت سے ہی دیکھا اور برتا، کاش وہ اس
نوعیت سے دیکھتی جس کے وہ مستحق تھے۔ انھیں خدماتِ علمی کو دیکھکر مسلم یونیورسٹی نے سنہ ۴۳ء میں دینیات
کی اعلیٰ اعزازی ڈگری عطا کی۔ اور اب نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لفظ بھی شامل ہوچکا ہے۔

شروانی اسکول چھرّہ کے ۹ سال تک سکریٹری رہے۔ اس اسکول نے کیسے کیسے نامور افراد پیدا کئے۔
شروانی برادران کو کون نہیں جانتا ہندوستان کے اُفق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ نہ صرف ہندوستان
بلکہ بیرونِ ہند بھی شروانیوں کو روشناس کیا، اس خاندان کا ہر فرد آج اپنے آپ کو شروانی کہنے اور لکھنے
میں اس لئے فخر محسوس کرتا ہے کہ ان میں کا ایک فرد تصدق احمد خاں شروانی بھی تھا۔ جو شروانی نہیں ہے
وہ بھی دل سے چاہتا ہے کہ نام کے آگے یہ نسبت تو کسی طرح لگ ہی جائے۔

انتظامِ ریاست

۲۴ ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۸ جون سنہ ۱۹۰۵ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر کے والد ماجد
حاجی محمد تقی خانصاحب نے رحلت فرمائی۔ دو سال بعد عم بزرگوار محمد عبدالشکور خانصاحب
نے بھی ۲ جمادی الآخر سنہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اب تک جائداد
مشترک ہی تھی، منجھلے خانصاحب ہی انتظام و انصرام فرماتے تھے۔ اُن کے بعد ظاہر ہے کہ اس بار کو آپ ہی
اُٹھا سکتے تھے، چنانچہ کچھ دن تک یہ فرض انجام دیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۳۱۹ف میں ریاست تقسیم ہوئی اور اپنے
حصے پر قابض و متصرف ہوئے۔ والد ماجد کے انتقال کے تین ہفتے بعد ہی گڑھی سے باہر ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ
کو مسجد کی بنیاد قائم کی گئی جس کی تعمیر کا سلسلہ پورے بیس سال جاری رہا۔ مسجد اپنی خوشنمائی،
خوبصورتی، نظافت و لطافت میں اپنی نظیر آپ ہے اور اپنے بانی کی خوش ذوقی کا ثبوت
دے رہی ہے۔

قیامِ حیدرآباد

نواب فضیلت جنگ کی رحلت کے بعد صدارتِ امارتِ شرعیہ حیدرآباد کے لئے سرکار نظام کی نگاہِ انتخاب اُس وقت کے مولوی حبیب الرحمٰن خاں پر پڑی، اس عہدہ کے لئے ایسے فاضل کی ضرورت تھی جو سیر چشم، بے لوث، نڈر، اُصولِ قضائے سے واقف، صاحبِ علم باعمل و باتدبیر ہو، ان صفات کا حامل آپ کے سوا اور دوسرا کون کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مئی ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۶ھ میں حیدرآباد جا کر صدر الصدور بنے اور جو اعزاز آپ کے دادا حاجی محمد داؤد خاں نے لارڈ بینٹنگ وائسرائے ہند کے زمانے میں حاصل کیا تھا وہی وراثتہً میر عثمان علی خاں آصفجاہ سابع کی سلطنتِ حیدرآباد سے آپ کو بھی ملا۔ اور ۱۲ سال تک مسلسل خدماتِ شرعی و اسلامی بڑے دبدبہ اور قابلیت کے ساتھ انجام دیں ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو سبکدوشی ہوئی۔ ۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء "نواب صدر یار جنگ بہادر" کا خطاب سرکار نظام کی طرف سے ملا۔

حیدرآباد کے اکثر علمی و تعلیمی اداروں کے صدر بنے۔ جاہل قاضیوں اور نااہل میلاد خوانوں کی بڑی سختی سے اصلاح کی۔ خود مجھ سے ایک بار فرمایا کہ قاضیوں کی یہ حالت تھی کہ صحیح طور پر ایجاب و قبول نہیں کرا سکتے تھے، جب مسائلِ نکاح میں امتحان لیا گیا تو کورے نکلے۔ جاہل میلاد خوانوں کا یہ عالم تھا کہ رات بھر گانے گا گا کر اور جھوٹی روایتیں سُنا سُنا کر وقت ضائع کرتے۔ "تاڑی کا دور" چلتا رہتا۔ بڑی انتھک کوشش کے بعد صحیح ذوق مسلمانوں میں پیدا کیا، محافلِ میلاد کے طریقے بتائے، سیکڑوں مقاموں پر مجالس میں اُسوۂ حسنہ پر تقریریں کیں، لوگوں کو طرزِ عمل سے اَدبِ ذکرِ میلاد مبارک اور طریقۂ انعقادِ مجلس پاک بتایا۔ جزاک اللہ خیر الجزاء۔

اعزا و احباب کو ساتھ لے کر بصرفِ کثیر ۱۳۴۴ھ میں فریضۂ حج ادا کیا، حجاز و ممالکِ اسلامیہ کے علماء و صلحائے سے ملاقاتیں ہوئیں، علمی مجالس میں شرکت رہی۔

نظام الاوقات

انسان و حیوان میں دوسرے فرقوں کے ساتھ پابندیٔ اوقات کا بھی فرق ہوا کرتا ہے۔ اگر اوقات کی پابندی نہ ہو تو انسان و حیوان میں فرق ہی کیا رہجاتا ہے۔ جانور کے چلنے پھرنے اُٹھنے، بیٹھنے، سونے، جاگنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہو سکتا۔ اِسے کھانے، گوبر، بیٹ، پیشاب کرنے کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔ بخلاف انسان کے اس پر کچھ ذمہ داریاں ہیں، اسے رات میں آرام بھی کرنا ہے۔ تاکہ صبح کو تازہ دم ہو کر کام پر جا سکے۔ اُسے اہل و عیال کی خبر گیری کرنا ہے اس لئے سویرے اُٹھنا ہے تاکہ

کام پر جانے سے پہلے ضروری اشیاء فراہم کردے، اور پھر مسلمان کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھی ہوئی ہیں، اسے اگر ایک طرف مخلوق سے واسطہ رکھتا ہے تو دوسری طرف خالق سے علاقہ کی بھی ضرورت ہے۔

اگر ایک جانب اہل و عیال کی خبر گیری ضروری ہے تو دوسری جانب عبادتِ مولیٰ بھی فرض ہے، حدیث شریف میں آتا ہے الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر (دنیا مسلمان کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے) جس طرح قید خانہ میں قدم قدم پر پابندیاں ہوتی ہیں۔ کھانا ہو تو گھنٹی پر، قضاءِ حاجت گھنٹی پر، سونا گھنٹی پر، باہر نکلنا گھنٹی پر، اسی طرح اسلام کی طرف سے مسلمان پر پابندیاں ہیں، اور ہر عبادت و طاعت کے لئے اوقات مقرر ہیں۔

اس ضعیفی اور پیرانہ سالی کے باوجود نظام الاوقات کی مستقل پابندی قابلِ ستائش و لائقِ داد ہے۔ کسی دعوت یا جلسہ میں وقت مقررہ سے دس پانچ منٹ قبل ہی پہنچتے ہیں، حتی الامکان کبھی وقت سے تاخیر نہیں کرتے۔

آخر شب میں اٹھ کر تہجد ادا فرماتے ہیں۔ اس کے بعد اوراد و وظائف کا سلسلہ صبح تک رہتا ہے۔ فجر کی نماز باجماعت مسجد میں ادا کرکے کچھ دیر ٹہل کر وظیفہ پڑھتے ہیں۔ مسجد سے واپسی پر باغ میں جاکر ٹہلتے ہیں۔ باغ سے واپسی پر ناشتہ سارے متعلقین کے ساتھ کرتے ہیں، اس درمیان میں گھوڑوں کو دانہ بھی سامنے کھلواتے ہیں۔ کووں کی خاصی تعداد جمع ہو جاتی ہے، ان کو باسی روٹی ڈالی جاتی ہے۔

کوئی ملاقات کیلئے آجاتا ہے تو ناشتہ کے بعد ایک گھنٹہ تک ملاقاتوں کا سلسلہ رہتا ہے۔ اس کے بعد کتب خانہ تشریف لیجاتے ہیں، وہاں ڈھائی تین گھنٹے تحریر و مطالعہ میں صرف ہوتے ہیں، ریاستی کام یا کتب خانہ سے غیر متعلق کام وہاں نہیں کرتے۔ اگر کوئی غیر متعلق معاملہ پہنچ جاتا ہے تو ناخوشی کا باعث ہوتا ہے اور بنا کام بگڑ جاتا ہے۔ کبھی کتب خانہ جانے سے قبل اور کبھی بعد حویلی بھی جاتے ہیں۔ کتب خانہ سے واپسی پر کچہری کرتے ہیں جس میں ریاستی معاملات طے ہوتے ہیں۔ اس کرسی پر وہ پہنچ کر وہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نہیں ہوتے بلکہ رئیس اعظم حبیب گنج ہوتے ہیں، جو اجنبی شخص کتاب خانہ میں ایک منکسر مزاج متواضع انسان سے مل کر آیا تھا اب کچہری میں آکر وہ یہ محسوس ہی نہیں کرسکتا کہ یہ وہی ذاتِ گرامی تھی جس سے ابھی مل چکا ہوں۔ اس کرسی پر الناس علیٰ دینِ ملوکھم کا پورا مظاہرہ ہوتا ہے۔ حکومتِ متسلطہ کے رائج نظام کی مجبوراً آپ کو بھی پیروی کرنا پڑتی ہے۔

کچہری سے فارغ ہو کر کھانا تناول فرماکر قیلولہ فرماتے ہیں۔ اس کے بعد نمازِ ظہر مسجد میں ادا کرکے تلاوت

قرآنِ پاک کرتے ہیں۔ تلاوت کے بعد چائے نوشی اور مطالعۂ ڈاک، پھر نمازِ عصر اس کے بعد کچہری، پھر حویلی جاکر باغ میں مغرب تک نشست رہتی ہے۔ مغرب کی نماز ادا کرکے ہم جلیسوں کی صحبت گرم ہوتی ہے، پھر کھانا تناول کرکے نمازِ عشاء ادا ہوتی ہے۔ عشاء کے بعد پھر کچھ دیر کے لئے محفل جمتی ہے جس میں دیوانِ حافظ کے اشعار کا دَور یا کوئی دوسرا علمی مکالمہ رہتا ہے۔ اس کے بعد آخر شب تک استراحت۔

خیرات و مبرّات

مدارس و مزارات، یتامیٰ و بیوگان، مسافران و مساکین اور بضرورت مند طالبانِ علم پر ایک معتد بہ رقم صَرف فرماتے ہیں، مسافروں کو خوراک ملتی ہے اور صبح کی نماز کے بعد مسجد سے نکل کر ہر مسافر کو حسب صوابدید کچھ رقم دے کر رخصت کرتے ہیں، اس کے لئے ایک مخصوص رقم مؤذن مسجد کے پاس ہر وقت رہتی ہے۔ حیدرآباد سے جو سات سَو روپیہ پنشن کے آتے ہیں وہ مقررہ مصارفِ خیر پر ہر ماہ روانہ کر دئے جاتے ہیں۔ مقامی طور پر سپاہی کے ذریعہ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ آپ نے اسی سال اپنی ساری جائداد وقف علی الاولاد کر دی ہے۔ اس میں بارہ فی صدی مصارفِ خیر اور پانچ فی صدی مصارفِ کتاب خانہ کے لئے وقف کر کے زادِ آخرت مہیّا کر لیا ہے۔

غرض آپ کی ذاتِ گرامی خاندان اور ملک و ملّت کے لئے باعثِ فخر و قابلِ تقلید ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کا سایۂ عاطفت ہم سب کے سروں پر قائم رکھے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۞

عبد الشّاہد خاں شروانی

تضمین بر غزل

علیا حضرت ہر ہائی نس نفعت زمانی بیگم صاحبہ ملکۂ تاجدار رام پور دام اقبالہا

(از جناب مولوی سراج الحق صاحب قریشی بی۔اے علیگ)

جب نہ کہیے کہ ماجرا کیا ہے — چارہ سازوں کی پھر خطا کیا ہے
کون سمجھے کہ مدعا کیا ہے — ایسے بیمار کی دوا کیا ہے
جو بتاتا نہیں ہوا کیا ہے

گھٹ کے مرجاؤں آشیانہ میں — یا کٹے عمر قید خانہ میں
فائدہ حالِ دل جتانے میں؟ — کون سنتا ہے اِس زمانہ میں
کِس سے کہیے کہ التجا کیا ہے

حال کہنے پہ جب ہم آتے ہیں — درد اور ضعف قہر ڈھاتے ہیں
دل جگر اپنے کانپ جاتے ہیں — لبِ بیمار تھر تھراتے ہیں
جھک کے سُنیے کہ مدعا کیا ہے

یہ تماشہ کہیں بھی ہوتا ہے — کہ تماشائی جان کھوتا ہے
پہروں منہ آنسوؤں سے دھوتا ہے — مجھ کو جو دیکھتا ہے روتا ہے
کوئی کیا جانے ماجرا کیا ہے

دہر میں سینکڑوں ہیں اہلِ جفا — تم سا بے درد ہم نے کم دیکھا
زخم و دل وہی کا ذکر ہی کیا — درد پر دوسروں کے ہنس دینا
یہ بھی اچھا ہے تو برا کیا ہے

جھوٹ سے ہے سراج کو نفرت — بات جو سچ ہے اُس میں کیا حجت
کم ہیں ایسے جہاں میں خوش قسمت — فخرِ "نسوانِ ہند" ہیں عصمت
"اُن" سے پوچھے کوئی وفا کیا ہے

"منتخب سعید" کا باب دوم

(مترجمہ شاہ محمد ہاشمی عطا صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

اکتوبر ۱۹۴۵ء کے "معنف" میں کتاب کا تعارف ہو چکا ہے اور خاندان کی تاریخ بھی حضرت شاہ مہدی عطا صاحب قدس سرہٗ کے بیان کی صورت میں سامنے آ چکی ہے۔ فارسی خطوط کے ترجمہ کے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں:۔

ہر زمانہ کا ماحول جدا ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر اس عہد کے علم و فن اور انشا پردازی پر خاص طور پہ پڑتا ہے۔ عہد مغلیہ کے آخری دور کی انشا پردازی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اکثر مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھنے کی دھن میں معانی اور مطالب کا بہت کم خیال رہتا ہے۔ عبارت کو ہم قافیہ کرنے کے لئے ترکی اور سنسکرت کے الفاظ جا بجا استعمال میں آ جاتے ہیں۔ القاب و آداب کا سلسلہ غیر متناہی ہوتا ہے۔ غالب کو مرزا قتیل سے اس قسم کی بہت سی شکایتیں ہیں۔ مرزا قتیل کے خطوط آگے آئیں گے اور ان میں یہ باتیں بدرجۂ اتم ملیں گی۔ ان خطوط کا ترجمہ بامحاورہ اردو میں کرنا یا تحت اللفظ لکھنا بدذوقی ہوگی۔ لہٰذا اصل فارسی خطوط نقل کرنے کے بعد اس کا مفہوم اردو میں لکھا جاتا ہے۔ ان تمام خطوط میں مکتوب الیہ خاندان کرپی کے سجادہ نشین پنجم حضرت شاہ بناہ عطا صاحب قدس سرہٗ ہیں۔ البتہ چند خطوط ان کے والد محترم اور بعض ان کے صاحبزادے کے نام ہیں ایسے موقع پر ذیلی عبارت میں اشارہ کر دیا گیا ہے:۔

ابوالنصر معین الدین محمد اکبر (ثانی)[۱] کے خطوط

ترجمہ	خطوط
آداب دعا کے بعد	(۱) سالک مسالک طریقت واقف مواقف حقیقت زبدۂ
برادر بجان برابر میرزا محمد سکندر شکوہ کے	مقربان درگاہ الٰہی رموز دان معارف نامتناہی پیوستہ در
خط سے آپ کی بزرگی اور اوصاف بتفصیل	یادِ معبود حقیقی باشند۔ از نوشتہ اہلیت سرشتۂ برادر بجان

[۱] اکبر ثانی شاہ عالم بادشاہ کا لڑکا تھا۔ سکندر شکوہ اور سلیمان شکوہ اس کے بھائی تھے۔ بہادر شاہ ظفر اکبر ثانی ہی کے بیٹے تھے۔

خطوط

برابر مجد الدولہ میرزا محمد سکندر شکوہ بہادر تعلی و ترقی آں مہر سپہر کرامت بر اوصاف حمیدہ و کمال بلاغت مشروحا بپیرایۂ وضوح پوشیدہ۔ مستحسن ضمیر بیضا نظیر اقدس شد۔

لازمکہ روابط[۱] ما تقدم خاندانی مستحکم دانستہ درآوان خاص و زمان سعادت اختصاص برائے صحت و سلامت ذات تقدس آیات ما بدولت و تازگی و سرسبزی ریاض ہمیشہ بہار ایں سلطنت ابد پائدار بجناب رب العزت بادعیہ وافیہ شاغل بودہ ما بدولت را مشتاق و بیاد خود دانند۔ و مدام بترسیل مکاتبات خیریت آیات محبت سمات مسرور و شاد دارند۔ والسلام

ترجمہ

معلوم ہوئے بیحد مسرت ہوئی۔

آپ کو چاہیئے کہ پُرانے خاندانی تعلقات کو استوار رکھیں۔ خاص اوقات میں اپنی صحت و سلامتی کے لئے دعا کا طالب ہوں۔

امید کہ اس سلطنت کی پائداری اور عرصہ تک قیام کے لئے آپ خدا سے دُعا کرتے رہیں گے۔

مجھے اپنا مشتاق سمجھئے اور ہمیشہ خیریت کے خطوط بھیج کر مسرور فرماتے رہیئے۔

خطوط

(۲) مکاتبہ مرسلہ آں سالک مسالک طریقت کہ مظہر افضال الٰہی و مورد فیوض نامتناہی اند رسید۔ و مضمون بہجت مشحون آں مکشوف رای بیضا ضیا گردید۔

اکثر اوقات مزاج کرامت امتزاج والا بسبب کبر سن و ضعف قوی منحرف میباشد الحمد للہ و المنۃ کہ الحال مزاج وہاج ما بدولت و اقبال قرین اعتدال و مستوجب شکر و سپاس قادر متعال است بست عدد تعویذ کہ برائے دفع عارضہ بواسیر بحضور پرنور فرستادہ بودند بسیار بروقت لطف ساختند۔

ترجمہ

آپ کا مرسلہ خط ملا۔ مضمون مندرجہ سے مسرت ہوئی۔

بکبر سنی کے سبب اکثر میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔

مگر الحمد للہ کہ آج کل بخیریت ہوں۔

بیس عدد بواسیر کی تعویذیں جو میرے والد (شاہ عالم) کو بھیجی گئی تھیں بہت موقع سے کام آئیں۔

. . . .

---

[۱] خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ پیر محمد سلونی قدس سرہٗ کے زمانہ سے یہ تعلقات شروع ہوئے تھے۔ حضرت اورنگ زیبؒ اور اُن کے جانشینوں سے برابر تعلقات رہے۔ پُرانی اسناد اور خطوط سے ان روابط کا تفصیلی پتہ چلتا ہے۔

خطوط

ارادهٔ ما بدولت روانه فرمودن ایلچی بخدمت والد ماجد آں
واقف مواقف حقیقت بود مستلزم کہ پیوستہ مکاتیب
خیریت اسالیب خود بہ بارگاه گردوں اشتباه میفرستاده
باشند۔ اگرچہ ما بدولت در یاد آں سالک مسلک طریقت
مدام میباشیم لازمکہ ایشاں ہم بوقت خاص مشغول باید ماند
کہ تقویت اسلام و رونق بہار سلطنت و انتظام از دعوات
زاکیات درویشانِ عالیشان متصور است۔

والسلام

ترجمہ

آپ کے والد ماجد (حضرت شاہ کریم عطا صاحب)
کی خدمت میں میرا ارادہ ایلچی بھیجنے کا ہے۔
آپ کو چاہئے کہ خیریت کے خطوط کے ساتھ
تعویذ ارسال فرمائیں۔
میں ہمیشہ آپ کی یاد میں رہتا ہوں امید کہ
آپ بھی خاص اوقات میں میرے لئے دعا
فرماتے رہیں گے کیونکہ بزرگوں کی دعاؤں ہی سے
اسلام کی تقویت اور اس سلطنت کے استقلال
و انتظام کا قیام ہے۔

مکتوب شاہزادہ عالیقدر انجم گروه مرزا محمد[1] سلیمان شکوه بہادر

(۱) حقائق و معارف آگاه، فضائل و کمالات دستگاه قدوة العرفاء
پیر محمد شاہ عطا صاحب کریمی اشرفی اوطعنی دام کمالہ، ہموارہ در کنف و عنایت
ایزدی مصروف عبادات باشند بعد سلام و شوق کہ از تحریر و تقریر
مافوق است مطالعہ نمایند کہ بمیامن[2] انفاس متبرکہ اہل اللہ بصحت
و عافیت قرین حال است و مژدهٔ خیریتہائے آں حقائق آگاه
از خالق الارض والسماء پیوستہ استدعا است۔

. . . .
. . . .
. . . .
عرض ہے کہ:۔
خدا رسیدہ بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے بخیریت ہوں۔
اور آپ کی خیریت کا خدا سے ہمیشہ مستدعی۔

---

[1] شاہ عالم بادشاہ دہلی کے بڑے علم دوست اور ہنرپرور شاہزادے تھے ۱۷۸۸ء میں جب غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں، یہ کسی بہانے بڑی بے سروسامانی کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے رامپور اور پھر لکھنؤ پہونچے۔ ان کی زندگی بڑی پُرحسرت گزری ۱۸۳۷ء ۱۲۵۳ھ میں انتقال ہوا۔ اور سکندرہ مقبرۂ اکبر میں دفن ہوئے۔ تفصیلی حالات کے لئے "گلِ رعنا" صفحہ ۲۶۴ تا ۲۶۷ (فٹ نوٹس) مطبوعہ دارالمصنفین طبع ثانی ملاحظہ ہو۔

[2] میامن جمع ہے میمنہ کی۔ میمنہ کے معنی برکت کے ہیں۔

خطوط	ترجمہ
باستماع اوصاف جلیلہ وخصائل جمیلہ وتوجہ باطنی وظاہری آں منظہر کمال، سرور موفور وتقویت نامحصور لاحق حال داشت۔	آپکے اوصاف جلیلہ اور خصائل جمیلہ نیز آپکی ظاہری و باطنی توجہ کا حال سنکر بڑی مسرت اور تقویت ہوئی۔
الحق کہ محبت ووفاق ایں سلسلۂ عالیہ باں دودمان متبرکہ بالاتفاق مشہور آفاق است، رجاء واثق از حسن اخلاق وصفائے باطنی آں برگزیدۂ عرفاء علی الاطلاق آنست کہ ہمیشہ نیازمندی ایں نیاز مند درگاہ بے نیاز از خلوص باطن بخدمت اہل اللہ خصوصاً باں عارف باللہ تصور نمودہ۔ بدعائے خیر یاد آور باشند۔ زیادہ اشتیاق۔	یہ حقیقت ہے کہ میرے اور آپکے خاندانی تعلقات بہت مشہور ہیں۔ آپ جیسے برگزیدۂ عرفاء کے حسن اخلاق اور خلوص سے اُمید قوی ہے کہ مجھے ہمیشہ بزرگوں کا خصوصاً اپنا نیاز مند تصور کریں گے۔ اور دعائے خیر سے یاد فرماتے رہیں گے۔
السلام علیکم وقلبی لدیکم۔	

شاہزادہ سکندر شکوہ کے خطوط

خطوط	ترجمہ
(۱) واقفِ اسرار رب العالمین۔ سالک مسالک حق ویقین۔ نہالِ باغ مجد واعتلا ونیّر برج فقر وغنا، دام اُمور وعنایاتِ الٰہی ومصدر تفضلات نامتناہی باشند مفاوضہ عاطفت آمودہ مع چہار شیشہ گلاب موصول مطالعہ گردید۔ واز رائحہ عنبر بیز گلاب ناب مشام جان راطراوتِ تازہ وتازگی بے اندازہ بہم رسید۔	.... بعد آداب و دعا کے ملاحظہ ہو کہ آپ کا خط مع چار بوتل عرق گلاب باعث مسرت ہوا۔ ....
از آنجاکہ دعوتِ اجابت سمات آں سالک مسالک حق ویقین ودرحق ما بدولت باعث رفاہ وفلاح کافہ مسلمین وآسائش جمیع عباد اللہ است۔ لازمہ باوقات برکت آیات فرایاد ضمیر آئینہ اسرار تقدیر دارند۔ درباره استحصال شقہ حضور پرنور حضرت ظل سبحانی دامت سلطنتہ کہ ایمار فتہ بود۔ درآں ایام بسبب روبکاری شادی مرشدزادہائے آفاق ملازمان	آپ کی دعاؤں سے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود ہے۔ امید کہ خاص اوقات میں دعا فرماتے رہیں گے۔ والد ماجد (شاہ عالم) سے خط حاصل کرنے کے متعلق آپنے اشارہ فرمایا تھا مگر اُن دنوں میرے بھائیوں کی شادی کے سبب

خطوط

جناب کرامت مآب حضرت خلیفۃ الزماں را فرصت نبود — ازیں باعث در صدور شقۂ خاص توقف و تعویق گشتہ۔ الحال لائق العنایت والاحسان، فدوی خاص الخاص محتشم الدولہ امیر الملک شجاعت علیخاں بہادر تہور جنگ را بحضور پر نور والا بنا بر بعضے امور روانہ ساختہ بودم، چنانچہ شقۂ شوقیہ فدوی خاص حاصل کردہ آورد۔ ملفوف رقیمۃ الشوق میرسد و بایں نیازمند درگاہِ الٰہی حضرت ظلِ سبحانی ارقام فرمودہ اند کہ بدریافت کمالات ظاہری و باطنی شاہ صاحب کہ خاصۂ خاندان اشرفی است مابدولت را اشتیاق است۔ اگر رہ گزر محبت و اخلاص متوجہ شاہجہاں آباد[۱] شوند اقتباس انوار صحبت فیض برکت حاصل کردہ آید۔ لازمکہ آں واقف اسرار رب العالمین بطریق سیر ارخائے عنان عزیمت بآنصوب بعمل آرند کہ مراتب ضیافت و مہمانداری بوجہ احسن بتقدیم رسانیدہ آید و پیوستہ بتحریر نامجات منبسط دارند۔ زیادہ سلام و شوق

جواب

عنایت نامہ تفقد شمامہ مع شقۂ خاص کرامت اختصاص

ترجمہ

حضور کو فرصت نہ تھی — اسی باعث مراسلۂ خاص کے ارسال میں تاخیر ہوئی۔ فی الحال امیر الملک شجاعت علیخاں بہادر کو میں نے بعض ملکی اُمور کی بنا پر حضور کے پاس روانہ کیا تھا۔ چنانچہ آپ کے نام مکتوب خاص حاصل کرلیا ہے۔ اور اِس خط کے ہمراہ بھیج رہا ہوں۔ ہاں مجھے والد ماجد نے تحریر فرمایا ہے کہ انھیں آپ کے خاندانی خصوصیات کی بنا پر آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ اگر محبت اور خلوص کی بنا پر آپ دہلی تشریف لائیں تو آپ کی صحبت فیض برکت سے مستفیض ہوں۔ امید کہ آپ بطور سیر و تفریح اس طرف تشریف لائیں گے تاکہ مراتب ضیافت و مہمانداری عمدہ طور پر پورے ہوسکیں۔ ہمیشہ اپنی خیریت کے خطوط سے مسرور و شاد رکھئے۔

—×—

. . . .

---

[۱] اسی قسم کا ایک خط حضرت اورنگ زیب رح نے خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ پیر محمد سلونی قدس سرہٗ کو لکھا تھا جس کا جواب بھی اسی جواب کے مثل ہے۔ دراصل شاہ نعمت اللہ صاحب نے ایسے موقع پر اپنے جد امجد ہی کی اتباع کی ہے۔ عالمگیر رح کے خط کا جواب درج ذیل ہے:—

"محبا! فقیر را ایں حوصلہ نماند۔ دہقانی را در مجلس سلطانی چہ کار۔ کریمے دارم کہ اگر گرسنہ می شوم مہمانی میکند و اگر می خسپم پاسبانی میکند و اگر گناہے میکنم مہربانی میکند۔ اگر گاہ گاہے کسے از راہے می آید در کریم ما باز است و کریم ما بے نیاز۔ واللہ بس۔ باقی ہوس۔"

خطوط

حضرت قدر قدرت ظلِ سبحانی ؎

لا زالت آفتابِ اجلالہ ساطعۃ

وشموس افضالہ مضیئۃ لامعۃ

کہ بکمال الطاف خسروانہ و عنایات قدیمانہ شاہانہ در جواب
رقیمۃ الدعا حاصل ساختہ لطف فرمودند چراغ خانہ ورود گردید۔
بدریافت مژدۂ بشاشت و اعتدال مزاج اقدس و اعلیٰ
مسرور و مشکور فرمود۔ استدعائے فقیر حسب الحکم محکم حضرت
ظلِ سبحانی کہ چکیدہ انامل باغت شمائل منشیان توانائے
خاقانی عطارد نشان شدہ۔

حق تعالیٰ بایں یادآوری و داعی پرسی دیرگاہ سلامت
و خوش وقت و نیر سلطنت را بر سپہر خلافت و فرمانروائی
تابندہ دارد۔ بادشاہا دیں پناہا پیدا و ہویدا است کہ
فقیر دہقانی اصلاً سلیقہ و لیاقت صحبت و محفلِ سلطانی
ندارد و بر عتبۂ اشرفیہ کریمیہ بدعاہائے نیم شبی و مناجاتِ
سحرگاہی گوہر شاہوار مژدہ صحت ذات قدسی صفات
و ترقیات عمر و دولت ابد سمات در بازارِ قناعت خریدار
است و دریں صورت توقع اندار و کہ درہمیں خدمت مامور
داشتہ و با جماعت فقراء و علماء خمس الاوقات
بدعائے جاں درازی و مقہوریت اعداء کہ عبادت محض است
متصور فرمودہ۔ بعد و رعنایت نامجات شفقت آیات
خیریت دلالات عذب البیان شکر خوانیہا فرمودہ
باشند ؎

ترجمہ

. . . .

. . . .

. . . .

آپ کے خط کے ساتھ آپ کے والد ماجد
کا خاص خط موصول ہوکر موجب لطف و
مسرت ہوا۔ آپ کی خیریت مزاج معلوم کرکر
بڑی مسرت ہوئی۔

حضرت ظلِ سبحانی کا خط جو ایسے منشیوں کے
ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو ثانیٔ خاقانی ہیں، اُس کے
حکم کے مطابق میری یہ استدعا ہے کہ خدا اس
یادآوری اور اس دُعا گو کے پوچھنے کے
صلہ میں آپ کو سلامت اور آپ کی سلطنت
کو پائندہ رکھے۔ آپ پر یہ امر ظاہر ہونا چاہئے
یہ دیہاتی فقیر ہرگز ہرگز شاہی صحبت و محفل
کے قابل نہیں ہے۔ اور اپنی نیم شبی دعاؤں،
نیز مناجاتِ سحر سے بازار قناعت میں آپ
کی صحت اور ترقی کا خواستگار ہے۔ ایسی صورت
میں امید ہے کہ اسی خدمت پر مجھے آپ مامور رکھیں۔
اور یہ تصور فرمائیں کہ پنج وقتہ علماء اور فقراء کی
جماعت کے ساتھ آپ کی طولِ عمر اور آپ کے
دشمنوں کی مغلوب ساری کے لئے دست بدعا
رہتا ہوں۔ نیز اپنی خیریت کے خطوط سے

ترجمہ	خطوط
مسرور فرماتے رہیں ؎	گرد دماغ کہ از کوئے یار بر خیزد
گرد دماغ کہ از کوئے یار بر خیزد	نشستہ ایم کہ از ما غبار بر خیزد
نشستہ ایم کہ از ما غبار بر خیزد	آفتاب حشمت و اقبال از مطلع جاہ و جلال طالع
....	ولامع باد بحرمتہ النون والصاد۔
....	الشوق ثم الشوق
——×——	باقی آئندہ

علمائے اکبر آباد

اور

اُن کے علمی کارنامے

(از جناب مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی)

اکبر آباد آج علمی اعتبار سے ایک اُجڑی ہوئی بستی ہے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ یہ مقام بہت بڑا علمی مرکز تھا اور بغداد و قرطبہ کے ہم پایہ ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ لودھی سلاطین کے چشم و چراغ سکندر نے آگرہ کو شہری شکل میں تبدیل کیا۔ قلیل عرصہ میں حیرت انگیز ترقی ہوئی، دلّی و فیروز آباد سے بڑھکر سیاسی و علمی مرکز بن گیا۔ عرب، ایران، بخارا، دلّی بلکہ تمام ہندے اہلِ علم اور صاحبِ ہنر عزت و دولت کی تمنا میں آگرہ آبسے اور سکندری دربار میں حسب مراتب جگہ پائی۔ سکندر خود ذوقِ سلیم رکھتا تھا۔ جہانِ کمال کا مُربّی اور اہلِ علم کا سرپرست بنا۔ خود بھی ادیب تھا، فکرِ شعر سے دل بستگی تھی۔ گلرخ تخلص تھا، شیخ جمال الدین مصنف "سیر العارفین" سے مشورۂ سخن کیا۔ آٹھ۔ نو ہزار اشعار کا دیوان یادگار چھوڑا۔ کہتا ہے ؎

در سوزنِ مژگاں بکشم رشتۂ جاں را
تا چاک بدوزم کہ دراں پیرہنِ ہستش

مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی ایم اے، فاضل ازہر "مرقع افغان" میں رقم طراز ہیں :۔

"سکندر کے دربارِ علم کے درخشندہ ستارے مولانا شاہ رفیع الدین آنجوی۔ محدث میاں قادر بن شیخ راجو۔ عبد العباس میاں الہ آبادی۔ سید محمد بن سعید خاں۔ ملا قطب الدین۔ ملا الہ داد صالح۔ سید میاں۔ سید برہان۔ سید احسن۔ صدر الدین قنوجی۔ عبد الرحمٰن فتح پور سیکری۔ اور میاں عزیز اللہ سنبھلوی سے مشاہیر اسند تھے۔"

عبد اللہ مؤرخ کا بیان ہے :۔

"سلطان علما کی مجلس میں خود پائین میں بیٹھتا اور علمی گفتگو میں شریک ہوتا۔ مجلس کے خاتمہ پر علما کے ساتھ کھانا کھاتا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ علما کی اُس عہد میں کیا قدر و منزلت تھی۔ سکندر نے آگرہ میں پہلا تصنیف و تالیف کا محکمہ قائم کیا جس کا خود نگراں تھا۔ "واقعاتِ ثنائی" میں ہے :۔

"میاں بدھو کو خواص خاں کا خطاب دے کر دار الترجمہ کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔ خواص خاں کے ساتھ مختلف زبانوں کے علما اور خوشنویسوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ خراسان کے مشاہیر اطبا کو بلوا کر علم طب پر بہترین کتاب لکھوائی۔ ہندی طب کے نسخوں کے ایک دفتر کا ترجمہ فارسی میں کرا کر اس کا نام "طبِ سکندری" رکھا گیا۔"

فارسی زبان کو بڑی ترقی دی۔ ہندو بھی فارسی سے دلچسپی لینے لگے حتّٰی کہ فکرِ سخن کرنے لگے، پنڈت ڈونگرمل مشہور و معروف تھے۔ کہتے ہیں : ؎

دل خوں نشدے چشمِ تو خنجر نشدے گر
رہ گم نشدے زُلفِ تو ابتر نشدے گر

زمانہ نے رنگ بدلا آخری شمع سلاطینِ لودھی بابر کے ہاتھوں پانی پت کے میدان میں گُل ہوئی۔ آگرہ شاہ بابر کے تصرف میں آیا، لودھیوں کی شان و شوکت ایک آنکھ نہ بھائی تو جمنا پار اپنا مستقر ٹھہرایا، باغ نور افشاں تعمیر ہوا، اور دگر محلات بنے دوسرا شہر آباد ہوا بابری مسجد آج بھی اُس عہد

کی یادگار ہے۔ بابر وہ فردِ محترم تھا جس نے شاہانِ مغلیہ کے عظمت و جلال کی بنیاد ڈالی، بقول نواب صدر یار جنگ بہادر ڈاکٹر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی :۔

"شاہ بابر کے ادبی مذاق اور نقادانہ تبحر نے اسے اعلیٰ علمی مدارج پر پہونچا دیا۔ اس کی تصنیف "تزکِ بابری" نے علم ادب و تاریخ کے بادشاہوں میں بھی ممتاز درجہ منوالیا"

صاحب "تاریخ رشیدی" لکھتے ہیں :۔

"بابر شجاعت و عدالت و انصاف کے علاوہ صدہا مختلف اوصاف سے آراستہ تھا، ترکی زبان کی شاعری میں امیر علی شیر کے علاوہ کوئی اس سے بازی نہ لے جا سکا اور اس زبان میں اُس نے ایک فصیح و بلیغ دیوان چھوڑا۔ وہ نثر کے ایک طرز متین کا موجد ہے اور علم اُصولِ قانون پر مفید رسالہ لکھا۔ رسالہ "ولیدیہ" کو نہایت صاف شُستہ زبان میں نظم کیا۔"

بابر فقہ حنفی کا ماہر اور فن انشاء و املا پر کافی قدرت رکھتا تھا۔ عربی، فارسی، ترکی السنہ کا عالم تھا۔ علامہ ابوالفضل اکبر آبادی کا بیان ہے :۔

"فارسی میں ایک مثنوی لکھی جو عام طور پر مقبول ہوئی، وہ خوشنویس ایسا تھا کہ ایک رسم الخط ایجاد کیا جو "خطِ بابری" کے نام سے مشہور ہے۔ علما کا قدر دان تھا۔ علم ادب کے اُن بے شمار روشن سیاروں میں جو ہمیشہ بابر کے فلک رفعت دربار میں جگمگاتے رہے ہیں۔ مولانا شہاب الدین معمائی حیقری، مولانا یوسف طبیب خراسانی، شیخ ابوعبدالصمد، مرزا ابراہیم ہراتی۔ شیخ زین صدر، مولانا بقائی اور خواجہ نظام الدین علی خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔

غازی خاں افغان جس نے باہر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی اس کا ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا وہ بابر نے معائنہ کیا اور علم فقہ اور تصوف کی چند کتب اس میں سے ہمایوں اور کامران کو تحفہ میں بھیجیں۔"

"اکبر نامہ" میں ہے :۔

"آنحضرت در فنون موسیقی نیز دستگاہ والا داشتند و ہم چنیں بزبان فارسی نیز اشعار دلپذیر دارند ازاں جملہ ایں رُباعی از واردات طبع فیاض آں حضرت است ؎

درویشاں را اگرچہ از خویشاں نیم | لیک از دل و جاں معتقد ایشانیم
دور است مگوئے شاہی از درویشی | شاہیم و لے بندۂ درویشانیم"

شاہ بابر کا پوتا جلال الدین اکبر سریر آرائے حکومت ہوا آگرہ اس کا مستقر ٹھہرا، خود عالم نہ تھا مگر علم کا شوق ضرور تھا، دربار میں علما، شعرا، صناع، کسی طبقہ کے کیوں نہ ہوں ہر ایک کی قدردانی کی جاتی تھی۔ علوم وفنون کا سرپرست بنا۔ علمی قدر افزائی نے صدہا ارباب فن وکمال کو خاکِ احتیاج سے اٹھا کر عروج خوشحالی تک پہونچایا۔ یہی شہرت تھی جس سے نزدیک و دور سے علما، فضلائے عہد اور صاحب کمال ہندوستان کھنچ آئے۔ اور آگرہ میں آبسے۔

ملا شیخ مبارک ناگوری جس نے امام رازی کی تفسیر کے مقابلہ میں تفسیر نفائس العلوم چار جلدوں میں مرتب کی۔ علامہ میر فتح اللہ شیرازی شاگرد غیاث الحکما۔ منہج الصادقین تفسیر اُس کی یادگار رہے ہے۔ قاضی نور اللہ شریف الحسینی الشوستری تفسیر بیضاوی پر مبسوط ان کا حاشیہ ہے۔ علامہ ابوالفیض فیضی کی تفسیر بے نقط سواطع الالہام کے نام سے مشہور ہے۔ لطف یہ ہے کہ تمام لوازم تفسیر قرآن شان نزول آیات، تحقیق لغوی، ترکیب نحوی، لطائف علم بیان، اور قصص واحکام وغیرہ کو مدنظر رکھا ہے۔ محدثین میں ملا اسمٰعیل عرب دانشمند، شیخ حمید احمد آبادی، شیخ فرید بنگالی، شیخ آدم شہابی دانشمند گوپاموی، ملا عبدالقادر بدایونی نے کتاب الاحادیث فارسی میں مرتب کی۔ فقہا میں شیخ بہاءالدین فقیہی آگرہ۔ ملا بایزید لاہوری، شیخ ابوالفتح مفتی آگرہ، ملا اسمٰعیل لاہوری، ملا جمال خاں سے فضلائے روزگار دربار اکبری سے منسلک تھے۔

اکبر کے زمانہ میں جس قدر علما، ہندوستان میں تھے اُن کی مثال سلاطین ماضیہ کے عہد میں نظر نہیں آتی، علمی چہل پہل کا ہی نتیجہ تھا کہ شہر تو شہر قصبات میں تعلیم عام تھی، سرکاری مدرسے جاری تھے جن سے بکثرت علما، اور فضلا پیدا ہونے لگے۔

آگرہ میں ایک عالیشان سرکاری مدرسہ تھا، فتح پور سیکری میں مدرسہ ابوالفضل تھا جس کی عمارت کے آثار آج بھی ہیں۔ مولانا علاءالدین لاری جنھوں نے شرح عقائد نسفی پر حاشیہ لکھا ہے انکا آگرہ میں ایک مدرسہ تھا "مدرسۂ حسن" اس کی تاریخ ہے۔ محلہ ہشت بہشت میں حضرت سید رفیع الدین محدث اکبر آبادی کا مدرسہ تھا جہاں مفتی ابوالفتح تھانیسری معقول ومنقول کا درس دیا کرتے تھے۔ یہیں پہلا دارالحدیث قائم ہوا تھا۔ علوم فلسفہ کی پہلی درسگاہ میر فتح اللہ شیرازی نے آگرہ میں قائم کی۔ امیر مرتضیٰ شریفی نبیرۂ سید شریف جرجانی، ملا شیخ حسین بغدادی، ملا حسن موصلی، ملا اُویس گوالیاری، ملا شاہ محمد شاہ آبادی

یہ لوگ علوم عقلیات کے بڑے عالم فاضل تھے۔ انھیں سے ہندوستان میں منطق و فلسفہ کی اشاعت ہوئی۔

اکبر اعظم نے سنسکرت جو مردہ زبان تھی اس سے دل بستگی کا اظہار کیا، عربی و فارسی کی کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کرائیں، نایاب نسخے سرکاری کتب خانہ کے لئے جمع کرائے جو جہانگیر کے زمانہ میں جے پور کے کتب خانہ کے لئے چلے گئے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی "اکبر کو سنسکرت کی کتابوں سے جو شغف تھا وہ عام طور سے مشہور ہے"۔ گنگا دھر مہیش اور مہانند کی مدد سے ملا شیری نے سنسکرت کی کتاب کا ترجمہ فارسی میں کیا، ابوالفضل نے "زیچ جدید مرزائی" نام رکھا۔ مہابھارت کا ترجمہ نقیب خاں، مولانا عبدالقادر بدایونی کی زیر نگرانی سنسکرت سے فارسی میں کیا گیا۔ نام اس کا "رزم نامہ" رکھا۔ محمد خاں گجراتی نے (نجوم ہندی) تاجک کو فارسی قالب پہنایا۔ غرضکہ صدہا کتب کے ترجمے کئے گئے۔

میر جمال الدین حسین انجو چار ہزاری ماہانہ کے جاگیر دار تھے، اکبر نے فارسی لغت مرتب کرانیکا انتظام ان کے سپرد کیا جو جہانگیر کے عہد میں تکمیل کو پہونچی۔ دارالترجمہ قائم ہوا جہاں میر فتح اللہ شیرازی، شیخ فیضی، شیخ بہاون، حاجی ابراہیم، ملا عبدالقادر بدایونی، عبدالرحیم خانخاناں، حکیم ہمام علامی، ابوالفضل ملا شیری وغیرہ سے حضرات منسلک تھے اس کے علاوہ اکبر کو ہندی زبان سے بھی دلچسپی تھی۔ فارسی شعراء کی طرح ہندی شعراء کو انعام اور صلے دے کر حوصلے بڑھائے۔ منوہر داس دربار کا مشہور شاعر تھا، راجہ بیربل کو کوی رائے (ملک الشعراء) کا خطاب دیا، عبدالرحیم خانخانان خود ہندی میں فکر کرتا تھا اور ایسا قدردان تھا کہ ایک ہندی نظم پر گنگا پرشاد کو چھتیس لاکھ روپیہ کا انعام دیا، "رحیم ست سوئی" خود کی تصنیف یادگار زمانہ سے ہے۔ اکبر کے بعد شاہ جہانگیر کا دور آیا، وہ باپ کے نقش قدم پر چلا۔ اس کی علمی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی، نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتا تھا۔ تزک جہانگیری اس کی تحریری قابلیت کا بین ثبوت ہے، عربی فارسی کے علاوہ ترکی زبان سے بھی خوب واقف تھا، خود تزک میں لکھتا ہے:۔

"باوجود آنکہ در ہندوستان نشوونما یافتہ ام ولیکن در گفتن و نوشتن بزبان ترکی عاجز نیستم"

اس کے علمی مذاق سے ارباب علم کی شاہانہ قدرو منزلت ہوئی جس سے صاحبان کمال اس کے دربار میں آ جمع ہوئے۔ ملا احمد بہائے تبریزی، ملا شکر اللہ شیرازی، میر ابوالقاسم گیلانی، ملا باقر کاشمیری، ملا محمد سیستانی، ملا فاضل کابلی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا عبداللطیف سلطان پوری، ملا حسن مراغی،

ملا محمود جونپوری، مفتی محمد عیسیٰ محدث گوپاموی، حکیم صدرا الملقب مسیح الزماں، حکیم مومنائی شیرازی، حکیم حامد گجراتی۔ غرضکہ عالم، مفسر، محدث، فلسفی، مصور، نقاش، شاعر، ہر نوع کے باکمال اساتذہ اس کے دربار سے منسلک تھے۔ جو شاہانہ انعام و اکرام سے نوازے جاتے۔

عہدِ اکبری میں عضد الدولہ میر جمال الدین حسن انجوی نے لغت موسومہ بہ فرہنگِ جہانگیری مرتب کرنا شروع کی تھی، اس کی تکمیل جہانگیر کے عہد میں ہوئی، جس کے متعلق تزک میں ہے:۔

"فرہنگے کہ در لغت ترتیب دادہ بہ نظر در آورد الحق بسیار محنت کشیدہ۔"

سید محمد نبیرہ حضرت شاہ عالم گجراتی سے جہانگیر نے فارسی میں کلام مجید کا ترجمہ کرایا۔ غرضکہ جملہ علوم و فنون مروجہ کی ترقی و اشاعت کی طرف جہانگیر کو خاص توجہ تھی۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی سخن فہمی اور نکتہ سنجی میں خاص ملکہ تھا۔ عبد الرحیم خانخاناں نے جامی کے مصرع ذیل پر غزل کہی۔ ع

بہر یک گل منتِ صد خار می باید کشید

جہانگیر نے غزل سُنکر فی البدیہہ اس زمین میں یہ شعر موزوں کیا ؎

جام مے را بر رُخ گلزار می باید کشید
ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

جہانگیر کے بعد شاہجہاں نے زمامِ حکومت سنبھالی۔ باپ دادا کی طرح علوم و فنون کی سرپرستی کی۔ اربابِ فن و کمال کی طویل فہرستیں اُس عہد کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ اُس عہد کے نامور و مشاہیر علما، ہیں قاضی صدر الدین ہرگامی، مفتی عبید اللہ گوپاموی، ملا قطب الدین سہالوی، شیخ نور الحق محدث دہلوی، شیخ عبد الرشید جونپوری، ملا عصمت اللہ سہارنپوری، قاضی محمد سعید، سید محمد قنوجی، ان میں سے اکثر علماء کو بیش قرار وظائف دربار سے دیئے جاتے تھے۔ علمائے اسلام ہی کی صرف قدر نہ تھی دوسری قوم کے اہلِ علم کی بھی منزلت حسب مراتب تھی۔

ہرناتھ ایک فاضل پنڈت تھا، دو ہزار روپے سالانہ وظیفہ پاتا تھا اور خطاب "مہا پاتر" سے موصوف تھا۔ ۱۰۴۹ھ میں دربار شاہی کے انعقاد پر خلعت و اسپ اور فیل کے علاوہ ایک لاکھ دام ہرناتھ کو مرحمت ہوئے۔ شاہ جہاں کو علم ہیئت سے خاص دلچسپی تھی، ملا محمود جونپوری صاحبِ شمس بازغہ کو حکم دیا کہ رصد خانہ قائم ہو۔ (ماثر الکرام صفحہ ۲۰۲)

شاہ جہاں کے بعد شاہنشاہ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر نے زمام حکومت سنبھالی، خود عالم تھے تمام اصناف علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے تھے، علوم شرعیہ سے خاص لگاوٹ تھی، مُلّا شیخ نظام بُرہان پوری، قاضی محمد حسین جونپوری، قاضی شہاب الدین گوپاموی، قاضی محب اللہ بہاری، ملا محمود فاروقی جونپوری، ملا عبدالرشید، شیخ عبدالعزیز اکبر آبادی، ملا عبداللہ سیالکوٹی سے صدہا علما و فضلا، دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ اِن میں سے ہر ایک صاحبِ تصانیف کثیرہ ہے۔ میر زاہد ہروی دوسرے شخص ہیں جنھوں نے علوم عقلیہ کی درس گاہ آگرہ میں قائم کی۔ علامہ میر زاہد درس نظامیہ کا بانی مبانی ہے جس کے تلمذ کے درخشندہ ستارے ملا نظام الدین سہالوی، قاضی مبارک گوپاموی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے حضرات ہیں، علامہ وجیہ الدین گوپاموی و ملا نظام جونپوری کے زیرنگرانی فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تدوین ہوئی۔

آگرہ میں جو عظیم الشان پیمانہ پر سرکاری مدرسہ تھا اُس کے صدر مدرس ملا عبدالعزیز پسر ملا عبدالرشید اکبر آبادی تھے۔

بارھویں صدی کے شروع میں اورنگ زیب عالمگیر نے وصال فرمایا نااہل جانشینوں کی بدولت طوائف الملوکی ملک میں پیدا ہوگئی۔ پست قومیں اُبھر آئیں، مرہٹے اور جاٹ اُٹھ کھڑے ہوئے، آگرہ اور دلّی اُن کی لوٹ مار کا آماج گاہ ایک صدی تک بنا رہا۔

مگر آگرہ اپنی مردم خیزی کو نہ بھولا قاضی سراج الدین علی خاں آرزو بقول میر حسن دہلوی امیر خسرو کے بعد ہمہ داں شخصیت کے مالک تھے، اس پایہ کا انسان پھر پیدا نہ ہوا، مرزا عبدالقادر بیدل جن کو تذکرہ نویسوں نے عظیم آبادی لکھ مارا۔ ان کی تصانیف جس پایہ کی ہیں اُن سے اہلِ علم بخوبی واقف ہیں۔ اِن کے بعد محمد حسین کلیم جن کا فصوص الحکم کا اُردو ترجمہ ہے وہ آگرہ ہی کے رہنے والے تھے، میر تقی میر کی جو شاعرانہ حیثیت ہے وہ اس جگہ پیش کرنا مقصود نہیں، مصنف کی حیثیت سے بھی اُن کا پایہ بلند ہے۔

نکات الشعراء، ذکر میر، انشائے فیض وغیرہ مشہور و معروف تصانیف ہیں۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کی کلمات طیبات بھی فارسی ادب میں ایک درجہ رکھتی ہے۔ لالہ ٹیک چند اکبر آبادی صاحب بہار اُس عہد کے فرد ہیں۔ بارھویں صدی کے آغاز میں ملا ولی محمد شارح مثنوی مولانا روم، فضیلت مآب شخصیت تھی۔ بوستان، سکندر نامہ، انوار سہیلی کی شرح فارسی ادب میں ایک درجہ رکھتی ہے۔ میاں نظیر ان کی انشائے نظیر اپنی طرز میں لاجواب ہے۔

میر اعظم علی اعظم، ملا ولی محمد کے نواسہ تھے اکسیر اعظم ان کی تصنیف ہے۔ صدر نظامت الہ آباد سے آگرہ آیا اہلِ علم حضرات مسلک تھے ایک علمی سبھا قائم ہو گئی، مفتی انعام اللہ خاں بہادر وکیل صدر تھے ان کے مکان پر علماء، اور شعراء کا جگمگٹا رہتا تھا۔ خود مفتی صاحب صاحبِ تصانیف ہیں۔ شرح شمسی، خزینۃ الاولیا، شرح اسرار قاسمی، مشہور ہیں۔ مولوی قمر الدین خاں قمر نے مقاماتِ حریری کا فارسی ترجمہ شائع کیا۔ لمعات قمر وغیرہ تصنیف سے ہیں۔

مولوی واجد علی مدیر "زبدۃ الاخبار" نے فارسی میں علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی "مطلع العلوم" نام رکھا۔ مولانا مولوی مظفر علی شاہ قدس سرہٗ نے جواہر غیبی تصوف میں معرکہ کی کتاب تصنیف کی۔ اُس عہد میں اور بھی مصنف تھے، یہ تو فارسی عربی میں جو تصانیف ہیں اُن کا ذکر تھا۔

مفتی ریاض الدین مفتی شہر تھے، اِن کے یہاں درس و تدریس جاری تھا، کوئی باضابطہ عربی مدرسہ نہ تھا، البتہ چند مکتب تھے۔ میاں نظیر کا مکتب مائی تھان میں تھا، ان کے بعد میاں خلیفہ گلزار علی اسیر مکتب میں پڑھاتے تھے۔ مولانا احمدی قادری اور مولوی عادل کی نشست گاہیں درس گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ ہنگامہ ۱۲۷۳ھ میں اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

آگرہ کالج ۱۸۳۲ء میں اور ۱۸۴۱ء میں سینٹ پیٹرس کالج۔ ۱۸۵۰ء میں سینٹ جانس کالج قائم ہو چکے تھے۔ ہنگامہ متذکرہ کے بعد ہی یہ کالج ترقی پکڑنے لگے، ملازمت کے خواہشمند اس طرف جھک گئے، اِن درس گاہوں سے برادرانِ وطن نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ مشرقی علوم کا لوکل کمیٹی کا ایک مدرسہ "مدرسہ عالیہ" تھا۔ مولانا عبداللہ صدر مدرس تھے، اِن کے بعد میرے استاد مفتی محمد رمضان رحمۃ اللہ علیہ مترجم تفسیر عباس، شاگرد رشید مولانا عبدالحی فرنگی محلی۔ مولانا سعادت اللہ صاحب اسرائیلی سے اصحابِ علم و فضل صدر مدرس ہوتے رہے، آگرہ میں چند اہلِ علم کی آج بھی جو صورتیں نظر آ رہی ہیں وہ اِنھیں علماء کا فیضِ علمی ہے مگر افسوس ہے آج یہ مدرسہ قابلِ توجہ نہ رہا۔

یہ علمی ترقی کا مختصر تذکرہ تھا، اب اس جگہ اُس زبان کا بھی کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری مادری زبان ہے اور جس کو **اردو** کہتے ہیں:۔

اردو کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں صرف اہلِ علم کو اس پر توجہ دلانا ہے کہ اہل اکبر آباد نے

بھی اُردو کو ترقی دینے میں انتھک سعی کی ہے۔

محمد شاہ کے عہد میں میر فضلی ۱۱۴۱ھ کربل کتھا لکھ رہے تھے، لالہ آروشن لال نے بدائع الفنون لکھی، یہی وہ زمانہ ہے انسان، آبرو، مضمون خاں آرزو، مرزا مظہر، میر تقی میر یکے بعد دیگرے دلی پہونچے، ان کے معاصر شوق الٰہی بخش تھے۔ ہمیشہ بہار میں نصراللہ خاں قمر لکھتے ہیں:-

''شوق تخلص شیخ الٰہی بخش اکبر آبادی سخن ، دو وہ فورد این فن کتابے تصنیف کردہ بکشکش شوق بہ شاہ جہاں آباد رسید و برسم رہ آورد پیشکش شاہ کرد''

۱۲۰۶ھ میں حکیم غلام امام اکبر آبادی نے ترجمۂ چہل حدیث کا کیا اور منتخب النجوم کتاب لکھی۔ یہی وہ زمانہ ہے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور انگریزوں کو اردو سکھانے کے لئے ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے نثر اردو میں متعدد کتابیں لکھوائیں، اس کے بعد نثر نویسی کو رواج عام حاصل ہوا۔ ۱۸۳۳ء میں آگرہ کالج سے متعلق آگرہ بک سوسائٹی قائم ہوئی۔ اس کی جانب سے ترجمے شائع کئے گئے۔ ہیئت و سائنس کے رسائل مرتب ہوئے۔ سید محمد میر لکھنوی اور محمد فتح اللہ خاں اکبر آبادی سوسائٹی کے رکن اعلیٰ تھے۔

شاہزادہ جیش مصنفہ مسٹر جانس کا ترجمہ اور ہیئت کے رسالہ کا ترجمہ متذکرہ حضرات کا کیا ہوا راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

پنڈت جواہر لال اکبر آبادی نے ۱۸۴۰ء میں ایک سوسائٹی قائم کی اس کی طرف سے ایک اخبار اور مطبع جاری کیا اور چند مصنفین اس سے منسلک تھے، خلاصہ نظام آسمانی لکھا۔ اور کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔

ایک دوسرا ادارہ تصنیف خان بہادر مفتی انعام اللہ شہابی کے کاشانہ پر قائم تھا۔ جس کے ارکان مولانا غلام امام شہید، میر واحد علی خاں، ڈاکٹر اشرف علی، مولوی قمرالدین، مولوی ابوالحسن فتحپوری، مولوی سید مدد علی تپش، حکیم غلام قطب الدین خاں باطن سے حضرات تھے۔

میر واجد علی اکبر آبادی نے دریائے لطافت کے مقابلہ میں گلدستہ انجمن لکھا، ڈاکٹر صاحب نے اردو میں کیمسٹری نامی کتاب لکھی، خان بہادر صاحب نے مشکوٰۃ المصابیح کی جلد اول کا ترجمہ اردو میں کیا، مسودہ شعیب محمدیہ اسکول میں میرا پیش کردہ ہے۔ مولوی کریم الدین اکبر آبادی نے سائنس کی کتاب کا ترجمہ رسالہ کہربائی کا کیا۔ مولوی عبدالرب اکبر آبادی نے مسٹر بین کی کتاب مساحت کا ترجمہ کیا۔ اور ہندسہ میں ایک تصنیف یادگار سے ہے۔ مولانا شہید نے میلاد مرتب کیا۔ باطن نے نغمۂ عندلیب لکھا، یکایک ہنگامہ ۱۸۵۷ء

میں یہ سبھا منتشر ہوگئی۔ جب ہنگامۂ سیاسی فرو ہوا، اہلِ علم نے بساط بچھائی۔ قدیم کتب خانے کچھ تباہ ہوئے جو بچے اُن کی کتابیں بازار میں دھڑی دھڑی بکیں۔ مگر ڈپٹی امداد علی صاحب نے ایک کتب خانہ قائم کیا، ساٹھ ہزار کتب قلمی اس کتب خانہ میں تھیں، مصنفین کے ہاتھ کے نسخے موجود تھے گو وہ کچھ عرصہ بعد ہی کوڑیوں میں بکا۔

قاضی صفدر علی نے ایک علمی جماعت کی تشکیل کی۔ اس کی طرف سے جگہ جگہ علمی تقریریں ہوتیں، کہربائی پر جو مضمون پڑھا تھا وہ معلم العلماء رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے معاصرین میں مولوی اکرام اللہ صاحب تصویر الشعراء، مرزا انشا علی بیگ مصنف قواعد فارسی و اردو و سفرنامہ ڈاکٹر مکند لال صاحب مٹریا میڈیکا۔ مرزا ہرگوپال تفتہ۔ مرزا حاتم علی مہر صاحب خواب انتقام، مولانا شاہ محمد اکبر دانا پوری صاحبِ تصانیف کثیرہ، مولوی سید اصغر علی جن کی گلشنِ جانفزا کی شہرت عام ہے، مولوی سید اصغر علی شاہ نے رسالہ تصوف لکھا، مولوی وارث علی مصنف شمس التواریخ، مولوی احمد نما صوفی صاحب تصانیف کثیرہ، منشی نادر علی وکیل، مولوی علی احمد خاں صاحب، مولانا احسن اللہ خاں ثاقب، ماسٹر مصری لال، مفتی واحد یار خاں بی اے، صاحبِ ارضِ تاج، مولوی معین الدین احمد مصنف تاریخ تاج، ڈاکٹر انعام اللہ مصنف طب جدید، مولوی فیاض حسین سلمان، مولوی انعام اللہ خاں بانی دائرہ "معارف قرآنیہ" مولوی سید نظام الدین شاہ۔

نیز مولوی سید نثار علی نثار، اور مرزا امجد الدین بیگ سے بکثرت حضرات نے صدہا کتابیں لکھ ڈالیں، اور آج بھی چند ادارے تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں۔ صرف ایک دائرۂ "معارف" نے ڈیڑھ سو کتابیں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۵ء تک ملک میں پیش کر دیں۔ بزمِ نظیر۔ بزمِ اقبال۔ نظیر اکڈمی اور قصر الادب نے اردو کی جو خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی شہرت تمام اہلِ علم میں ہے۔

میرے معاصرین اہلِ قلم کی خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، آگرہ کے "شاعر نمبر" میں راقم السطور لکھ چکا ہے اِس جگہ اس کی تکرار لاحاصل ہے۔

انتظام اللہ شہابی[۱]



[۱] حضرت مفتی انتظام اللہ صاحب نے یہ مقالہ اجلاس آگرہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اسلامی تاریخ و تمدن میں پڑھنے کے لئے تحریر فرمایا تھا۔
(مدیر)

بزمِ مصنّف

مولوی عبدالرحمن صاحب خوشتر ریونیو کمشنر منگرول (کاٹھیاواڑ)
"مصنف" ۱۲ دیکھنے کا اتفاق ہوا اس سے قبل بھی ایک دو پرچے دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی محنت قابل ستائش ہے۔ اب ٹھوس مضامین پیش کرنے والے رسالے بمشکل سے دو چار ہی نکلیں گے۔ محبی قاضی احمد میاں اختر کا مضمون "ولی گجراتی" جس محنت وکاوش اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ "گجرات میں اردو" بھی اسی نہج پر تیار کر کے دعویداران "دکن میں اردو"— "پنجاب میں اردو" کو اصلیت مولد اردو سے آگاہ کر دیں گے۔ آپ بھی زور دیجئے اور اُن سے کام کی بات لکھوائیے۔ اگر انھوں نے اس کا عزم کر لیا تو اس کے متعلق انھیں خود گجرات ہی سے اس قدر مواد ملے گا کہ کسی اور کا دست نگر نہونا پڑیگا۔ مکرمی پروفیسر نجیب اشرف صاحب سے بھی بہت کچھ مدد کی توقع کیجا سکتی ہے۔

پروفیسر اویس احمد صاحب ادیب ایم۔ اے کانپور
"مصنف" برابر آرہا ہے اس کے معیار کے متعلق کیا تحریر کروں، وہ خود اپنی جگہ پر اس کا ثبوت ہے۔

ویورنڈ بشیر احمد صاحب ملک ملتان
رسالہ "ہمایوں" ماہ نومبر میں "مصنف" پر ریویو نظر سے گزرا از حد خوشی ہوئی کہ آپ علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے ذاتی خرچ سے ایک ریڈنگ روم اور لائبریری کا انتظام کیا ہے جس میں تمام ہندوستان کے اردو رسائل جاری ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ "مصنف" کا اضافہ ہو۔ لہٰذا جاری کر دیجئے۔ ذیل کے رسالے پہلے سے جاری ہیں:—

"سائنس" "ہمایوں" "معارف" "آجکل" "ادیب" "نگار" "نیا دور" "ساقی" "سیاست" "اورنٹیل کالج میگزین" "مجلہ طیلسانین" "اردو" "ہماری زبان" "ہندوستانی ادب" "جامعہ" "نئی زندگی" "ادبی دنیا" "رہنمائے تعلیم" "زمانہ" "چمنستان" "نوید صحت" "ہمدرد صحت" "مسیح الملک" "مشیر الاطباء" "شاعر" "حکیم دکن" "برہان دہلی" "ترجمان القرآن لاہور" "ندیم پٹنہ" "الفرقان بریلی" "سب رس حیدرآباد دکن" (اور "کانفرنس گزٹ علی گڑھ" کا مزید اضافہ ہو تو مناسب ہوگا۔ مدیر)

ہمایوں لاہور | **مصنف** (علیگڑھ) مجلس مصنفین علیگڑھ کے سہ ماہی علمی رسالہ کا اکتوبر نمبر اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ گزشتہ تین سال سے شائع ہورہا ہے اور اس کا مقصد خالص ادبی مضامین کی اشاعت ہے۔ شمارہ زیر نظر میں ادارے کے علاوہ آٹھ مضامین ہیں، جن میں تقریباً ہر ایک علمی اور ادبی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ بالخصوص شمس العلماء مولوی محمد امین صاحب عباسی چریاکوٹی کا مضمون "املا اور رسم الخط کی اصلاح" ایک نہایت بسیط مضمون ہے۔ اسی طرح "مرحوم کیفی حیدر آباد میں" از مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور "غالب کا نظریۂ اقدار اخلاق" از سید شوکت علی صاحب سبزواری جامع اور پُر مغز مضامین ہیں۔ روش کے اعتبار سے ملک بھر میں دو ہی پرچے ایسے ہیں جو "مصنف" کے پیشرو ہیں "اردو دہلی" اور "ہندوستانی الہ آباد"۔ ہمیں امید ہے کہ علی گڑھ سے اٹھی ہوئی یہ آواز بھی ہندوستان گیر ثابت ہوگی۔ مدیر مسلم کانفرنس گزٹ علی گڑھ کے مشہور اور فاضل نیجر سید الطاف علی صاحب بریلوی بی۔ اے (علیگ) ہیں جن کی متعدد تصانیف علمیت اور وسعت نظر کی شاہد ہیں۔ ضخامت ۴۴ صفحات۔ چندہ سالانہ چار روپے ہے۔

مسٹر عبد الصمد رستجھانی ایم۔ اے ایل ایل۔ بی۔ ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن و سکریٹری پبلک سروس کمیشن ریاست جوناگڑھ

آپ کی بیگم صاحبہ (سیدہ آنیس فاطمہ) کا مضمون "جنرل بخت خاں" اگر شاہ کار کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں، مبارک باد قبول ہو۔

قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی | آپ کی علالتِ طبع اور موجودہ حالت معلوم کرکے مجھے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ البتہ افسوس ضرور ہوا۔ "قومی کارکنوں" کی یہی گت ہوتی رہتی ہے۔ "روشنیٔ طبع" بسا اوقات انسان کے لئے "بلا" بن جاتی ہے۔ آپ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ اسلئے اب "گل و گلچیں کا گلہ" عبث ہے! مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اتنی تلخ کامیوں کے باوجود آپ توازنِ دماغی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

آپ اس "کولھو کے بیل" کی سی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں۔ خدا کرے آپ میں اتنی جرأت پیدا ہو جائے، لیکن میرے خیال میں تو نہ صرف یہ آپ کے لئے دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے فی الحال تو مرم کرتے جانا ہی بہتر ہے تاوقتیکہ خدا کوئی بہتر سامان پیدا نہ کر دے۔

میں بستر علالت سے اُٹھ تو گیا لیکن دل و دماغ بُری طرف ماؤف ہو گئے اور ضعف و ناطاقتی کے ساتھ ہی تفکرات کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے۔ دعا کیجئے کہ خدا ان سے جلد نجات دے۔ ایک جانِ ناتواں پر اتنے جھمیلے ہیں کہ خدا کی پناہ ؎

زندگی اپنی جب اس طور سے گزری اختر ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مقالۂ دکنی صرف آپ کی توجہ کا کرشمہ ہے۔ نہ آپ مجھے "بزم مصنف" میں بلاتے نہ میں اس کام کو انجام دے سکتا، حضرت قبلہ نواب صاحب کا یہ ارشاد کس قدر صحیح ہے کہ آپ میں ادبی خدمات لینے کا خاص ملکہ ہے۔ اس لحاظ سے اس مقالہ کی جو کچھ داد مل رہی ہے اس کے مستحق مجھ سے زیادہ آپ ہیں۔ ناظر صاحب کاکوری، پروفیسر عبدالشکور صاحب اور سید حسن امام صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے قدردانی کی، یہ ان کا حسنِ نظر ہے ورنہ یہ مقالہ اس قدر داد کا مستحق تو نہیں ہے۔ بہت سرسری طور پر لکھا گیا ہے، البتہ اس کا دوسرا حصہ (اگر مسودہ سے بیضہ ہو سکا) قابل دید ہوگا۔ بعض احباب نے بھی اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ حبیب لبیب پروفیسر نجیب اشرف صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابھی ابھی مصنف ملا۔ اسی وقت آپ کا محققانہ مضمون پڑھا۔ آپ ہوتے تو گلے لگا کر داد دیتا۔ اب زبانِ قلم سے یہ فرض ادا کرتا ہوں، مبارکباد۔ الوسی والے مضمون کا میں نے جواب لکھا تھا۔ اب وہ مکمل ہو رہا ہے۔ اکثر تو اردو ہے۔ ایک مرتبہ پھر مبارکباد قبول فرمائیے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔"

میرے ایک دیرینہ محب مخلص جناب شہاب مالیرکوٹلوی مقیم بمبئی رقمطراز ہیں:۔

"آپ کا مرسلہ تحفۂ مصنف ملا۔ ملتے ہی پڑھا اور آپ کی تحقیق و تدقیق کا نقش جو دل پر پہلے ہی ثبت تھا، اور گہرا ہو گیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ حکیم کی خاموشی بلا وجہ نہیں ہوتی۔ اتنے لمبے سکوت کے بعد دکنی کی وطنیت کی فیصلہ کن بحث اس سکوت کا ثمر ہے۔ بارک اللہ بارک اللہ۔ اب معارف تو آپ کے معارف سے گویا محروم ہی ہو گیا۔ "مصنف" کی خوش قسمتی میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ دوران بحث میں دکنیوں سے چھیڑ چھاڑ معاصرانہ اور علمی گفتگو سے زیادہ رقابت وطنی کا رنگ لئے ہوئے نظر آئی۔ ایسا ہونا قدرتی تھا۔ دکنی کو اورنگ آبادی ثابت کرنے کے لئے حیدرآبادی اہل قلم نے جو روش اختیار کی اس میں دکن اور "دکنی" کو اساس قرار دے کر ہوائی قلعہ تعمیر کر لیا گیا تھا۔ قدیم شواہد پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ آپ کا نئے عناصر اور تازہ شواہد کو بحث میں شامل کر دینا، آپ کی ملائنس، دکنی کی خوش قسمتی اور اہل علم کے لئے نئی دعوتِ فکر اور اہل قلم کے لئے تلاش

وجستجو کا نیا اچھوتا نمونہ ہے۔ بارک اللہ۔"

"اس پرچہ میں 'غلام قادر روہیلہ' پر سید الطاف علی صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر عجیب التواریخ پر اعتماد کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ وہ کتاب بھی چھپ جائے۔ سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بہت اچھا ہے۔ مگر اقبال کی نظم میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے اکبر شاہ خاں صاحب کے بیان کی بنا پر کمزوری کا ثبوت ملے۔ دورِ آخر مغلیہ کی تاریخ سوائے حسنِ ظن کے اور کسی طرح بھی مسلمانوں کے لئے سرمایۂ نازو افتخار نہیں۔ مغلیہ خاندان کے عروج کی تاریخ نے ہندی مسلمانوں کے قدیم فرمانرواؤں کے محاسن کو بھی معائب نہیں بنایا تو گرد آلود ضرور بنا دیا ہے۔ حالانکہ مغلوں سے پہلے کے جو دور تھے ان میں بھی بادشاہ ہونے کی حیثیت سے بڑے بڑے فرماں روا ہو چکے ہیں۔ مگر بدقسمتی ہے کہ ہندی مسلمان عموماً مغلیہ دور ہی کو اسلامی دور سمجھ کر قصہ ختم کر دیتا ہے۔ خیر تو بحث یہ تھی کہ سید صاحب نے غلام قادر کے لئے جو لکھا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ مگر سید صاحب کا یہ کہنا کہ وہ مسلم طاقت یا مغلیہ طاقت کی بحالی کی آخری کوشش کرنے والا یا آخری محافظ ہے، زبردستی ہے۔ شاہی لال قلعہ میں اس کے ساتھ جو ہوا، اس کا اگر وہ بھی بدلہ لے تو اسے کون بُرا کہہ سکتا ہے اور یہ تو سیاست ہے کہ طاقتور کمزور کو دباتے ہیں۔ لیکن سچی سیاست یہ ہے کہ کمزوری میں غلام نہ بنے، طاقت میں فرعون نہ بنے۔ ایسا ہی شخص فرماں فرمائی کا مستحق ہے۔ نگاہیں ایسے ہی لوگوں کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔"

حیاتِ ولی کا احباب کی طرف سے سخت تقاضا ہو رہا ہے۔ میں نے بہت کچھ حصہ لکھ ڈالا ہے، اس کو صاف کرنا باقی ہے جو موجودہ مصروفیتوں میں بالفعل دشوار ہے، میں کوشش کروں گا کہ آیندہ ماہ میں اس کام کو شروع کروں۔ میں نے اس کے دو حصّے کر دیے ہیں۔ پہلے حصّہ میں ولی کے خاندانی اور ذاتی حالات ہیں اور دوسرے میں ان کی شاعری پر مفصل بحث ہے۔ پہلا حصّہ حتی الامکان جلد سے جلد جنوری کے اواخر تک تیار ہو سکتا ہے، دوسرا حصّہ ذرا محنت طلب ہے اور اس پر بہت کچھ لکھنا باقی ہے جو کافی وقت اور فرصت چاہتا ہے۔ غلام قادر کے مضمون پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

مسٹر محمود بریلوی سابق سب ایڈیٹر بمبئی کرانیکل

"سالہا سال سے میں اس امر کا متمنی رہا ہوں کہ چند روز مسلم یونیورسٹی کے اندر گزاروں، وہاں کے پروفیسروں سے ملوں اور وہاں کے طریقِ کار سے ذاتی واقفیت پیدا کروں، میں یہ بھی برسوں سے جانتا ہوں کہ آپ کا تعلق علیگڑھ اور مسلم یونیورسٹی سے دیرینہ اور گہرا ہے، اور وہاں آپ کے متعلق مزید معلومات مجھے مولانا سید

طفیل احمد صاحب سے دورانِ سفر میں معلوم ہوئیں۔ بہرکیف میرے لئے آپ کی وساطت سے اپنی مذکورہ بالا خواہش کا پورا کرنا آسان تھا، لیکن میں اپنی اس آرزو کو آج تک پورا نہ کر سکا۔

اپنی ایک دو کتابوں کی طباعت و اشاعت کے متعلق بھی آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں چونکہ بمبئی میں زیادہ عرصے تک رہا ہوں، لہٰذا وہیں کے لوگوں سے زیادہ واقف ہوں۔ بدقسمتی سے پنجاب...... کے لئے ضرب المثل ہو چکا ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرا تعارف ایک دو ایسے مطابع سے کرا دیں جو خوش معاملگی کے لئے معروف ہوں۔ میری ایک کتاب آجکل (بنام "فلسطین و مسئلۂ یہود") انوار احمدی پریس الہ آباد، میں زیرِ طباعت ہے۔ دوسری ("اشتراکیت اور اُس کے متعلقات") نفیس اکیڈیمی حیدر آباد دکن، کے پاس ہے اور غالباً وہ اُسے جلد طبع و شائع کریں گے۔ اب میرے پاس اپنے مختصر افسانوں کا مجموعہ اور ایک مختصر مسوّدہ "ہندی شاعری"۔ یہ دو چیزیں بغرض طباعت تیار ہیں۔ تیسری چیز "اسلامیانِ عالم" ہے جو ضخیم کتاب ہے اور آجکل زیرِ تکمیل ہے۔ غالباً دو تین ماہ کے اندر مکمل ہو جائے گی، انشاءاللہ۔ میں نے "تاریخ زبان و ادبِ اُردو" کا حصۂ نظم قریباً سات سَو صفحات تک لکھکے چھوڑ دیا۔ اُس کی خاصی پبلسٹی ہوئی تھی۔ مگر میں ہی تھک کے اُسے چھوڑ بیٹھا۔ اب پھر ارادہ کر رہا ہوں کہ "اسلامیانِ عالم" ختم ہولے اور کوئی معقول پبلشر نصیب ہو جائے تو از سرِ نو اسے اپنے ہاتھ میں لوں۔ علاوہ ازیں "ہند جدید کی ستیا" پر پوری کتاب کا مواد اور نوٹ میرے پاس موجود ہیں، مگر ابھی تک اِس کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ مل سکی ——— اب آپ تحریر فرمائیں کہ آپ کی اخلاقی امداد اس مسئلہ میں کس حد تک مجھے مل سکتی ہے؟ آپ کی تصانیف تک، آج تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ اُن کے دیکھنے کی حسرت ہے۔

ڈاکٹر عاشق حسین صاحب بٹالوی لاہور

اکتوبر کا "مُصنف" مُلا۔ غلام قادر روہیلہ کے متعلق آپ کا بلند پایہ مضمون، میں اس سے قبل روزنامہ ڈان میں پڑھ چکا تھا۔ اب سراج الحق صاحب کا اُردو ترجمہ پڑھکر دوبارہ لطف حاصل کیا۔ قریشی صاحب نے حضرت مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم و مغفور کا ذکر کرتے ہوئے میرے اُس مضمون کا بھی حوالہ دیا ہے جو گزشتہ سال "مصنف" میں شائع ہوا تھا۔ مولانا مرحوم کی زندگی میں متعدد بار غلام قادر خاں کے حادثۂ فاجعہ کے متعلق بھی گفتگو ہوئی تھی۔ افسوس کہ اب وہ مواد ذہن میں موجود نہیں۔ مولانا کی عادت تھی کہ وہ ہر تاریخی واقعہ کی وضاحت کرتے وقت اُس کے ما لہٗ و ما علیہ کو

نہایت تفصیل سے بیان کرتے تھے تاکہ سامعین کو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ یہی خصوصیت آپ اُن کی تحریر میں دیکھیں گے۔ غلام قادر کے افسوسناک واقعہ پر اظہارِ خیال کرتے اور اُس کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے بھی وہ تمام جزئیات و تفصیلات کو شرح و بسط سے بیان کرتے تھے۔ لیکن سوءِ اتفاق سے اس موضوع پر وہ کوئی مضمون نہ لکھ سکے۔ جس زمانے میں "عبرت" نکلتا تھا تو اُن کے پاس کسی شخص نے خط بھیج کر اس موضوع پر اُن کے خیالات معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے "عبرت" میں مولانا نے یہ خط درج کر کے اپنی طرف سے چند ابتدائی باتیں لکھی تھیں۔ اور اُن کا ارادہ تھا کہ "عبرت" کے کسی آیندہ نمبر میں وہ تاریخ ہند کے اس افسوسناک قضیہ پر ایک مفصل و مکمل مضمون لکھیں گے۔ لیکن بعض حوادث کی وجہ سے نومبر ۱۹۲۴ء کے بعد "عبرت" بند ہو گیا۔ اور مولانا کا یہ ارادہ بر روئے کار نہ آسکا۔ اگر مولانا کا مضمون حسبِ وعدہ "عبرت" میں چھپ جاتا تو اس موضوع پر یقیناً قولِ فیصل کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے "عبرت" سے وہ خط اور مولانا کا مختصر سا جواب نقل کر کے خدمتِ والا میں بھیج رہا ہوں۔ شاید "مصنف" کے کام آسکے۔

"لکھنؤ سے میرے نام ایک کارڈ آیا ہے۔ احبابِ کرام ملاحظہ فرمائیں۔ وھو ہٰذا:۔

"مکرمی۔ سلامِ مسنون۔ میں آپ کو ایک تکلیف دینی چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ ضرور خیال فرمائیں گے۔ بعض آدمی روہیلکھنڈ کے باشندوں کو محسن کُش کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر اس کے متعلق "عبرت" میں کچھ تشریح بیان فرمائیں۔ نیز یہ بھی بیان فرمائیں کہ نواب غلام قادر خاں نے شاہ عالم کے ساتھ کیوں بدسلوکی کی تھی۔ والسلام

راقم

محمود خاں۔ ممتاز منزل

امین آباد۔ لکھنؤ

اس کارڈ کے پڑھنے سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ راقم خط کا ذاتی عقیدہ کیا ہے۔ ویسے بھی اپنی برأت کے لئے دوسروں کے الزام کو بطور دلیل بیان کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ تاہم روہیلکھنڈ کے باشندوں کی خصوصیات پر نظر کرنے میں انسان مجبور ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں پر بھی نظر ڈال کر اُن سے مقابلہ کر کے دیکھے۔ غالباً دُنیا کے کسی حصے میں فرشتوں کی آبادی موجود نہیں ہے۔ ہر جگہ آدمیوں ہی کی بستیاں نظر آتی ہیں۔ اور آدمؑ کی اولاد

میں ہر قسم کے نمونے موجود ہیں۔ روہیلکھنڈ آج کل کی تقسیم ملکی کے اعتبار سے سات ضلعوں کے مجموعہ کا نام ہے
جن کے نام یہ ہیں۔ بریلی، شاہجہاں پور، بدایوں، مرادآباد، بجنور، پیلی بھیت، رامپور۔ بعض مؤرخین
نے فرخ آباد اور قنوج کو بھی روہیلکھنڈ میں شامل سمجھا ہے۔ اور ایسا سمجھنے میں اُن کو خاندان بنگش کی پٹھان ریاست
کے سبب دھوکا لگا ہے۔ روہیلکھنڈ میں سب سے زیادہ آبادی ہندوؤں کی ہے۔ اور مندرجہ بالا الزام کی جواب دہی
سب سے زیادہ روہیلکھنڈ کے ہندوؤں پر عائد ہونی چاہئے۔ مگر چونکہ روہیلکھنڈ میں رہنے والے افغانوں کو مؤرخین
نے روہیلہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ لہٰذا روہیلکھنڈ کے باشندوں پر جب کوئی الزام لگایا جائے گا تو اس ملک کے
پٹھان ہی سب سے پہلے اپنے آپ کو ملزم سمجھیں گے۔ اس کارڈ میں چونکہ غلام قادر خاں کا نام بھی لیا گیا ہے۔ لہٰذا
نجیب آباد کے پٹھان جن کی تعداد آجکل بہت ہی محدود اور معدود ہے خصوصی طور پر اپنے آپ کو ہدف ملامت
سمجھ سکتے ہیں۔ میں اس کارڈ کو ہرگز "عبرت" میں جگہ نہ دیتا کیونکہ ایسی تحریریں جو کسی قومی تفریق یا منافرت کا موجب
ہو سکیں شائع نہیں ہونی چاہئیں۔ مگر چونکہ اس کارڈ کا براہ راست سب سے زیادہ قوی اثر نجیب آباد پر ہو سکتا
ہے۔ لہٰذا میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے اختیار کو اس کارڈ کی اشاعت میں سدِّ راہ ہونے دوں۔ روہیلکھنڈ
کے باشندوں کے متعلق میں خود کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ بریلی، رامپور اور شاہجہاں پور والوں کو بھی آخر کچھ بولنا
چاہئے۔ ہاں میرا یہ فرض ہے کہ نواب غلام قادر خاں کے متعلق حقیقت و اصلیت کا انکشاف کر دوں۔ لہٰذا
محمود خاں صاحب اور تمام قارئین "عبرت" منتظر رہیں کہ تاریخ ہند کے اس سب سے زیادہ نازک و خطرناک حصے کو کسی
آیندہ اشاعت میں پیش کر سکوں گا۔ اور اس کے بعد سوا سو برس کی غلط فہمی کا تار و پود انشاء اللہ تعالےٰ
تار تار ہو جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔" اکبر شاہ خاں

مولوی حسین امام صاحب سابق مدیر ندیم گیا

مصنف ۱۲ بابتہ اکتوبر ۴۵ء ملا۔ مضامین سب ایسے اور اس پائے کے دیکھنے میں آئے کہ آئندہ نمبر کیلئے خطرہ ہو رہا ہے کہ معیار پر اُترنے میں کہیں کسر نہ رہ جائے۔ اتنے عمدہ مضامین کا یک بارگی شائع کر دینا مدیر کی بلندی حوصلہ کی دلیل ضرور ہے۔ مگر خیر اندیش اس بارے میں آپ کو جُزرسی کا مشورہ دیں گے۔ "الف بائے وجھن" (از پروفیسر ابرار حسین صاحب فاروقی ایم۔ اے) کے متعلق اپنے کچھ شکوک و شبہات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ بغرض اشاعت نہیں ہیں۔ اسکے علاوہ آپ جو صرف چاہے لے سکتے ہیں "ولی گجراتی" پر حضرت اختر جونا گڑھی کا مقالہ بڑے وقت کی چیز ہے۔ "حالات و حیات ولی" کا انتظار رہے گا۔ خدا کرے آیندہ اشاعت آپ جلد بھیجیں +

کانفرنس بک ڈپو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تجارتی شعبہ ہے جس میں کانفرنس کی مطبوعات فروخت ہوتی ہیں۔ چونکہ کانفرنس کا مقصد اس شعبہ کے قیام سے اردو کی اشاعت ہے اس لئے کانفرنس نے اس شعبہ کے کام کو اپنی ہی مطبوعات تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ہندوستان کے دوسرے مطابع اور مصنفین کی کتابیں بھی اس شعبہ میں جمع کی ہیں اور ان کی اشاعت کا فرض بھی اپنے ذمہ لیا ہے۔ تاکہ اہلِ علم اصحاب اپنے ذوق کی کتابیں ایک ہی جگہ سے خرید سکیں اور جگہ جگہ سے منگانے کی زحمت اور زیرباری سے بچیں کانفرنس بک ڈپو میں عورتوں اور بچوں کے لئے مفید اور کارآمد کتابوں کا کافی ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ چونکہ کانفرنس مسلمانانِ ہند کی تعلیمی خدمت کرنے والا ادارہ ہے اس لئے کانفرنس کے اس تجارتی شعبہ کا نفع بھی اب انہی کاموں میں صرف ہوتا ہے جو علم اور تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی سرسید مرحوم مغفور یعنی بانئ کانفرنس کا مشن تھا۔ لہٰذا جملہ اہلِ علم اصحاب کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ کانفرنس کے اس تجارتی شعبہ کی سرپرستی فرمائیں۔ کانفرنس کی مطبوعات خریدیں اور دوسرے مصنفین کی کتاب بھی ہمیشہ کانفرنس بک ڈپو ہی سے خرید فرمایا کریں تاکہ کانفرنس کے اس شعبہ کو استحکام اور قوت حاصل ہو اور وہ بڑے سے بڑے پیمانہ پر اپنے کام کو جاری رکھ کر بانئ کانفرنس کے مشن کو پورا کرتا رہے۔ کانفرنس کی چند مطبوعات کی فہرست پہلے سرورق کے دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے اور مفصل فہرست

مہتمم کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علی گڑھ

کے پتہ سے طلب فرمائیے

تصانیف سید الطاف علی بریلوی

حیاتِ حافظ الملک حافظ رحمت خاں — روہیلکھنڈ کے مشہور روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی اُردو زبان میں پہلی مکمل و مبسوط باتصویر سوانح عمری جس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں روہیلہ قوم کے کارنامے اور ولولہ انگیز حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے طول و عرض میں مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۵ روپئے (زیر طبع بار دوم)

مسلمانوں کی تعلیمی جدّوجہد — (بزبان انگریزی) اس کتاب میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک کی مسلمانانِ ہند کی بالخصوص اور مسلمانانِ یو۔پی کی بالعموم تعلیمی کوششوں اور عہد بعہد کی جدّوجہد کو تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (زیر طبع بار دوم)

مسلمان کی دنیا — مصنف نے اپنی دَہ سالہ پبلک لائف کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب و علل کو افسانہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ قیمت دو آنے۔

رباعیاتِ عرش فاروقی — بریلی (روہیلکھنڈ) کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی مرحوم کے درد انگیز حالاتِ زندگی اور بطور نمونۂ کلام اُن کی کیف آور رُباعیات کا مجموعہ۔ قیمت ۲ آنے۔

صوبۂ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم — دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو شدید مشکلات اور رُکاوٹیں درپیش ہیں، اُن پر نہایت موثر مقالہ ہے۔ ساتھ ہی حل مشکلات کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ قیمت آٹھ آنے۔

دلاور الملک نواب دوندے خاں — (بزبان انگریزی و اُردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریک کار عزت الدولہ دلاور الملک نواب دوندے خاں بہادر بہرام جنگ کے مجاہدانہ واقعات اور سرفروشانہ حالات کا مجموعہ اور مرہٹہ قوم سے نبرد آزمائی کا مرقع ہے۔ قیمت چار آنے۔

غلام قادر روہیلہ (سلطنتِ مغلیہ کا آخری محافظ) — بزبانِ انگریزی و اُردو۔ (زیر طبع) قیمت آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

منیجر کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علی گڑھ

مصنف نمبر ۱۶ و ۱۷

مجلس مصنفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

اکتوبر ۴۶ء و جنوری ۴۷ء

مدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ)

قیمت سالانہ۔ چار روپئے

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

باہتمام خانصاحب ظہیر خاں

مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ طبع شد

مُصنّف ۱۶ و ۱۷

جلد ۴ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء و جنوری ۱۹۴۷ء | نمبر ۱۶ و ۱۷

فہرست مضامین

اعتذار

چونکہ مسلم یونیورسٹی پریس میں کچھ عرصہ سے انتظاماتِ طبع میں گڑبڑ رہی، اِس لئے ہماری امکانی کوشش کے باوجود اکتوبر ۱۹۴۶ء کا "مصنف" شائع نہ ہو سکا۔ مجبوراً اکتوبر ۱۹۴۶ء اور جنوری ۱۹۴۷ء کا یہ یکجائی پرچہ نذرِ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

مدیر

ایڈیٹوریل "مصنف"، علیگڑھ

پس چہ باید کرد؟

ہمارے ایک بزرگ منشی عظیم الشان خانصاحب بریلوی ماہر السنۂ مشرقیہ فرماتے تھے کہ یہ عجیب دَور ہے کہ ہفتے مہینے اور برسیں گزر جاتی ہیں کسی شخص اور گوشہ سے کوئی خوشی کی بات سُننے یا دیکھنے میں نہیں آتی۔ روزانہ صبح سے رات تک ملنے جلنے والے، اخبارات اور ریڈیو۔ غرض تمامتر ذرائع معلومات رنجدہ اور پریشان کُن خبریں ہی دیتے ہیں۔ کبھی شاذونادر کوئی خوشخبری ملتی بھی ہے تو اس کی عمر چند گھنٹے سے زائد نہیں ہوتی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہی کسی ایسے پریشان کُن اور تشویشناک حادثہ کی اطلاع آجاتی ہے کہ وہ چھوٹی سی خوشی خواب وخیال ہو کر رہ جاتی ہے۔

اب سے تین، چالیس سال پہلے صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔۔۔ فارغ البال اور خوشحال طبقہ کا تو کہنا کیا، غریب سے غریب آدمی کی زندگی میں بھی مسرت وشادمانی کا عنصر غالب تھا۔ چہچہے، قہقہے، خوش گپیوں اور نت نئے کھلنڈرے پن کی فراوانی تھی۔ گاؤں گاؤں کوچہ کوچہ اور گھر گھر جدید سامانِ عیش اور اسبابِ راحت کے فقدان کے باوصف ایک قسم کا بےفکراپن پایا جاتا تھا۔ پہلے نہ اتنے پڑھے لکھے لوگ تھے نہ اتنے مالدار۔ لیکن کھانے، پینے، رہنے سہنے اور میل ملاقات میں جو لطف اور جو مزہ تھا وہ آج دیکھنے میں نہیں آتا۔ آخر یہ سب کیوں ہے؟ مصائب وآلام کا یہ دَور دَورہ کب تک رہے گا؟ کیا پھر بھی کبھی حقیقی مسرت اور سچی بےفکری کے کچھ لمحے نصیب ہوں گے۔ یا یوں ہی مستقل کلفت میں بقیہ ایامِ حیات بسر ہوں گے؟

دراصل یہ نتیجہ ہے ہماری غلامی کی طویل مدت کا اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں خود غرضی۔ منافقت اور عدم خلوص کا۔ عام حالات میں یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن معاملہ اب کچھ اس سے آگے بڑھ گیا ہے۔

حالیہ عالمگیر جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں سے خاطر خواہ نجات نہ ملنے پائی تھی کہ ملک کے طول و عرض میں ہندو مسلم فسادات کا نہایت خوف ناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس نے اس بد نصیب ملک کے رہنے سہنے والوں کی زندگی انتہا درجہ تلخ اور اجیرن بنا دی ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے علاقے اور ان کی کثیر آبادیاں شدید قسم کی خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ چکی ہیں اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو عنقریب پورا ملک اور اس کی کل آبادی تباہی کا شکار ہو جائے گی۔

ہم نے ایک گونہ اطمینان کی سانس لی تھی کہ کم از کم خاص ہندوستان کے اندر جرمنی اور جاپان کی حملہ آور فوجیں داخل نہ ہوئیں اور ہمارا ملک بیرونی حملہ سے بچ گیا۔

لیکن جیسا کہ "انڈین نیشنل آرمی" کے ایک افسر نے بیان کیا، جاپانی حملہ اور جاپانیوں کے قبضہ سے برہما کی وہ سقیم حالت نہ ہوئی تھی، جو فرقہ وارانہ فسادات سے بہار کی ہو گئی۔ وجہ ظاہر ہے —— ایک ظالم سے ظالم غیر ملکی حکومت اور سخت سے سخت بیرونی حملہ کے مقابلے میں سب اہل ملک متحد الخیال اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہو جاتے ہیں۔ مگر باہمی خانہ جنگی کی صورت میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ایک ہی شہر، ایک ہی محلہ اور ایک ہی گاؤں میں جب اپنے ہمہ وقت کے ساتھی اور پڑوسی خون کے پیاسے ہو جائیں تو کوئی بھی سامانِ مدافعت کارگر نہیں ہو سکتا۔

حکومت کی ساری پولس، کل فوج اور جملہ سامانِ جنگ جان و مال اور ناموس کے بچانے میں لگا دیا جائے تو بھی پوری حفاظت نہیں ہو سکتی۔ اسقدر تعداد میں پولس اور فوج کا مہیا ہونا کہ چالیس کروڑ انسانوں کے ہر گھر پر پہرا بٹھایا جائے ناممکن اور قطعاً ناممکن ہے۔

ہمارے ملک میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں آباد ہیں اور ان کی آبادی اس طور پر واقع ہوئی ہے کہ جن جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں وہ زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں اور شہر میں غیر مسلم مساوی تعداد میں یا بھاری اقلیت میں آباد ہیں۔

اسی طرح جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے دیہات میں ان کی کثیر آبادی ہے اور شہروں میں مسلمان بہت نمایاں تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ آبادی کی اس تقسیم کا نتیجہ ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تل جائیں تو مسلم اکثریت کے علاقے اپنے یہاں کی غیر مسلم دیہاتی آبادی کو ختم کر سکتے ہیں اور ہندو اکثریت کے صوبے مسلم دیہی آبادی کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ شہروں میں البتہ برابر کی ٹکر رہے گی۔ اب سے پہلے فرقہ وارانہ فسادات زیادہ تر شہروں تک محدود تھے اور ملک کی دیہی آبادی اس لعنت و مصیبت سے محفوظ تھی۔ مگر اس وقت صورتِ حال بدل گئی ہے۔

کلکتہ اور بمبئی کے بعد خونریزی کا مرکز دیہات ہو گئے ہیں۔ جہاں قلیل التعداد مخالفِ مذہب قوم پر بے پناہ مظالم توڑے جاتے ہیں۔ اور پوری پوری آبادی کو قطعاً تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ایسا کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ اسی ملک کے دوسرے حصوں میں ہمارے ہم قوم و مذہب لوگوں کا بھی یہی انجام ہو سکتا ہے۔

جو حربہ ہم دوسروں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں وہی ہمارے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اور نتیجہ میں دونوں کی لازمی تباہی اور غیر ملکی حکمرانوں کی دائمی غلامی ہمیں نصیب ہو گی۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے برادرانِ وطن کا ایک طبقہ کچھ اس طرح سوچنے لگا ہے کہ چونکہ مسلمان پاکستان مانگتے ہیں جس کے دیئے جانے پر وہ راضی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا کیوں نہ ایک کوشش مسلمانوں کو ختم ہی

کر دینے کی کر دیکھی جائے۔ اس کوشش کا سب سے شرمناک مظاہرہ بہار میں ہوا۔ جہاں کم از کم تیس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اور ڈیڑھ لاکھ مجروح و خانماں برباد کئے گئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس سب سے بڑے قومی حادثہ کے باوجود اور ہر قسم کی ناتیاری و غفلت شعاری کے باوصف مسلمان کیا باعتبار قوتِ مدافعت اور کیا اپنی باقی ماندہ تعداد کے بڑے سخت جان ثابت ہوئے۔

ہندوستان کی دس کروڑ مسلم آبادی خدا کے فضل سے علیٰ حالہٖ قائم و دائم ہے۔ حتیٰ کہ خاص بہار میں جہاں سب سے زیادہ کمزور سمجھ کر مسلمانوں کو اچانک دبوچا گیا۔ جہاں کہیں پانچ اور پچاس ہزار تک مسلح دشمنوں نے پانچ پانچ سو کی قلیل مسلم آبادی پر حملہ کیا تو وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اور بہار کی اڑتالیس لاکھ مسلم آبادی میں سے اگر زیادہ سے زیادہ دو لاکھ بھی ختم ہو گئے تو بفضلِ خدا چھیالیس لاکھ باقی ہیں۔ جنکو ایک "کربلا" ہو جانے کے بعد اب ہاتھ لگانا آسان نہ ہوگا۔

احمد آباد، کلکتہ، بمبئی، بہار اور گڑھ مکتیشر کے ہولناک حادثوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار اور حفاظتِ خود اختیاری کی مناسب تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا ہے اور انشاء اللہ آئندہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ان کی ناتیاری سے کوئی ناجائز فائدہ اُٹھا سکے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمان اپنی مدد آپ کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اور انھیں اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے مسلمان ان کی کمک پر آئیں۔

دوسرے علاقوں سے قطع نظر صرف یو۔پی کے اسی لاکھ مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ایک ہزار سال سے ہندوستان میں مسلم اقتدارِ اعلیٰ کے پشتیبان کا کام دیتے رہے ہیں۔ پورے ملک میں سلطنتِ اسلامی کا یہی صوبہ مرکز رہا اور یہیں سے اقوامِ ہند کی قسمتوں کے فیصلے ہوئے۔
تاریخ گواہ ہے کہ شمال و مغرب سے ہندوستان پر جس قدر حملے

ہوئے ہر ایک حملہ آور کو دریائے اٹک پار کرتے ہی کوئی روکنے والا نہ ہوتا تھا اور دلی کے قریب پانی پت تک بے کھٹکے بڑھا چلا آتا تھا۔ البتہ پانی پت سے آگے بڑھنے کی اُسے ہمت و جرأت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اس جگہ سے دہلی اور یوپی کے غیور اور بہادر مسلمانوں سے مقابلہ اور زور آزمائی شروع ہو جاتی تھی۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ یوپی کے مسلمانوں نے پیش قدمی نہ کی ہو اور کسی حملہ آور کو بغیر زبردست خونریزی کے پانی پت سے قدم آگے بڑھانے کا موقع دیا ہو۔

دلی کے لال قلعہ پر جس وقت تک پرچم اسلامی لہراتا رہا مسلمانانِ یوپی فداکارانہ اور پروانہ وار اس کی حفاظت کرتے رہے۔ جب دلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوئی اور پنجاب پر سکھوں کا ظالمانہ قبضہ ہو گیا۔ پنجابی مسلمانوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ مسجدوں اور عبادت گاہوں کی شکست و ریخت ہونے لگی۔ مسلمانوں کو نماز پڑھنے اور اذان تک کی ممانعت ہو گئی تو اس دَورِ ابتلا میں یوپی ہی کے ایک مردِ مجاہد سیّد احمد صاحب شہید رائے بریلوی کی رگ حمیتِ اسلامی جوش میں آئی اور وہ اپنے غازیانِ اسلام کی فوج اکٹھی کر کے براہِ راجپوتانہ، سندھ۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد۔ پنجاب پر حملہ آور ہوئے۔ خوب خوب لڑے۔ دشمنوں کو مارا۔ کچلا اور آخر میں خود بھی بمقام بالاکوٹ مع اپنے ساتھیوں کے شہید ہو گئے۔

انگریزی تسلط و اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں تمام تر جدّ و جہد کا مرکز بھی یوپی ہی رہا۔ آج بھی مسلمانانِ ہند کے "مطالبۂ پاکستان" کا آغاز عملاً یوپی سے ہوا۔ یہیں پروان چڑھا اور اسی جگہ کے مسلمانوں کو آخر دم تک اس کے لئے بالکل بے لوث خالصۃً لوجہ اللہ ہر قسم کی قربانی دینی ہے۔ اقلیت کے صوبوں کے مسلمان عہد کر چکے ہیں کہ وہ نہ صرف "پاکستان لیکے رہیں گے" بلکہ یوپی۔ بہار۔ اڑیسہ۔ سی۔پی۔ صوبہ بمبئی

اور صوبہ مدراس کا جو بڑا بھاری اکھنڈ ہندوستان بنے گا اُس میں بھی اپنے وجود ملّی کو روایتی عزت و آبرو کے ساتھ قائم و برقرار رکھیں گے۔

چودہ فی صدی ہونے کے باوجود ہم یوپی کے مسلمان بالخصوص اضلاع مغربی کے مسلمان ہمیشہ صدیوں سے دوسری ہم عصر اقوام پر غالب رہے ہیں۔ اور ہمیں بھول کر بھی نہ کبھی احساس کمتری ہوا اور نہ ہم اپنے آپ کو کسی نوع سے کمزور سمجھتے ہیں۔ شہر تو شہر جن میں سے اکثر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ قصبات و دیہات میں بھی پٹھانوں کے بڑے بڑے جرگے اور خاندان آباد ہیں اور اُن میں کا ایک ایک شخص پچاس پچاس پر بھاری ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات میں بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اندھیرے، اُجالے اور اچانک دھوکے سے اکا دُکا مسلمانوں کو پیٹ لیا جاتا ہے، جب مسلمان بدلہ لینے کے لئے چڑھائی کرتے ہیں تو حکومت کی فوج اور پولیس بیچ میں آجاتی ہے۔ اور اس طرح جو کچھ اُن کا جانی نقصان ہوتا ہے وہ بالعموم پولیس وغیرہ کے تصادم سے ہوتا ہے۔

آج کل ایک خاص بات یہ بھی دیکھنے اور سُننے میں آرہی ہے کہ جن جن مقامات پر مسلمان مضبوط ہیں وہیں برادرانِ وطن "امن کمیٹیوں" میں اتحادِ عمل کر رہے ہیں۔ اور فوج و پولس کے انتظامات کا بھی پورا زور شور ہے۔ لیکن جہاں مسلمان کمزور اور قلیل التعداد ہیں وہاں نہ "امن کمیٹیاں" کام کر رہی ہیں، اور نہ ہی فوج اور پولس نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ گویا حفاظتی تدابیر مسلمانوں ہی کے خلاف اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور یہ مسلمانوں کی بہت بڑی اخلاقی فتح ہے۔

کانگریسی حکومتوں کے اس غیر ہمدردانہ رویّے کے پیشِ نظر مسئلہ صرف اُن مسلمانوں کا رہ جاتا ہے جو دُور دراز دیہات میں کم تعداد ہیں۔ سو اُن کو اپنے اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ ع

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر ست

وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت کے مطابق صوبے سے باہر نہیں بلکہ اپنے ہی صوبہ میں اُن مقامات پر جلد از جلد منتقل ہو جائیں جہاں اُن کے ہم قوم لوگوں کی تعداد معقول ہے اور مسلمانوں کی زمینداری ہے۔

اس صورت میں مسلمان زمینداروں پر بھی کچھ اہم اور خاص قومی ذمہ داریاں عائد ہوں گی۔ جن کی ادائیگی سے انھوں نے اب تک "مجرمانہ غفلت" برتی ہے۔

پچھلے تلخ و ناگوار حالات و واقعات سے مجبور ہو کر مطالبۂ پاکستان پہلی بار ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں کی جانب سے کیا گیا۔ اور یہ برادرانِ وطن کی غلط سیاست اور انتہا درجہ تنگ نظری

"گنا نہ دیں بھیلی دیں"

کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ ۴۰ء سے پہلے سمجھوتہ کی صدہا کوششیں ہوئیں۔ حتیٰ کہ ۳۱-۳۲ء میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی قیادت میں "آل پارٹیز مسلم کانفرنس" نے جو معتدل ترین تجاویز کانگریس کے سامنے پیش کیں اُن تک کو نہ مانا گیا۔ پنجاب اور بنگال میں ایک نشست کی معمولی اکثریت تسلیم کرنے سے مولانا کو صاف انکار کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی وضعداری تو ان کو اب تک کانگریس سے لپٹائے ہوئے ہے۔ باقی سب مسلمان بد دل ہو کر اس سے علیحدہ ہو گئے اور اب بجا طور پر مسلمان چاہتے ہیں کہ اُن کے حصّہ کے ایک چوتھائی ملک کا بٹوارہ کر دیا جائے۔ روز روز کی حق تلفی اور لاعلاج خود غرضی سے عاجز آ کر مشترک جائداد کے نمبردار بڑے بھائی سے اپنی موروثی جائداد چھوٹا بھائی علیحدہ کرانا چاہتا ہے۔ اس میں بگڑنے اور خفا ہونے کی کیا بات ہے، یہ کام خوشی یا ناخوشی سے اب تو کرنا ہی پڑے گا۔

۱۷۰۷ء میں حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جب سلطنتِ مُغلیہ کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تو پورے پچاس سال تک مسلمانوں کی عیش کوشی اور غفلت سے فائدہ اُٹھا کر صوبہ بمبئی کے مرہٹوں۔ پنجاب کے سکھوں اور مغربی یُوپی کے جاٹوں نے ملک میں "رام راج" قائم کرنے کی نیت سے جو عالمگیر خونریزی اور ہولناک بدامنی پھیلائی تھی اور جس کا ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ دُرّانی والی جنگ پانی پت پر مسلمانوں کے حق میں کامیاب فیصلہ ہوا۔ بالکل ویسا ہی نقشہ آج کل انگریزی اقتدار کے خاتمہ پر جمتا ہوا نظر آرہا ہے۔ تاریخ اپنا سبق دُہراتی ہے۔ ابتداء میں ہمیشہ مسلمانوں پر عبرت ناک بلائیں نازل ہوتی ہیں، لیکن آخر میں بیدار ہو جانے پر فتحمندی و کامرانی ان کے قدم چومتی ہے۔

مسلمانوں کو چاہئیے کہ جب تک آل انڈیا مسلم لیگ کے "راست اقدام" کی تعریف و تشریح ہو اُس وقت تک دہ آنریبل ولبھ بھائی پٹیل کی نصیحت پر جو اُنھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے مشترک ہوم منسٹر (محافظ امن و قانون) کی حیثیت سے ۳۰ نومبر ۴۶ء کو ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے بمقام ناگپور کی ہے۔ عمل کریں۔

ہوم منسٹر صاحب بہادر کی نصیحت یہ ہے:-

"تمھیں یہ سیکھنا چاہئیے کہ تم پولس اور فوج کی امداد کے بغیر کس طرح غنڈوں کے خطرہ کا مقابلہ کرو۔ تمھیں خود حملہ آوروں کے مقابلہ میں اپنی اور اپنے پڑوسیوں کی حفاظت کے لئے غیر تشدّدانہ یا تشدّدانہ طور پر پولس مین بن جانا چاہئیے۔"

سیّد الطاف علی بریلوی

روہیلا ہاؤس
کانفرنس کمپاؤنڈ۔ علی گڑھ
یکم جنوری ۴۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

زبان اور کلچر

(از جناب ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی)

۱۹۳۹ء میں مجلّہ "نگار" میں "زبانی نزاع" کے عنوان سے جناب آل۔ احمد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ مضمون کی بحث آج بھی وہیں ہے جہاں ۱۹۳۹ء میں تھی، اس لئے ہماری خصوصی فرمائش پر جناب موصوف نے اپنے قیمتی خیالات بہت زیادہ مفصل و مدلل طریقہ پر قلمبند کر کے ہمیں عنایت کئے ہیں۔ یقین ہے کہ ہندی اُردو کے بارے میں ناظرین "مصنف" کی بہت سی ذہنی الجھنیں اس مقالہ کے مطالعہ سے صاف ہو جائیں گی۔ بعض تلخ حقائق بھی سامنے آئیں گے جن پر صبر و سکون کے ساتھ غور کرنا چاہئے۔ آج زبان کا مسئلہ جس قدر علمی و ادبی ہے اُس سے زیادہ سیاسی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ سیاسی اختلافات اور ہنگامے عارضی چیزیں ہیں اور ہمیں ماضی کی شاندار روایات اتحادِ لسانی کی روشنی میں مستقبل کے ہندوستان کے لئے ایک مقبول و عام فہم زبان کے لئے میدان تیار کرنا ہے۔

اس مقالہ میں آل۔ احمد صاحب نے مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو بخوبی واضح کیا ہے۔ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر صاحبان اگر اس بحث کو اپنے پڑھنے والوں تک پہونچانا چاہیں تو وہ بخوشی نقل کر سکتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

لسانیات یعنی زبانوں کا فلسفہ ایک علمی شغل ہے، جس کا کام لفظوں کی اصل اور معنی و مفہوم سے تعلق تحقیق و تلاش کرنا ہے۔ دیکھنے میں یہ ایک خشک سا مضمون معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں نہایت

دلچسپ مشغلہ ہے۔ تحقیق الفاظ کا ذوق پیدا ہو جانے کے بعد وہ طلسم کھلتے ہیں کہ آدمی اُن کے اندر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اس میں سے نکل آنا پسند نہیں کرتا۔

علمی نظر سے دیکھا جائے تو لفظوں کا بننا اور معنی اختیار کرنا، پھر ان کے مفہوم میں تبدیلیاں ہونے کا سلسلہ قوموں کے اخلاقیات کا "چارٹ" اور ان کی زندگی کی تاریخ کا "گراف" ہوتا ہے۔

اُردو میں فلسفۂ زبان پر جتنا کام ہوا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سخندانِ پارس کے بعد مولوی حمید اللہ خاں صاحب اجمیری کی تالیف ضرور ایک جامع کتاب ہے، مگر آج اسے بھی حالیہ نہیں کہہ سکتے۔

اس مضمون میں میرا مقصد تحقیق الفاظ کے متعلق بحث کرنا نہیں ہے، اور حقیقتاً میں لسانیات کا طالب علم بھی نہیں ہوں، اگرچہ طبیعت کو اس موضوع سے لگاؤ بہت ہے۔ مجھے اس وقت اُردو ہندی کی موجودہ چپقلش پر لسانیات کے بعض بنیادی اصول کے تحت نظر ڈالنا اور دیکھنا ہے کہ اس جھگڑے کی حقیقت کیا ہے۔ اس لئے کہ میرے خیال میں اس آویزش میں جو بحثیں کی جارہی ہیں، سراسر جذباتی ہیں، انھیں علمی اصول سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کو "بابائے اُردو" کا لقب حاصل ہے، اس کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہو کہ وہ انجمن ترقی اُردو کے "مستقل" سکریٹری بلکہ سب کچھ ہیں، اور اُردو عبارت ہی ان کی ذاتِ خاص سے ہے۔ چند سال ہوئے ان کا ایک طویل مضمون اُردو کی حمایت میں اخبار "مدینہ" میں شائع ہوا تھا، میں اس مضمون کی آخری چند سطریں نقل کرتا ہوں:-

"۔ ۔ ۔ یہ خیال بارہا سننے میں آیا ہے کہ زبان قدرتی چیز ہے اور بنانے سے نہیں بنتی۔ اس دھوکے میں نہ رہیئے گا۔ انسانی کوشش بڑی بدبلا ہے، یہ ہر مشکل پر غالب آجاتی ہے۔ وغیرہ"

یہ "بابائے اُردو" کی عبارت اور "ڈاکٹر آف لٹریچر" کے علمی دلائل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو کی حمایت یا ہندوؤں کی مخالفت میں جو کچھ کہا ہے، میں نفسِ مضمون سے محاکمہ تو نہ کروں گا لیکن اس عبارت میں، جو مضمون کا آخری حصہ ہے اور جسے قدرتی طور پر زیادہ پُر زور ہونا چاہیئے، میں علمی استدلال تلاش کرتا ہوں اور حیران رہ جاتا ہوں۔ "خیال کا سننا" نرالی اُردو ہے، اور "دھوکے میں نہ رہیئے گا" عبارت کی ثقاہت پر دال ہے۔ اہم ترین دلیل کہ "انسانی کوشش بڑی بدبلا ہے" علمی بحث پر حرفِ آخر ہے۔ اب اگر اس عبارت کو پڑھ کر کوئی کہے کہ ایک ڈاکٹر آف لٹریچر کی عبارت کا لہجہ یہ ہونا چاہیئے یا کوئی سوال کرے کہ کیا بازاری زبان اور علمی اظہارِ خیال کی عبارت کا فرق مٹ گیا ہے۔ تو کیا اس سوال کرنے والے کو الزام دیا جائے گا۔

رفعِ حجت کے لئے میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ "انسانی کوشش بڑی بد بلا ہے" لیکن ڈاکٹر صاحب سے بہ ادب سوال کروں گا کہ جناب نے بھی ایک کوشش فرمائی تھی اور انجمن ترقی اُردو نے ایک کتاب شائع کی تھی، جس میں آپ نے نئے مصدر اختراع کرائے تھے، جہاز سے "جہازنا" اور برق سے "برقانا" وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ اختراع انجمن کی تمام مطبوعات میں جاری کیوں نہ رہ سکی؟ اور کیا اُن کی یہ کوشش "انسانی کوشش" نہ تھی؟ اور اگر تھی تو اسے "بدبلا" کیوں نہ بنایا جا سکا؟

مجھ سے زیادہ ڈاکٹر صاحب واقف ہوں گے کہ ایک عرصے سے یورپ میں ایک بین الاقوامی زبان بنا لینے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ایک مرتبہ "ڈ لایک" نام دیا گیا۔ دوبارہ "اسپرنٹو" کہا گیا، لیکن ہر دفعہ ناکامی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھ ہر شخص کو اتفاق ہوگا اور شاید ڈاکٹر صاحب بھی اختلاف نہ کریں کہ یورپ کے لوگ اپنی کوششوں کو "بدبلا" بنا لینے کے زیادہ اہل ہیں کیونکہ ان کو بہت زیادہ ذرائع حاصل ہیں۔ لیکن ایک نئی زبان بنا لینے کے معاملے میں وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح اپنی کوششوں کو بدبلا نہ بنا سکے۔

چنانچہ آج ہمارے ملک میں جو لوگ ایک نئی زبان بنا لینے یا کئے موجودہ زبان کو بالکل بدل دینے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، اور جو لوگ ان کی اس کوشش کو دیکھ کر سہمے جا رہے ہیں یورپ والوں کی ان کوششوں کی ناکامی میں بہت کچھ سامانِ خود افروزی پائیں گے۔ یہ مثال پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ زبان کا مسئلہ ایک علمی بحث ہے مگر اسے ذاتی تشخص اور اغراض کی خاطر میدانِ سیاست کی فٹ بال بنا لیا گیا ہے۔

جس زمانے میں ہم آپ جی رہے ہیں وہ تلاش و تحقیق کا زمانہ ہے۔ علمی ترقیوں کا یہ عالم ہے کہ ہر بات کا ایک علم یا سائنس مرتب ہو گیا ہے اور ہر کام ایک آرٹ بنا لیا گیا ہے۔ تاش کا کھیل اور گھوڑ دوڑ سائنس بن گئے ہیں، عریانی اور فحاشی آرٹ بنا دی گئی ہے۔ ایسے زمانے میں اگر ملک کے رہنے والوں کے درمیان زبان کے بارے میں اختلافِ رائے پیدا ہو گیا ہے، باہمی میل جول کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے تو اسے علمی حدود کے اندر ہی سمجھنا سمجھانا چاہیے تھا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ غلط تعبیریں کر کے مذہبی تعصب کی آگ بھڑکائی جا رہی ہے اور صحیح سیاست کو بھلا کر زبان کے مسئلے کو "سیاسی" مطلب پورا کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔

انسان اسی زندگی کی تلخیاں کم کرنے یا اس کی گتھیاں سلجھانے پر فطرتاً مجبور اور مامور ہے کیونکہ اسی میں اس کی مسرت و راحت پوشیدہ ہے، اور مسرت و راحت کی تلاش انسانی زندگی کا اہم

مقصد اور راز ہے۔ چنانچہ ان تلخیوں کو دور کرنے اور ان گتھیوں کو سلجھانے کا اُسے اب تک ایک ہی نسخہ مل سکا ہے۔ وہ نسخہ ہے حکمت کی نظر اور فلسفیانہ فہم۔ فلسفے کی روشنی میں انسانی تلخیوں کا وجود باقی نہیں رہتا اور حکمت کی نظر سے اس کی گتھیاں از خود سلجھ جاتی ہیں۔

پھر کس درجہ حیرت کی بات ہے کہ ارسطو و فلاطون کے فلسفوں میں اصلاح کرنیوالے اور فلسفۂ ویدانت کے موجد اس مسئلے میں تعصب سے کام لیں جو تعصب کو قبول نہ کرتا ہو۔ میرا یہ پختہ خیال ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے میں تعصب سے کام لے کر اسے گندہ اور تکلیف دہ بنا سکتا ہے، مگر علم و حکمت کے اندر ارادے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا۔ اور اہلِ نظر و خبر اعتراف کریں گے کہ تعصب تو وہ قاتل چیز ہے جو اشیاء سے ان کی دلکشی چھین لیتی ہے، جو انسان سے انسانیت نکال پھینکتی ہے۔ زبان کی بحث خالص علمی بحث ہے، اس لئے آج بھی زبان کے معاملے میں تعصب کی نہیں چل رہی ہے۔ میں آپ کے غور و فکر کے لئے دو لفظ پیش کروں گا۔ "ڈاڑھی" کا مسئلہ مسلمانوں میں مذہبی مسئلہ ہے اور اسے "اللہ کا نور" کہا جاتا ہے۔ ماتھے پر سجدے سے جو نشان پڑ جاتا ہے اسے "گھٹا" کہتے ہیں اور مسلمان سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز وہ ہیرے کی طرح چمکے گا۔ ظاہر ہے کہ ڈاڑھی اور گھٹے کے ساتھ مسلمانوں کے کچھ مذہبی معتقدات وابستہ ہیں لیکن ان کے لئے جو نام قبول کئے گئے وہ ٹھیٹ ہندی ہیں، اور ان کے اندر ثقالت کے اجزاء بھی پوری قوت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس ذکر میں یہ نکتہ زیادہ دلچسپ ہے کہ لفظ "ساڑھی" میں ہم نے اور خود ہندی والوں نے بھی ثقالت کا جز و نکال کر "ساری" کر لیا ہے مگر "ڈاڑھی" اور "گھٹا" جوں کے توں چلے آ رہے ہیں۔ اُن کی ثقالت دور کر دینے کا ہمیں کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اسی ایک شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے کہ زبان تعصب کو قبول نہیں کرتی، اور اہلِ بصیرت کے لئے یہ ایک شہادت ہی کافی ہو گی، ورنہ اور بھی بہت ثبوت فراہم ہو سکتے ہیں۔

اس زبانی جھگڑے کا خلاصہ یہ ہے کہ "حضراتِ اردو" کو خطرہ ہو گیا ہے کہ عام لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے لفظ چھانٹ کر ان کی جگہ سنسکرت کے اجنبی اور ثقیل لفظ ٹھونسے جا رہے ہیں۔ اور اس کی اصل اور جڑ وہ اس بات کو قرار دیتے ہیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور ان کی ہر یادگار سے نفرت ہو گئی، اور ان کی اس کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمان نسلوں کی ذہنیت ہندوانہ ہو جائیگی اور ہمارا کلچر مٹ جائے گا۔

دوسری طرف کچھ "سنسکرتی سجن" کہہ رہے ہیں کہ دیش کو ایک جاتی بننے کے لئے ایک "راشٹر بھاشا"

ہونا چاہئے، اس لئے اپنی بھاشا میں جنتا کی سمجھ میں جو آسکیں، ایسے ویسی شبدوں (یعنی سنسکرت کی) کی بھتات ضروری ہے۔ اس سے یہ لابھ ہوگا کہ دوسری پرانت بھاشائیں اور راشٹر بھاشا اس آجائے گی، اور راشٹر بھاشا سارے ہندوستانیوں کی سمجھ میں آنے لگے گی۔

میں اس سے تو بحث نہ کروں گا کہ دونوں طرف کی یہ دلیلیں درست و معقول ہیں یا نہیں ہیں، میری کوشش یہ دیکھنے کے لئے ہوگی کہ یہ خطرے اور یہ ضرورتیں جو بیان کی جارہی ہیں، لسانیات یعنی فلسفۂ زبان کی ترازو میں کتنی وزنی اترتی ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبانیں بننے کے نظرئے کو سمجھا جائے۔

علم زبان کے انگریز ماہر ٹرینچ کا بڑا رتبہ ہے اور لسانیات کی بحثوں میں اس کا حوالہ ناگزیر ہوتا ہے۔ ٹرینچ سے پہلے تک تخلیق زبان کی بنیاد کا یہ نظریہ تھا کہ دوسری بہت سی ایجادوں کی طرح جن سے انسان نے اپنی زندگی کو آہستہ آہستہ سنوارا اور اسے معقول و شائستہ بنایا، زبان بھی اس کی ایک صنعت اور ایجاد ہے۔ واضح لفظوں میں یوں سمجھئے کہ انسان نے اس دنیا میں آکر حسب ضرورت چیزیں ایجاد کیں اور پھر انہیں درجہ بدرجہ ترقی دی، اسی طرح اس نے زبان ایجاد کی اور اس کو سنوارتا رہا۔ شروع میں اس نے بے معنی آوازوں سے کام لیا ہوگا، پھر خاص چیزوں کے لئے خاص آوازیں مقرر کی ہوں گی، کچھ اشاروں سے کام لیا ہوگا (یہ وہ آج بھی کرتا ہے) اور اس طرح ترقی پاتے پاتے زبان انسانی خیال و احساس کے اظہار کا حیرتناک ذریعہ بن گئی۔

اس نظرئے میں ٹرینچ کو یہ نقص نظر آیا کہ اس طرح زبان انسانی زندگی کا ایک حادثہ یا اتفاق قرار پاتی ہے۔ مگر دنیا میں انسانوں کی ایسی جماعتیں تو پائی جاتی ہیں جن کو ابھی اکثر ضروری صنعتیں معلوم نہیں ہیں اور ایسا کوئی انسانی گروہ نہیں دیکھا گیا جس کی ایک زبان نہ ہو اور اسے بولتا نہ ہو۔ چنانچہ ٹرینچ نے زبان کے بننے کا یہ نظریہ پیش کیا کہ جب انسان حیوانیت کے دور میں تھا اس وقت بھی اس کے اندر حیوانیت کی منزل سے نکل کر انسانیت اور عمرانیت کی منزل میں پہنچ جانے کی استعداد موجود تھی۔ قدرت نے اگر انسان کے اندر یہ استعداد نہ رکھی ہوتی تو یا تو وہ حیوانیت ہی کی منزل میں فنا ہو گیا ہوتا، یا اس سے آگے نہ بڑھ سکتا، یعنی انسان نہ بن پاتا۔ اس لئے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدرت نے انسان کو زبان بالکل اسی طرح بخشی جس طرح اسے عقل عطا کی۔ لفظ ہی عقل ہے۔ لفظ کے آئینے میں عقل انسانی اپنی صورت دیکھتی ہے۔ لفظ اور عقل ایک ہی چیز کے دو[2] نام ہیں، یونانی زبان میں ان دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ابتداء ہی میں انسانی لغت اور قواعد کی کتابیں بغل میں دابے رونما نہیں ہوگیا تھا، لیکن یہ بھی اتنا ہی درست ہے کہ اس کے اندر چیزوں کے نام رکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اور اس قابلیت کا موجود ہونا کبھی کارآمد نہ ہوتا اگر انسان کے اندر اس اہلیت اور استعداد کو بر سر عمل لانے کی فطرت بھی نہ ہوتی۔

ان دلیلوں کے بعد ٹرینچ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ زبان نہ تو بالکل انسان کی ایجاد اور اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور نہ تمامتر فطرت کا عطیہ ہے، زبان کو وجود میں لانے کے لئے انسان اور قدرت، دونوں کی کارفرمائی کو دخل ہے یہ فیصلہ عام سمجھ کے مطابق بھی معلوم ہوتا ہے، معمولی عقل کا آدمی بھی جب زبان کے مسئلے پر سوچنے بیٹھے گا تو پہلے اس کا خیال بچوں ہی کی طرف جائے گا کہ وہ شروع میں کس طرح بے معنی آوازوں سے کام لیتے ہیں۔ پھر شاید وہ بہرے، گونگوں کا دھیان کرے گا کہ اشارے ہی ان کی زبان ہوتے ہیں۔ اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ زبان بنتی تو آپ سے آپ ہے، مگر انسان اس کے بننے میں سہارا برابر دیتا رہتا ہے

ڈاڑھی اور گھٹنے کی مثال سے غالباً یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہماری ضرورت کے سامنے نہ تو ان لفظوں کا ہندی ہونا رکاوٹ بنا اور نہ ان کی ثقالت مانع ہوئی، ساتھ ہی ہمارے مذہبی مناسک بھی ناقص نہیں رہے۔ ٹرینچ کا نظریہ اسی سے ثابت ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس کا یہ نظریہ زیادہ سہل اور قابلِ قبول ہو سکتا ہے، کیونکہ قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ "ہم نے آدم کو علم الاسماء سکھایا" ٹرینچ نے بھی یہی کہا ہے کہ انسان کو چیزوں کے نام رکھنے کی صلاحیت دی گئی۔

جب مسئلے کی علمی صورت یہ ہے تو ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں کسی کا یہ کہنا کہ ہماری زبان مٹائی جا رہی ہے اور کسی کا یہ کہنا کہ دوسرے صوبوں کی زبانوں سے نزدیکی پیدا کرنے کے لئے سنسکرت کے لفظ زیادہ لئے جائیں، بالکل خلاف عقل تخیّل قرار پاتی ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونا چاہئیے کہ بعض حکماء نے دو ہی قوتوں کو مجرد کہا ہے، ایک محبت کی قوت جس سے اس وقت ہمیں سروکار نہیں دوسری علم کی قوت جو اس وقت ہماری گفتگو کا محور و مرکز ہے۔

ظاہر ہے کہ علم کا کوئی مذہب نہیں ہو سکتا، ہرچند مذہب کا علم اپنی جگہ پر ہے، زبان کا بھی ایک علم ہے، اور زبان اُن کی ہے جو اسے بولیں۔ شروع میں جن مسلمانوں نے چہرے پر "اللہ کے نور" اور پیشانی پر "کوہِ نور" کے لئے ڈاڑھی اور گھٹنے کے لفظ قبول کر لئے وہ بہرحال آج کل کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان تھے، اس لئے کہ قرنِ اول سے کئی سو سال قریب تر تھے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ

ان کے ذہن میں ہماری تمہاری زبان کا کوئی تخیل ہو سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستان کی یہ لنگوا فرنیکا وجود میں نہ آسکتی تھی، بلکہ پرانی کہاوت کے مطابق پانی پاس ہوتے ہوئے "آب، آب" کہتے مر جاتے۔
اب چونکہ علمی طور سے زبان کے بننے میں انسان کا ہات بھی ہے اس لئے اس کا پھولنا، پھلنا بولنے والوں کی ضرورتوں کے تحت ہوگا، اور چونکہ اسکے وجود میں آنے کے اندر قدرت کی کارفرمائی کو بھی دخل ہے۔ اس لئے جب حالات بدلیں گے، وقت کے تقاضوں کے تحت زبان میں تبدیلیاں ہو جانا لازمی بات ہے، اور اسلئے کہ یہ کارخانۂ عالم قائم ہی تغیر پر ہے، زبان کے اندر تبدیلیاں ہونے کو روک سکنا انسان کی قدرت میں بھی نہیں ہے۔

علم زبان کے طالب علم جانتے ہیں کہ لسانیات کے ماہروں نے یہ کلیہ تسلیم کرلیا ہے کہ تیس[۳۰] سال کے عرصے میں زبان کے اندر تبدیلی آجاتی ہے، بعض لفظوں کا مفہوم بدل جاتا ہے، بعض کے مفہوم میں کمی بیشی ہو جاتی ہے، کچھ لفظ ترک ہو جاتے اور کچھ نئے داخل ہو جاتے ہیں۔

زبان کے بولنے والوں کی ضرورت اور وقت کے تقاضے کی دلیل پر ایک تاریخی واقعہ شاید کچھ روشنی ڈال سکے، چند سال ہوئے محکمۂ آثارِ قدیمہ کو سرحد کے علاقے میں سلطان محمود غزنوی کے عہد کے کچھ سکے دستیاب ہوئے تھے جن پر کلمہ شریف کا سنسکرت ترجمہ ناگری رسم الخط میں کھدا کیا گیا تھا۔ محمود غزنوی سے یہ بات منسوب ہونا حیرت کا ہمالیہ ہے، مگر اس واقعے میں حیرت کے لئے اور بھی گنجائش ہے۔ "بسم اللہ" کا ترجمہ ہے "اَوْیک تیا کھے"۔ "رسول" کا ترجمہ "اوتار" اور محمد کا "جینا" کے لفظوں سے کیا گیا ہے۔ نام کا ترجمہ کیا جانا ایک طرفہ بات ہے مگر "جینا" جین مت کے معلم اول کا لقب ہے۔ سلطان محمود کو وہی لقب پیغمبرِ اسلام کے لئے اختیار کرنے میں تکلف نہ ہوا۔
سلطان محمود کے بعد بھی سولھویں صدی عیسوی تک مسلمان بادشاہوں کے سکوں پر دیوناگری حروف کھدا ہوتے رہے۔ تغلق عہد میں "شری غیاث الدین" ضرب ہوا۔ اور محمد تغلق کے ایک روپے پر لکشمی دیوی کی تصویر ضرب ہوئی۔

میں واقعی متجسس ہوں کہ ۹ مئی ۱۹۴۳ء کو جب محکمۂ آثارِ قدیمہ نے شملے سے یہ بیان شائع کیا تو اُسے پڑھ کر بعض مسلمانوں کی حالت کیا ہوئی ہوگی؟ کیا ان کا خیال اس طرف گیا ہوگا کہ وہ غزنوی جسے انگریز مورخوں نے ہندوؤں کی نظر میں اتنا قابلِ نفرت بنا رکھا تھا، وہ اس درجہ رعایا کی خاطر ملحوظ رکھنے والا تھا، یا اُنھوں نے یہ سرکاری بیان پڑھنے کے بعد محمود غزنوی کے نام کے ساتھ "علیہ الرحمۃ" کے بدلے کچھ اور کہا ہوگا۔ سلطان غیاث الدین اور محمد تغلق کو مسلمانی سے خارج کیا ہوگا، یا ان کی اِس

اسلامی رواداری پر فخر و مباہات کیا ہوگا؟

اس دَور میں پہنچ کر مسلمانوں کو ذہنیت کے ہندوانہ ہو جانے اور کلچر کے مٹ جانے کا ڈر بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ اس طفلانہ دلیل پر زور بہت دیا جاتا ہے مگر غور بالکل نہیں کیا گیا ہے "مزید ہندی الفاظ کا استعمال نہیں بلکہ محض داخلہ ہماری نسلوں کی ذہنیت کو ہندوانہ بنا دے گا" یہ کہتے ہوئے ہمیں مطلق خیال نہیں آتا کہ ہم صدیوں سے اسّی نوّے فیصدی ہندی الفاظ بولتے چلے آرہے ہیں، اگر واقعی الفاظ کا استعمال ذہنیت کو بدل سکتا ہے تو ہماری ذہنیت تو ہندوانہ ہو چکی ہے، اس کی احتیاط آج کیسی؟ ہم نے بالکل نہیں سوچا کہ چند نئے لفظ زبان میں داخل ہو کر اگر ہماری ذہنیت کو متاثر کر سکتے ہیں تو کس ذہنیت کو متاثر کریں گے؟ اسی کو نا جو ایک مدّت سے ہندوانہ بن چکی ہے؟ پھر ہماری زبان میں انگریزی کے لفظ بھی تو داخل ہوئے ہیں۔ ضرورت بے ضرورت، صبح سے شام تک ہم بیسیوں انگریزی لفظ بولتے رہتے ہیں، انگریزی زبان کو باضابطہ حاصل کرنے میں پندرہ سال اسی میں منہمک رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہماری ذہنیت انگریزی ہو جانا چاہئیے؟ پھر کیا ذہنیت کے بدلنے میں ایک مجادلہ برپا نہ ہو جانا چاہیئے، اُردو کا استعمال جس میں بکثرت ہندی الفاظ ہیں ہماری ذہنیت کو "ہندویت" کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی ہوگی اور انگریزی کا استعمال "عیسویت" کی طرف کھینچے گا، فتح کس کی ہو؟ اس کی روک تھام کا ہم نے کیا انتظام کیا ہے؟

اس ذیل میں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ الفاظ زبان میں داخل ہو جانے کے بعد ذہنیت کو متاثر نہیں کرتے بلکہ ذہنوں کے اندر ان لفظوں کو قبول کرنے کے لئے پہلے سے گنجایش پیدا ہو چکتی ہے۔ مولانا حالی مرحوم انگریزی ذہنیت کے انسان ہرگز نہ تھے، مگر اُنھوں نے بعض انگریزی لفظ بلا تکلف استعمال کئے (جو آج بالکل غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں) اُس وقت اُنکی ذہنیت ان لفظوں کے قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکی تھی، اور اُس وقت اُنھیں اُن لفظوں کی ضرورت بھی تھی۔ حالی کے زمانے تک ہماری زبان میں لفظ تخیل استعمال ہوتا تھا لیکن "اِمَے جی نیشن" کے مفہوم میں "تخیّل" کا لفظ جاری نہ ہوا تھا۔

غرض، یہ اسّی فیصدی ہندی کے لفظ ہمارے اسلاف نے ضرورت اور تقاضے کے تحت اختیار کئے تھے، اور اگر اتنی بڑی تعداد ہماری ذہنیت کو ہندوانہ نہ بنا سکی تو اب کچھ اور لفظ داخل ہو جاتے ہیں تو کوئی عقلی خطرہ نظر نہیں آتا۔ اور جہاں تک ذہنیت بدل جانے کا سوال ہے تو یہ تو صدیاں ہوئیں کہ ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مغل عہد سے پہلے سے ہندوستان کے مسلمان ٹھیٹا

ہندوستانی بن گئے تھے۔ اس ذکر میں شاید ایک تاریخی حقیقت یاد دلانا بے محل نہ ہوگا۔ سب جانتے ہیں کہ امیر تیمور ایک نہایت متشرع مسلمان تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اسے سکندر ثانی بننے کا سودا ہوگیا۔ اس وقت ہندوستان کے اندر کئی مسلمان بادشاہیاں قائم تھیں تیمور کے لئے یہ مشکل آپڑی کہ مسلمان پر مسلمان کا خون بہانا حرام ہے' اور اس وجہ سے اگر ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کو چھوڑتا ہے تو سکندری کافی رہی جاتی ہے۔ اس تردد کو دور کرنے کی صورت اس فتوے کی صورت میں نکلی کہ ہندوستان کے مسلمان صورت وسیرت' دونوں صورتوں میں غیر مسلموں سے مشابہ ہیں' اس لئے ان کا خون بہانا منع نہیں ہے۔ تیمور کی مشکل حل' اور سکندری حاصل ہوگئی۔ اس سے ہم یہ تو اخذ کر ہی سکتے ہیں کہ آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے ہندوستان کے مسلمان اور ہندو اس طرح شیر و شکر ہو چکے تھے کہ تیموری دربار کے علما کو فتوے صادر کرنے کا یہ آسان موقعہ مل گیا۔

کلچر کی گفتگو میں زبان اور ادب بھی نشانیاں ہیں اور موضوع کلام بنتے ہیں۔ کسی قوم کا کلچر اس کے ادب میں دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلے ایک آدمی کا کلچر اس کی گفتگو اور حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اب اگر میں "آپ" کی جگہ "تم" "یا" "تو" کہوں اور "جی" کے بدلے "ہاں" "یا" "ہوں" بولوں تو یقیناً آپ مجھے ایک شائستہ انسان نہ کہیں گے۔ پھر کیا حیرت انگیز ماجرا نہیں کہ جن دو لفظوں میں ہر وقت بولتا اور اپنی تہذیب وشائستگی کا ثبوت دیتا ہوں' وہ ہندی الاصل ہیں؟ کلچر کے باب میں ہمیں اپنے تہوار اور تقریبوں پر بھی نظر ڈالنا ہے اور ان لفظوں اور اصطلاحوں پر غور کرنا ہے جو ان تقریبوں کے موقعے پر بولی جاتی ہیں۔

شب برات ایک خالص اسلامی تہوار ہے۔ لیکن عام طور پر مسلمان جس طرح اس تہوار کو مناتے ہیں اس میں اور ہندوؤں کے شرادھ یا کناگتوں میں بڑا فرق نہیں ہے۔ دونوں کے یہاں پرکھوں کو پانی دیا جاتا ہے۔ بتوی کی صحنک مسلمانوں میں اسی طرح جلائی جاتی ہے جیسے ہندو عورتیں چومکھ جلاتی ہیں۔ تعزیہ داری اور رام لیلا میں نقل کے بہت سے پہلو ہیں۔ کالا دانہ اتارنا اور ٹونے ٹوٹکے ہندو مسلمانوں میں بالکل یکساں ہیں۔ ہندوؤں میں جس طرح بھوت پریت جھاڑا جاتا ہے مسلم صوفی بھی اسی طرح جھاڑتے ہیں اور منتروں کی طرح دعائیں بھی پڑھی جاتی ہیں۔

پیدائش سے پہلے' پیدائش کے وقت اور پیدائش کے بعد کی رسمیں دونوں میں مشترک ہیں۔ بچے کا نال ایک ہی طرح کاٹا اور گاڑا جاتا ہے۔ دوران حمل میں ستوانسا یا گود بھرائی کی رسم دونوں میں

ادا کی جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد چھوانی اور ستّوارا دونوں کے گھر منتا ہے، دونوں کے بچے گھٹی ہی پیتے ہیں اور یہ سب چیزیں اپنے ناموں سے پہچانی جاتی ہیں، نام ہندی ہیں اور رسمیں ہندوستانی غریب مسلمانوں میں ستوڑ کی رسم ابھی تک ہے۔ زچگی ہو چکنے کے بعد مکان کو نجاست سے پاک کیا جاتا ہے۔ چھٹی کی رسم بھی دونوں فرقوں میں عام ہے۔

شادی بیاہ کی رسموں میں نسبت یا منگنی، تاریخ مقرر ہونا یا لگن پڑنا، دونوں جگہ ہوتا ہے، شادی کے وقت کنگنا اور سہرا بھی باندھا جاتا ہے۔ دلہن کے دروازے پر دولھا کے چھڑیاں اور عروسی اٹین کے گولے مارے جاتے ہیں۔ یہ سب رسمیں عرب و ایران کی رسمیں نہیں ہیں، ہندوانہ رسمیں ہیں اور مسلمانوں نے بطیب خاطر قبول کر لی تھیں۔ بیٹی کے گھر کھانا کھانے سے دیہاتی مسلمان آج تک پرہیز کرتا ہے، یہ ایک راجپوتی آن تھی مگر سارے ہندوستان کی بہت اہم رسم بن گئی۔ سماج میں ایسا آدمی نہایت ذلیل اور گرا ہوا سمجھا جاتا تھا جو بیٹی کا کھا لیتا تھا۔

موت کی رسموں میں تیسرے دن کی قرآن خوانی "پھول" یا "تیجہ" کہا جاتا ہے۔ دسواں، بیسواں، چالیسواں اور چھماہی ہندی نام ہیں، اور ہندوانہ رسمیں مگر مسلمانوں میں برتی جاتی ہیں، موتے کا کھانا مسکینوں کو اسی طرح کھلایا جاتا ہے جیسے برہمن جمائے جاتے ہیں۔ مسلمان برادریوں میں مرے ہوئے کی "روٹی" دی جاتی ہے۔ ساری برادری کی دعوت ہوتی ہے مگر اسے دعوت نہیں "روٹی" کہا جاتا ہے۔ المختصر، پیدائش، شادی اور موت سے متعلق تقریباً سب رسمیں دونوں فرقوں میں مشترک ہیں۔

مسجد کے گنبد پر بھی وہی کلس دکھائی دیتا ہے جیسا مندر پر لگا ہوتا ہے۔ وضو کے برتن کو "لوٹا" یا "بدھنا" ہی کہا جاتا ہے۔ یہ نام ہندی ہیں حالانکہ وضو کرنا ایک مذہبی رکن ہے۔ تعزیے کے اوپر کا حصہ "چھتری" کہلاتا ہے، حالانکہ ہندوؤں میں چھتری اس عمارت کو کہتے ہیں جو مُردے کے "پھول" یعنی اس کی جلی ہوئی ہڈیوں پر بطور یادگار بنوائی جاتی ہے۔

یہ سب چیزیں جو گنوائی گئی ہیں مسلمانوں کے نیم مذہبی معاملات سے متعلق ہیں۔ تلاش کیا جائے تو بے شمار مثالیں فراہم ہو سکتی ہیں۔ لیکن کلچر کی بحث میں ایک اور بھی اہم نکتہ یاد رہنا چاہیے، کلچر کوئی جامد شے نہیں بلکہ ایک نامیاتی چیز ہے۔ کلچر کا دائم متغیر ہونا اس بنا پر ہے کہ زندگی متغیر ہے۔ اور تبدیلی و تغیر میں ایک قوم کی کلچری باتیں دوسری میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ایک قوم کے کلچر میں قدیم قوموں اور بعید ملکوں کے کلچر کی موجودگی مسلّمہ نظریہ ہے۔ مثلاً مسلمانوں کی اس مذہبی رسم کی کہ مُردے

کے ساتھ توشے کی روٹی جاتی اور قبرستان میں کسی محتاج کو دی جاتی ہے اور ہندوؤں کی پنڈدان
کی رسم میں مناسبت ہے اور ہندو مسلمانوں کی یہ رسم اصلاً پرانے مصریوں کی رسم کا تسلسل معلوم
ہوتی ہے فراعنہ مصر کی لاشوں کے ساتھ زندگی کی ضروریات قبروں میں دفن کی جاتی تھیں۔ ان
کے ساتھ غذائیں بھی رکھی جاتی تھیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ حشر کے دن مردے اٹھیں گے
تو انھیں بھوک لگے گی۔ تین مختلف مذہبوں کے ماننے والوں میں ملتی جلتی رسم کا جاری ہونا اور تینوں
مذہبوں میں اس رسم کا تعلق مذہبی معتقدات سے ہونا خاص اہمیت رکھتا ہے۔

کلچر کی بحث میں موسیقی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں موسیقی بھی ایک شعبہ ہے۔
جو ہندوستان کے مختلف حصوں کو ایک وحدت ثابت کرتا ہے۔ یہ موسیقی مسلمانوں کے آنے سے پہلے
دھرم تک محدود اور عبادت کا ذریعہ تھی۔ لوگ مندروں میں مورتی کے سامنے الاپ کر کے اپنے عقیدت
جذبات پیش کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے اسی موسیقی کو سوسائٹی کی چیز بنایا اور خیال ٹپا ٹھمری وغیرہ کا اضافہ
کر کے اسے عوام تک پہنچایا۔ مسلمانوں نے اس فن کے بڑے بڑے باکمال پیدا کئے۔ حضرت امیر خسرو کا
نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس صدی کے شروع تک صاحب کمال گائک بیشتر مسلمان تھے۔ مسلمان
اسی موسیقی کو صدیوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ سب ہندو سنتے ہیں۔ ان مسلمانوں کو چھوڑ کر جو حجاز کی
گت پر تھرکنا سیکھ گئے ہیں وہ لوگ بھی جو ہمارے قدیم کلچر کو جدا مانتے ہیں۔ اسی موسیقی سے لذت و انبساط حاصل
کرتے ہیں اور اسی پر وجد کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس حقیقت امر کو کیسے جھٹلائیں گے کہ ہندوستانی موسیقی
نے کچھ کلچری اجزا ان کے خون میں شامل کر دیے ہیں اور یہ اثر کسی کوشش سے باطل بھی نہیں کیا جا سکتا
اصلاً موسیقی ایک ہونے کی صورت میں ہندوستان کے مختلف طبقے اگر جدا جدا کلچر کے مدعی ہوں تو میرے
خیال میں دنیا کا کوئی ذی عقل انسان اس کی تائید نہ کرے گا۔

اس گفتگو میں ایک دلچسپ نکتہ یہ بھی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو پر جو فرمائشی گانے سنائے جاتے ہیں
اگر آپ ان پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ اردو کی غزل ہو یا ہندی کا گیت اس کے پسند کرنے والوں میں
ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی اور پھر یہ کہ ملک کے مختلف حصوں کے ہیں۔ ان لوگوں
کے طبع و مزاج کی یہ یک رنگی ان کے ذوق و پسند کی یہ یکسانیت جدا کلچر کے مدعیوں کے لئے ایک مستقل چیلنج
ہے۔ اور دوسرا مستقل چیلنج تو ہمارے نئے فیشن کے بزرگوں کی بغل میں رہتا ہے یعنی ان کی بیگمیں یا وائسرائے اور
گورنروں کی پارٹیوں میں نہ صرف شریک ہوتی ہیں بلکہ انکی لچکے دار ساریاں اور ماتھے کی بندیاں ان کے ادعا
کا سب سے بڑا ابطال ہیں۔

میرے لئے احساس برتری کا وہ نظارہ نہایت قابل رحم ہوتا ہے جب کوئی حضرۃ اردو سنسکرت کا بعض نامانوس لفظ سن کر ناک بھوں چڑھاتا یا شکر خند کے پردے میں طنز کرتا ہے اس سے وہ شخص مجھے اپنی جہالت کا یقین دلا دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا اعتراض لفظ کی ثقالت پر ہوتا ہی اور ثقالت الفاظ کی اجنبیت کے ساتھ ہے۔ یہ صاحب خود دن بھر میں ہزاروں لفظ بولتے ہونگے جو نہایت درجہ ثقیل ہوتے ہیں، مگر کثرت استعمال نے ان کی ثقالت دور کر دی ہے۔ ڈاڑھی اور گھٹنے کے علاوہ بھی بہتیرے لفظ ہیں جن کا مترادف مشکل ہی سے ملیگا۔ جیسے بھونڈا، ٹھنٹ کھٹ، گھونگٹ، اینڈا بینڈا، گھاٹو پ، جھٹ پٹا، الٹ پلٹ وغیرہ۔ یہ الفاظ اشٹرپتی سے زیادہ ثقیل ہیں، فرق صرف مانوس اور اجنبی ہونے کا ہے۔

لفظوں کی ثقالت کے باب میں یہ مسئلہ ایسے لوگوں کے سامنے ہے ہی نہیں کہ تحریری لفظ ایک علامت ہے صوتی لفظ یعنی آواز کی۔ اور سر رچرڈ پیجیٹ تو صوتی لفظ کو بھی اصل لفظ نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ اصل تو وہ حرکات ہیں جو ہمارے اعضائے نطق سے صادر ہوتی ہیں، آواز کے یہ مخرج جب حرکت کرتے ہیں تو ہمارے سانس لینے کا نتیجہ آواز ہوتی ہے۔ مگر چونکہ ہمارے حلق کی یہ نظر نہ آنے والی حرکتیں اپنے ثانوی یا دوسرے وصف یعنی آواز کے ذریعے سے ایصال ہوتی ہیں اس لئے آواز کو ان حرکات کی علامت قرار دے لیا گیا ہے۔

اس اصول کے تحت دیکھئے تو ہماری زبان ہی ایک ایسی خصوصیت کی مالک نظر آتی ہے کہ اس کے اندر انسانی حلق سے نکلنے والی ہر آواز کے لئے حرف موجود ہے، اور ہمارے حلق کی ساخت بھی ایسی ہے کہ ہر تلفظ کو ادا کر سکتی ہے۔ بعض ملکوں کی زبانیں اور بعض قوموں کے گلے کی ساخت بعض تلفظ کو ادا نہیں کر سکتی، یا بعض قسم کی آواز نکالنے سے عاری ہے۔ اس صورت میں ثقالت پر ناک بھوں چڑھانا فطرت کا مونھ چڑانا معلوم ہوتا ہے۔

میں مانوں گا کہ ثقالت پسندیدہ شے نہیں ہے، لیکن باد نے تامل دیکھا جا سکتا ہے کہ یا تو استعمال سے لفظوں کی ثقالت باقی نہیں رہتی یا اس لفظ میں سے ثقیل جزو گرا دیا جاتا ہے میں ایک لفظ "چھپر کھٹ" کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ اس کے اندر ثقالت کے تمام اجزا موجود ہیں لیکن اس کے مفہوم میں راحت و نفاست عشرت تموّل اور اس کے تعلقات کے دوسرے بہت سے تصورات، بیک آن ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں اور ان تمام مفاہیم کو ادا کرنے کے لئے ایک واحد لفظ دوسرا پیش نہیں کیا جا سکتا دوسرا لفظ "گھونگھٹ" پیش کرونگا۔ اس لفظ کے ساتھ امیال و عواطف کی جو دنیا ہے، اور وجدانیات کے لئے ضمناً کچھ مسالا

فراہم ہو جاتا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہندوستانی زبان کے ادب کا کتنا حصہ ہے جو اس لفظ اور اس کے متعلقات پر مبنی ہے؟ اور آپ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ادب جو اس لفظ سے پیدا ہوا ادب کی جان نہیں ہے۔ "وکرما دیت" ہماری زبان میں "بکرما جیت" بولا جاتا ہے۔

کسی زبان میں ایک لفظ کے کئی کئی معنے ہونا اور ایک ہی مفہوم ادا کرنے کے لئے متعدد لفظوں کی موجودگی اس زبان کے تموّل کی دلیل ہے۔ اس حقیقت کا احساس شاعروں کو زیادہ ہوتا ہے کہ کسی لفظ کا ایک رکن کم یا زیادہ ہونا شاعر کے لئے کس ذہنی تکلیف اور روحی اذیت کا سبب بنجاتا ہے اور بالآخر یا تو بری طرح ادا کرتا ہے یا اس خیال کا خون ہی کرنا پڑتا ہے۔ جس کے ساتھ شاعر کا دل بھی خون ہو کر رہجاتا ہے اس لئے یہ بات تو زبان کی ضرورت میں داخل ہے کہ اس کے اندر ہم معنیٰ اور قریب المعنیٰ الفاظ کی بہتات ہو۔ ہمارے موجودہ ذخیرے میں ایسے مترادف لفظ ہیں اور اُن سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا جاتا ہے۔ شجر اور درخت کے ساتھ پیڑ کا لفظ بھی ہے! اور نالی اور موری کے ساتھ بدرو بھی ہے۔ یہ الفاظ کبھی ہمارے لئے قباحت کا موجب نہیں بنتے۔ پھر اگر مضمون یا موضوع کے لئے "وشنے" بھی ہو۔ وطن کے لئے جنم بھوم اور ملک کے لئے "راشٹر" بھی ہو تو عقلاً کسی زحمت کا امکان نظر نہیں آتا۔ سیاسی اختلافات کیوجہ سے "راشٹر یہ" کے لفظ پر غور کئے بغیر اس کی تضحیک کی گئی۔ مگر فی الواقعہ اس مفہوم کے لئے ہم کوئی دوسرا لفظ پیش نہیں کر سکتے۔ مگر ان نفرت کرنیوالوں کی بدولت یہ لفظ اب اردو میں داخل ہو گیا۔

اس ذیل میں یہ علمی نکتہ نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ کوئی دو لفظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے۔ البتہ قریب المعنیٰ ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ ہماری زبان کئی زبانوں کے میل سے بنی ہے اس کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ بالکل ایک ہی مفہوم کے لئے کئی لفظ مختلف وزن کے موجود ہوں۔

اردو کے حامی جن کو ہندی الفاظ سے تنفر کہنا بھی اتنا ہی درست ہوگا ضروری اور غیر ضروری کی دلیل پر بہت زور دیتے ہیں۔ مگر اپنی زبان کے یہ نادان دوست اس معاملے میں بھی غور و فکر سے کام لینا پسند نہیں کرتے جو نئی غور و فکر کا کام انگریزی زبان میں WOOD اور FOREST پہلے سے موجود تھے مگر جنگل کا لفظ اس وقت لے لیا گیا جب ہندوستانی "کالا آدمی" اور اس کی زبان غلاموں کی زبان تھی۔ اس پر کسی انگریزی بولنے والے نے اعتراض نہیں کیا کہ "بلا ضرورت" یہ نیا لفظ کیوں لیا جاتا ہے۔ اسی طرح بازار، ڈکیت اور لوٹ کے لفظ انگریزی زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ حالانکہ انگریزی میں ان مفاہیم کے لئے لفظ موجود تھے۔ مجھے حیرت ہوئی جب میں نے کسی کتاب میں یہ پڑھا کہ یوکرین کے پایۂ تخت کیف میں ایک سڑک کا نام بازار پر ہے۔

چینی زبان میں ایک لفظ ہے "کاؤ ٹاؤ" اس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے یہاں "جی حضوریوں" کا عمل ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اسلوب موجود تھے مگر اس کا استعمال ہونے لگا اور کوئی معترض نہ ہوا کہ یہ ٹیڑھا بانکا لفظ ہم سے ادا نہ ہوگا۔

زبانوں کی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں اور ہر شخص معمولی توجہ سے سمجھ سکتا ہے کہ زبان کے اندر ردّ و قبول کا فطری عمل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنے اس عمل کے لئے ہماری کسی کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جہانگیر کو لفظوں میں تصرّف کرنے اور نئے لفظ گڑھنے کا شوق تھا اس نے بہت سے لفظ بنائے مگر آج کوئی باقی نہیں۔ نور جہاں نے نئی وضع کی چوڑیاں تیار کرائیں' ان کا نام "جہانگیریاں" رکھا آج بھی وہ "جنگیریاں" ہی کہلاتی ہیں۔

پچھلے دس بیس برس میں ہم نے انگریزی کے کچھ لفظوں کے ترجمے یا مترادف لفظ وضع کئے جن میں سے بیشتر نامقبول ہوگئے "سوسائٹی" کے لئے ہم نے "ہیئت اجتماعیہ" تراشا مگر قبول نہیں کیا گیا۔ اور اس کی جگہ "سماج" کا لفظ زبردستی اس وقت گھس آیا جب ہندی اردو کا جھگڑا زوروں پر تھا۔ "گارڈن پارٹی" کا لفظ ہر چھوٹا بڑا سمجھتا ہے' مگر اس کے بدلے "عصرانہ" علی گڑھ یونیورسٹی کے حلقے سے باہر کوئی نہیں بولتا۔ "پبلک" کے مفہوم میں ہم نے "جمہور" کا لفظ چلانا چاہا مگر پبلک نے اسے "پبلک" ہی رکھا۔ اور "ڈیماکریسی" کے معنی میں "جمہوریت" کا لفظ ہر وہ شخص سمجھتا ہے جو اخبار پڑھ سکتا ہے۔ "اکچوئل" پڑھے لکھے لوگوں کی زبان سے بھی بمشکل ادا ہوتا ہے مگر "پروگرام" بچہ بچہ بولتا ہے۔ ایسٹ انڈیا ریلوے نے ایک گاڑی چلائی' کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کا نام "طوفان میل" کس نے رکھا' مگر یہ نام ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ گیا' یہاں تک کہ اس نام کا ایک فلم بن گیا۔

ضرورت ہو یا نہ ہو مگر عوام میں "فےور" بمعنی طرفداری' "پیٹنٹ" بمعنی نقطہ' "پارٹ" بمعنی جنبہ داری' اور ایسے ہی بیسیوں لفظ بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ ہندی کے بھی کچھ لفظ اسی زمانے میں عام فہم ہوگئے ہیں جیسے ستاگرہ' آکاش' شدھی' سنگھٹن' نیتا' سماج اور جتھا وغیرہ۔ غرض یہ کہ زبان مسلّمہ طور پر ایک عضو ذی حیات اور جاندار شے ہے' وہ ہر اس غذا کو الٹ دیتی ہے جو اسے مرغوب نہ ہو اور ہر ثقیل چیز کو جسے اس کی طبیعت قبول کرے ہضم کرکے جزو بدن بنا لیتی ہے۔

دوسری طرف کچھ "سخن گسترانِ سخن" ہیں جو زبانوں کے بننے بگڑنے اور بدل جانے کے اصول سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھائی عام طور سے چالو اور سمجھے جانے والے سبک اور آسان لفظوں کو چھوڑ کر موٹے موٹے اجنبی لفظوں کو ٹھونس رہے ہیں' ایک نئی بھاشا بنا لینے کی دھن میں ہیں

اس میں اُنھوں نے جو فائدہ سوچا ہے، ہوسکتا ہے وہ حاصل بھی ہوجائے، اگر ہندوستانیوں کو ایک جاتی یا متحدہ قومیت بنالینا جس کا یہ بھائی پرچار بھی کر رہے ہیں، دشوار ہوتا جارہا ہے۔ بناوٹی طور پر کچھ شبد لیکھوں اور بھاشنوں میں بولے تو جاسکتے ہیں، جن کا کچھ دن بعد مرجانا بھی ممکن ہے لیکن انکے چالو ہوجانے کی صورت میں بھی کوئی بڑا فائدہ تو نہ ہوگا۔ اس بات کی جو قیمت دیجا رہی ہے وہ بہت زیادہ ہے، اول تو خود ان بھاشنوں کا مطلب پورا نہیں ہوتا اس لئے کہ ہندو عوام اور خاص کر دیہاتی لوگ، ان کی زبان کو بہت کم سمجھتے ہیں، اور دوسرے اس سے قومی نفاق بڑھ رہا ہے۔ قومی ایکتا نہ ہوسکنے کا نتیجہ برطانوی وزارتی مشن کی کارروائیوں میں اور اس کے بعد کلکتے کے ہولناک فساد کی صورت میں ان کے سامنے ہے، اور وہ اگر چاہیں تو اسی پر سے آیندہ کے حالات کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

اب جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سو وہ ہندی کے اسّی فیصدی لفظ صدیوں تک بولتے رہنے کے بعد جو ہیں سو ہیں، اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے یہ متعصبانہ طرزِ عمل یا غلط کاری انکو نہ اچھا ہندو بنا سکتی ہے اور نہ سچا انسان۔ رہ گیا یہ سوال کہ "راشٹر بھاشا" کو دوسرے صوبوں کے لئے آسان اور قابلِ فہم بنایا جائے، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس رستے میں سچائی اور حقیقت سے آنکھ چرائی جارہی ہے مرہٹی، گجراتی، اور بنگلہ زبانوں میں صدیوں سے عربی، فارسی لفظوں کا میل جول ہوچکا ہے۔ اور اگر مسلم عنصر زبان میں داخل ہوجانے سے ہندوؤں کا کوئی نقصان ہونا ممکن ہے تو وہ آج سے بہت پہلے ہوچکا ہے۔ اور اگر ہندی اور سنسکرت الفاظ کو زیادہ استعمال کرنے سے مسلمانوں کا کوئی نقصان متصور ہوسکتا ہے تو وہ بھی پہنچ چکا۔ تلاش اس کی ہونا چاہئے کہ وہ نقصان آخر تھا کیا؟

ہندی کے پرچارک بھائیوں کے تعصب کی ایک شہادت تو یہ ہے کہ انھیں عربی کے ساتھ فارسی شبدوں سے بھی نفرت ہوگئی ہے، حالانکہ فارسی اور سنسکرت ماں جائی بہنیں ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ فارسی مسلمانوں کے ساتھ آئی۔ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹانے کی مثال اس سے بہتر کیا ہوگی؟ فارسی کے ساتھ اردو بھی آریائی زبانوں کی برادری میں شامل ہے۔ اور علمی شہادتوں کو نہ ماننا عقلمندی کی دلیل نہیں کیا جائے گا۔ غور سے دیکھا جائے تو دوسرے صوبوں کی زبانوں کو "راشٹر بھاشا" سے نزدیک کردینے کے نظریے کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ دراوڑی زبانوں کو ہندی یا سنسکرت بنادیا جائے۔ یہ کوشش ایک جاہلانہ خیال سے زیادہ درجہ نہیں پاسکتی "ایک برادری کی زبانوں سے بغض اور نفرت" اور دوسری برادری کی زبانوں سے ناتا جوڑنا یہ ایسی عقلمندی کا کام ہے جو شدید قسم کا تعصب ہی کراسکتا ہے۔

ہماری تمہاری زبان کے قضیئے میں اگر یورپ کی ایک مثال کو سامنے رکھا جائے تو ممکن ہے کہ ہم کوئی مفید سبق حاصل کرسکیں۔ یورپ کے بین الاقوامی یا "انٹرنیشنل" معاملوں میں ایک مدت سے اور بالکل فطری طور پر فرانسیسی زبان استعمال ہوتی تھی۔ تمام عہد نامے اسی میں لکھے جاتے تھے مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد سے اس کی جگہ انگریزی لے رہی ہے۔ اس کی نہ تو انگریزوں نے کوشش کی تھی اور نہ فرانس والوں نے واویلا کی۔

یہ سنسکرتی بھائی شاید اس بات کو بھول گئے ہیں کہ سنسکرت صحیح معنی میں عوام کی بول چال کسی زمانے میں بھی نہ تھی۔ اور وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر رہے ہیں کہ جنتا کی ضرورت نے جب پالی کو رواج دیکر سنسکرت کو بارہ پتھر باہر کر دیا تھا۔ اس زمانے کو بیتے ہوئے ڈھائی ہزار برس گذر چکے ہیں۔ اور مڑ کر دیکھنا سمے کا سبھاؤ نہیں۔ انسانی ارتقاء ایک منزل سے دو دفعہ نہیں گزرتا ہمارے یہ بھائی اگر اس پروپیگنڈے کے زمانے میں اپنے آپ کو سچا ٹھیرا لینے میں کامیاب بھی ہوگئے تب بھی وہ خود اپنے ساتھ سچے نہ ہونگے۔ آج بھی وہ اپنے بیوی بچوں سے جس بھاشا میں بات چیت کرتے ہیں وہ وہ بھاشا نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے لیکھ لکھتے اور بھاشن دیتے ہیں۔

بھاشا ودیا یا علم زبان کے ماہروں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ لفظ یا شبد فوسلی شاعری، فوسلی اخلاقیات اور فوسلی تاریخ ہوتے ہیں۔ فوسل (FOSSIL) ایک علمی اور بین الاقوامی اصطلاح ہے اور اس کا مفہوم اُن قدیم آثارِ زندگی کے برآمد کرنے سے ہے جو زمین کے اندر دفن ہوچکے ہیں، اور جنکو برآمد کرکے بہت پرانے زمانوں کی تاریخ قیاس کی جاتی ہے۔ اس ذیل میں لفظ "ترک" پر غور فرمایئے گا۔ تو تاریخ معاشرت کا ایک فلم آپ کے سامنے سے گذر جائیگا۔ ترک مسلمان ہندوستان میں حملہ آور کی حیثیت میں داخل ہوئے۔ ملک کے باشندوں میں ان کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ لفظ ترک نے ایسے آدمی کے معنی اختیار کرلئے جو قابل نفرت ہو یعنی "ترک" اور "ملکش" ہم معنی لفظ بن گئے پھر مسلمان اس ملک میں بس گئے۔ باہم معاملت داری ہونے لگی۔ نفرت کم ہوتی گئی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ایک امر واقعہ بن گیا۔ اجنبیت ختم ہوگئی باہمی میل جول نے دوستی کی بناڈالدی محبتیں بڑھنے لگیں۔ انسانی فطرت نے اپنا کام کیا۔ اور بتدریج اتنا میل ملاپ بڑا کہ رام اور رحیم ایک ہی چیز ہوگئے۔ یہاں تک کہ لفظ ترک نے "ناپاک" کے معنی ترک کر دیئے اور وہ مفہوم اختیار کرلیا جو اس لفظ کو فارسی ادب میں ملا ہوا تھا۔ فارسی ادب کے اثر سے ہندی میں بھی لفظ ترک پیارے کے مفہوم میں بولا جانے لگا۔ آپ نے یہ ٹھمری ضرور سُنی ہوگی:ع

"ترکوا نے گھیر لئی رے........"

یہ ہے مثال لفظوں کی فوسلی شاعری، فوسلی اخلاقیات اور فوسلی تاریخ ہونے کی۔ اس لفظ کے اندر یہ تینوں پہلو بیک وقت سامنے آجاتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم اجتماعی طور پر اور علمی نظر سے غور بھی کریں۔

اب اگر یہ سچ ہے کہ یہ "پراچینی بھائی" ہندوستان میں مسلمانوں کی ہر یادگار کو مٹا کر چھوتے بننے پر تُل گئے ہیں تو کیا انھوں نے سوچ لیا ہے کہ ان کا یہ خیال کہاں تک اچھا، کس حد تک ممکن اور کس طرح قابلِ عمل ہوگا؟ زبان کے مسئلے میں چونکہ یہ کوشش غیر فطری ہے، ارتقاء کے خلاف ہے، اس لئے ناکام رہے گی لیکن اگر بحث کی خاطر مان بھی لیا جائے کہ انھیں کامیابی ہو جائے گی تو کیا یہ حقیقت نہ ہوگی کہ اس طرح وہ اپنی کئی صدیوں کی تاریخ معاشرت کے خزانے کھو بیٹھیں گے؟ کیا اُس سر زمین مسلمانوں کے ساتھ اپنی رواداری اور بھائی چارے کی زندہ اور پیش بہا شہادتوں کو فنا کر دیں گے؟

یہ مہاشے اس ناقابل انکار حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ تین ہزار برس پرانا زمانہ زندہ نہیں کیا جا سکتا، اور اگر وہ کسی طرح اس کا احیاء کر بھی سکے، یہ معجزہ دکھا بھی سکے تو اُسے نئی دنیا کے نقشے میں کیسے بٹھایا جائے گا یا پنڈت جواہر لال کے لفظوں میں "FIT IN" کیسے کریں گے؟ یہ سچن ایک اور سچی بات کو بھی جھٹلا رہے ہیں، سب نے مانا ہے کہ زبان اور کلچر کی رکھوالی عورت ہے۔ اور ہندوستان کی عورت نئی سڑک پر چل پڑی ہے۔ یہ مہاشے پیتمبر باندھیں، کرتے شلوکے میں کپڑے کے بٹن لگائیں--- ڈاڑھی بڑھا کر اس میں گانٹھ لگالیں، سر کے بال بھی بڑھالیں اور مہابھارت کے زمانے کی پوری تصویر بن جائیں، مگر ہندو عورت تو سارنی میں "پوڈر" لگاتی جا رہی ہے، کہنیوں تک پہننے کے لئے سرخ و سفید چوڑیاں مانگتی ہے، پونا فراک بنوا رہی ہے اور پاؤں میں سینڈل یا نہایت وضع دار چپل ڈالتی ہے۔ پچاس برس کی تگ و دو کے بعد اگر آج ہندو عورت کی معاشرت اس طرح بدلتی دکھائی دے رہی ہے تو یہ بھائی ناکام تو ہو چکے۔ اس لئے کہ ہندو گھروں کی بدلتی ہوئی معاشرت نئی روشنی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔

چنانچہ آج کے حالات دیکھ کر آگے آنے والے زمانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو ہندوستانی اور اس کے ساتھ ہندو عورت کا بدلتا ہوا تصور دیکھ کر ان "پراچینیوں" کو اپنی قوتِ عمل کو تفرقہ و نفرت کے کام چھوڑ کر کسی قومی تعمیر کے کام میں صرف کرنا چاہئے، اور اگر گزرے زمانے کے واقعات کو دیکھ کر آنے والے زمانے کو قیاس کیا جا سکتا ہے تو ان بھائیوں کو پچھلے پچیس سال کی سیاسی تحریکوں کی روشنی میں

دیکھنا چاہئے کہ آگے چل کر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں سماج واد یعنی سوشلزم کے وچار اور خیال پھیل کر رہیں گے، اور سماج واد اس پراچینی پاگل پن کو ایک منٹ کے لئے نہیں سہار سکتا، اس لئے کہ سوشلزم ایک عالمگیر تحریک ہے، پچانوے اور اٹھانوے فیصدی مزدور اور کسان کی تحریک ہے۔

یہ پراچینی بھائی ہندوستان کو تین ہزار برس پیچھے لے جانا چاہتے ہیں، اس الٹے پاؤں چلنے میں ان کے ساتھ بنگال جائے گا یا پنجاب؟ مدراس ساتھ ہوگا یا کشمیر؟ کیا یوپی کے بھی سارے ہندو الٹے پاؤں چلیں گے؟ کشمیری اور کایستھ اس پر راضی ہو جائیں گے؟ بالفرض انھوں نے شہر کے رہنے والے پڑھے لکھے اور خوشحال ہندوؤں کو بے بھی لیا تو نیچ ذاتیں اور مزدور طبقہ یا دیہات کا کسان ان کے ساتھ ہولے گا؟ کسان مزدور آج اپنا انسانی حق مانگ رہا ہے اور پراچین زمانے میں اسے جینے کا حق بھی اپنا حق معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس رجعت پسندی (REVIVALISM) کو یہ خیال بھی نہیں ہے کہ اگر الٹے پاؤں چلنے ہی میں فائدہ ہے تو اس کی تکمیل تو ہمالیہ کی کھوؤں میں رہنے سے ہوگی، جہاں نہ تو موٹر کے گراج ہوں گے، نہ ہوائی جہازوں کے ہینگر، اور نہ ریلوے انجنوں کے شیڈ، جہاں نہ ٹائپ رائٹر کی ضرورت ہوگی، نہ ٹیلیفون کی۔ اس سے زیادہ طرفہ اور نرالی بات کیا ہوگی کہ انڈسٹریل پلاننگ بھی سوچا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ڈھائی تین ہزار برس کے زمانے کو واپس لانے کی کوشش بھی جاری ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں، ان پراچینی مہاشوں کی یہ کوشش کہ کم و بیش آٹھ سو سال کی ہندوستانی تاریخ ندی میں بہا دی جائے تو دنیا میں اسے پاگل پن کے سوا دوسرا نام نہ دیا جائے گا۔

زبان کو بدل سکنے کا خیال پہاڑ سے سر ٹکرانے کی صورت ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مال کا قانون ایک ہے اور مسلم عہد کی یادگار ہے۔ اس قانون کی اصطلاحیں مسلمانوں کی بنائی ہوئی ہیں اور جس طرح درخت جڑ پکڑ لیتا ہے، زراعتی ہندوستان میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ پھر ضابطۂ فوجداری اور قانون ملکی کی تمام اصطلاحیں ایک ایک دیہاتی کی زبان پر ہیں۔ گجراتی، مرہٹی اور بنگلہ میں بہتیرے عربی فارسی کے لفظ شامل ہیں جن کی اصل پہچانی نہیں جاتی۔ مدراس میں شادی کے موقعے پر متعدد بار مہمان آتے ہیں اور جب وہ رسم ادا ہو چکتی ہے تو "چندن تنبول" کی رسم ادا کی جاتی ہے اور مہمان رخصت ہو جاتے ہیں۔ مہاراشٹر میں لوگوں کے نام وجیندار، فرنویس، چٹنویس اور میراث دار وغیرہ بہت ہیں۔ گجراتی میں کرتے کو پیرن (یعنی پیرہن) اور دیس کو دمن کہتے ہیں۔ بنگلہ زبان میں نقل داز، آدم شماری (یعنی مردم شماری) عجبی (یعنی شبیہ) اور بالش (یعنی تکیہ) بے شمار عربی فارسی کے لفظ شامل ہیں۔ ملہم (یعنی مرہم) ہندوستان کی ہر زبان میں بولا جاتا ہے۔ بنگالیوں کے نام بھی معظم دار، محلانویس وغیرہ ہوتے ہیں۔

یوپی میں ابھی تک الفت سنگھ اور بخشی رام وغیرہ سُنے جاتے ہیں۔ یہ لفظ کیسے چھانٹے جائیں گے، اور ان کے بدلے میں کون سے لفظ بولے جائیں گے؟ میرا پختہ خیال ہے کہ اگر ہندوستانی زبانوں میں سے عربی فارسی اصل سے بنے ہوئے لفظ نکال دئے جائیں تو وہ بولیاں رہ جائیں گی۔ ست پڑا پہاڑیوں کے علاقے میں بھیلوں کی آبادی ہے۔ ان بھیلوں میں یہ رواج ہے کہ ہونے والا داماد اپنے سسرے کی کھیتی باڑی پر محنت کرکے بیوی کی قیمت ادا کرتا ہے۔ ایسے داماد کو "خنداد" کہا جاتا ہے، جو خانہ داماد کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ایسے لفظ ہر زبان میں بے شمار نکلیں گے اور کوئی ذی ہوش انسان تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ لفظ نکالے جا سکتے ہیں۔

سنسکرت زمانۂ تاریخ میں جب کہ وہ ایک زندہ زبان تھی، بول چال کی زبان نہ تھی، مگر اب کہ وہ مُردہ زبانوں میں داخل ہو چکی ہے، اسے زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور وہ قیمتی وقت جو زندہ زبانیں حاصل کرکے ہندوستانی قوم کے ذہن روشن کرنے میں صرف ہونا چاہئے، "گڑے مردے اکھیڑنے" میں گنوایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اگر ہندی ساہتیہ پر ہی ایک طالب علمانہ نظر ڈال لیں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ اس کے اندر عربی فارسی کے ایسے بہت لفظ ہیں جن کے ہندی مترادف اگر کبھی تھے بھی تو آج نہیں ہیں۔ برج کے علاقوں کے شہری اور دیہاتی ہندوؤں میں ایسے لفظ بولے جاتے ہیں جیسے برات کی رخصت "بدا" (یعنی وداع) اور بہن بیٹی جب میکے سے جاتی ہے تو اُسے "بدائی" دی جاتی ہے۔ "زچہ" "بچہ" اور جہیز یا دہیز گانوں گانوں میں بولے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ہندوؤں میں پلنگ اور "چرخہ" جہیز کی خاص چیزیں ہیں۔ "چرخہ" کانگریسی تحریک سے پہلے بھی کل ہندی لفظ تھا۔ منگنی کے وقت جہیز ٹھہرانے کو "کرار داد" (یعنی قرار داد) کہا جاتا ہے۔ دولہا کو "نوشہ" بھی کہتے ہیں اور ساتھ جو چھوٹا لڑکا گھوڑے پر بٹھا دیا جاتا ہے اُسے "نشہ والا" ہی کہا جاتا اور دولہا "جامہ" ہی پہنتا ہے۔ برت کھولنے کے لئے دودھ کی مٹھائی "برفی" اور "قلا قند" وغیرہ ہی منگانا پڑتا ہے۔

عقل حیران ہے کہ کیا مٹھائیوں کے یہ بدیسی نام بھی بدلے جائیں گے، اور کیا سیب، تردہ، خربوزہ، خوبانی، کشمش، بادام وغیرہ کھانا چھوڑا جائے گا؟ "گلاب" اور اس کا "عطر" و "گلقند" یہ سب ترک کر دیئے جائیں گے؟ "رضائی" اور "لحاف" کے نام بدلے جائیں گے۔ "پہلوانی" تو شاید نہ چھوڑی جائے گی، پھر "خم" ٹھوکنے کو کیا کہا جائے گا؟ آج کل کے حفظانِ صحت کے اُصول کے مطابق پیتل کے برتنوں پر بھی "قلعی" ضروری چیز ہے۔ اب کیا قلعی نہ کرائی جائے گی؟ اگر کرائی جائیگی تو "قلعی" کو کیا کہا جائے گا۔ ہندوستان کی سنگیت کلا کو مسلمانوں نے جس بلندی پر پہنچا دیا کیا اس پر بھی

حصے کو سنسکرت دو دیا۔ نے نکال پھینکا جائے گا ؟ خیال، ٹیپہ، ٹھمری وغیرہ کا نام موقوف کر دیا جائے گا ؟ بہت اچھا ہریوں، کے میل جول سے مسلمانی تہذیب کے جو اجزا ہندوؤں کی سرشت میں داخل ہو گئے ہیں۔ خون کے ذرے بن گئے ہیں، ان کو نکال پھینکنا کیسے ممکن ہوگا ؟

ہندی کے پرچارک جنتا کی آسان بھاشا کی بھی آڑ لیتے ہیں۔ مگر جنتا کو سمجھانے کے لئے سنسکرت لفظوں کی بھرمار کر دینا ایک نامعقول دلیل ہے۔ اصل ہندی میں سنسکرت کے لفظ لینے کی سہار نہیں ہے۔ برج بھاشا میں سنسکرت کے جتنے لفظ آئے ہیں، عام طور سے تصرف ہو کر داخل ہوئے ہیں۔ ہندی کو سنسکرت کے لفظوں سے لاد دینا خود ہندی کی صورت بگاڑ دے گا۔ مغربی یو۔ پی کے دیہاتی وہی زبان بولتے ہیں جو شہروں میں بولی جاتی ہے۔ البتہ لہجے اور تلفظ کا فرق ہے، اور بعض مقامی لفظ اور محاورے بھی خاص ہوتے ہیں مگر ہر علاقے میں زبان کی یہ خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ مقامی الفاظ اور محاورے سنسکرت ہرگز نہیں ہوتے۔

گردن اور کمر کے لئے کون سے لفظ بولے جائیں گے ؟ مغربی یو۔ پی کے تمام دیہات میں گردن اور کمر ہی بولے جاتے ہیں۔ کمر کے لفظ سے دیہاتیوں نے ایک کپڑا بنایا جس کی لمبائی صرف کمر تک ہوتی اور "کمری" کہلاتی ہے۔ ان دیہاتیوں کو جو چیز حسین نظر آئی اور جسے وہ پسند کرتے ہیں اسے "ملوک" کہتے ہیں۔ یہ خاص عربی لفظ اور "ملک" (یعنی بادشاہ) کی جمع ہے، مگر نہ معلوم یہ لفظ دیہات میں اس مفہوم میں کیونکر استعمال میں آیا۔ یہ صرف مثالیں پیش کی گئی ہیں لیکن اگر ایسے لفظ چھانٹے جائیں تو کتابیں بھر سکتی ہیں۔

جن لوگوں نے اردو دشمنی کا بیڑا اٹھایا ہے، وہ اردو کے دشمن نہیں بلکہ ہندی کی ریڑھ لگانے والے ہیں، عربی فارسی کے لفظ جو رامائن لیلا، کبیر اور سورداس اور میرا بائی کے "دوہوں" میں آئے ہیں ان کی کانٹ چھانٹ کرا دیں گے ؟ بدعادت کو شاید جلا ہی ڈالیں گے، اور رحیم و رسکھان وغیرہ کی "کوتاہیں" کیا گنگا کے سپرد کریں گے ؟ لیکن میں ایسے لوگوں سے سوال کروں گا کہ آپ جس جذبے سے ہندی کو ترقی دینا چاہتے ہیں، وہ آپ سے یہ سب کام کرانا چاہے گا، اور جب آپ یہ کام کر گزریں گے تو ہندی ساہتیہ کی کیا شکل بنے گی ؟ پھر شاید اس جنون میں دہلی کی مسجد اور آگرے کے تاج پر بھی پھاوڑا بجے گا؟ مگر یہ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی یہ بات باقی رہ جائے گی کہ یہ بھائی اپنے آپ کو ہندو کہنا بھی چھوڑ دیں۔ یہ لفظ بھی بدیسی ہے اور عربوں نے یہ نام ہندوستان کے باشندوں کے لئے تجویز کیا تھا۔

لیکن میں ایسے لوگوں کو ہندو جاتی کا نمائندہ نہیں مانتا۔ یہ لوگ بے جانے ہوئے سوامی دیانند کی

تحریک سے متاثر ہیں۔ اور یہ بھی ماننے والی بات نہیں کہ سارے ہندو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کی ہر چیز سے متنفر ہیں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آریا جماعت بھی انگریز سے متنفر نہیں ہے۔ حالانکہ مسلمان جیسے قصوروار ہیں ویسے ہی انگریز بھی ہیں۔ دونوں نے باہر کے ملکوں سے آکر ہندوستان پر قبضہ کیا۔ لیکن اگر یہ جماعت مسلمانوں سے واقعی نفرت کرتی ہے تو کہنا پڑے گا کہ یہ لوگ اپنی نفرت میں بھی سچے نہیں۔ البتہ ایک دلیل جو سمجھ میں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے ان کو نفرت اس لئے نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان پر حکومت کی، بلکہ اس لئے ہے کہ وہ اس ملک میں بس گئے اور اسے اپنا وطن بنا کر بھرشٹ کر دیا۔ انگریز چونکہ یہاں رہ نہیں پڑا اس لئے اس سے کوئی نفرت نہیں ہے۔ نفرت ایک فطری جذبہ ہے اگرچہ انسانی عزو وقار کے لئے پسندیدہ شے نہیں۔ بہر حال دنیا کی تاریخ کا ہر واقعہ انسانیت کی عدالت کے سامنے پیش ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے۔ اس نفرت کو وہ عدالت کمینہ پن کی نفرت کہے گی۔ لیکن چند سرپھرے پوری ہندو جاتی کو ملزم نہیں بنا سکتے اور نہ یہ کوئی دانائی کا فعل ہوگا۔

میرا عقیدہ ہے کہ نفرت کا یہ مظاہر غلامی کی لعنت کا نتیجہ ہے اور ملک کی آزادی کے ساتھ ہماری بہت سی کمینی خصلتیں بدل جائیں گی، ہم میں اعلے خصائص پیدا ہوں گے اور ہم بلند اخلاق کو پھر حاصل کر سکیں گے جو غلامی نے مٹا دئے تھے۔ اس کے باوجود اگر ہندوستان کے اندر ایک آدمی بھی ایسے گھناؤنے اور گندے وچار رکھتا ہے جو انسان کی انسانیت کے منافی ہے تو وہ بھی وطن اور دیس کے لئے کلنک کا ٹیکہ ہے، اور اس کا جلد سے جلد دھو دیا جانا ضروری ہے۔

اب "حضرات اردو" ہوں یا "سنسکرتی مہاشے" اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارا ادب اور ساہتیہ زبان ہی کے اندر وجود میں آتا ہے اور وہ قومی زندگی کے سنوار سدھار کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ دونوں اس سے بھی انکار نہ کر سکیں گے کہ ہمارا پچھلا ادب اور ساہتیہ سامنتی یا جاگیردار سماج کا پیدا کردہ تھا جسے عوام سے اور عوام کی زندگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پھر یہ حقیقت بھی ناقابل رد ہے کہ دنیا ایک زبردست ہلچل میں مبتلا ہے اور انسانی سماجوں میں جا بجا انقلاب ہو رہا ہے اور ہوگا۔

ان واقعات کو دیکھنے کے لئے نہ دوربین کی ضرورت ہے اور نہ خوردبین کی۔ طبقاتی جنگ ہر جگہ، ہر ملک و قوم میں شروع ہے۔ اور یہ وہ خواب نہیں جس کی تعبیریں مختلف ہوں۔ ہم اگر اپنے ذہن و خیال کے پٹ بند بھی کرلیں تو بھی طوفان کی تیز و تند ہوائیں ان کی چولیں ہلا ڈالیں گی۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ پچانوے ۹۵ فیصدی محنت کش انسانیت کی بیداری ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ دنیا میں آئندہ جنتا کا راج ہوگا، جنتا کی زبان پھیلے گی اور جنتا اپنی تہذیب یا سبھیتا خود بنائیں گی۔ روس کا انقلاب اسکی

ان شہادت ہے۔

اس لئے چاہے وہ اُردو کا ادب ہو یا ہندی کا ساہتیہ، اپنی بقا کے لئے اس کو چولا بدلنا ہی پڑیگا اُردو میں ایسے بے شمار اسلوب در آئیں گے جن کو عوام سمجھتے ہوں گے، ہندی سے وہ تمام شبد نکال دئے جائیں گے جن کو جنتا نہ سمجھتی ہوگی۔ ہندی اُردو کی موجودہ چپقلش اصل میں زبان اور کلچر کی حجت نہیں بلکہ سیاسی چالاکیاں اور سستی لیڈری خریدنے کا ڈھنگ ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے قابو یافتہ درمیانی طبقے کے لوگ اپنا تفوق اور برتری قائم رکھنے کے لئے کھیل کھیل رہے ہیں۔ مگر جب جنتا انقلاب لائیگی تو اس وقت نہ شیخ صاحب کا پتا ہوگا اور نہ مہاشے جی کا۔ اس وقت یہ دونوں غائب ہوں گے۔

لسانیات کے ماہروں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہم جو کچھ بولتے ہیں وہ ہمارا بطون اور ہمارا آئینہ ہے، اور ہم لفظوں ہی کے ذریعے سے پہچانے جاتے ہیں۔ دوسروں کے لفظوں میں چھپے ہوئے معنی کو سمجھ کر اُسے پہچان لیتے ہیں۔ ہمارے خیال و احساس، ہماری خواہشیں اور ارادے لفظوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور اُنھیں کے اندر چھپے بھی رہتے ہیں۔ یعنی لفظوں کی ترتیب پر قادر ہو کر ہم اپنی دلی باتوں کو موثر طریقے سے ادا کر سکتے ہیں اور اُنھیں چھپا بھی سکتے ہیں۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے اس چیز سے کام نہ لینا پاسکل کے بقول جس نے ہمیں اشرف بنایا ہے، یعنی اپنے تفکر اور وچار شکتی سے کام نہ لینا انسانیت کو ناقص قرار دینا ہے۔

اس دلیل کی بنا پر انسانوں کے دو فرقے جو ایک ہی وطن کی پاک مٹی سے بنے ہوں، صدیوں سے ایک ہی زبان بولتے چلے آرہے ہوں، جن کے سوچنے کا طریقہ بھی ایک ہو، وہ اماننے باتوں کو قومیت اور کلچر کا فرق قرار دیں اور ایک دوسرے سے متنفر ہو جائیں عقل کی توہین کرنا ہے، انسانیت کو ذلیل کرنا ہے۔ لیکن اس وجہ سے کہ کوئی قوم یا فرد عقل و خرد کو طلاق دے کر زیادہ دن نہیں جی سکتا ہمیں اپنے بقا ہی کی خاطر عقل سے کام لینا پڑے گا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود تاریخ کا نتیجہ ہے۔ مسلمان پہلے دن سے ہندوستانی بن چکے ہیں، انھوں نے یہی نہیں کہ یہاں کے طور طریق سیکھے بلکہ رشتہ ناتہ بھی یہیں جوڑا۔ اس لئے دس کروڑ مسلمان ہندوستان کی ویسی ہی دولت ہیں جیسے تیس کروڑ غیر مسلم، وہ ایک قومی سرمایہ ہیں۔ اس تعداد کو نہ تو مٹایا ہی جاسکتا ہے اور نہ اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ جو جہاں ہے وہیں رہے گا اور آپس میں بیوہار بھی ہوگا۔ پھر ہندو ہندی بولتے ہوں گے اور مسلمان اُردو اور ایک دوسرے کی زبان جانتا نہ ہوگا، تو کیا اُن کو آپس میں بیوہار کرنے کے لئے ایک تیسری زبان سیکھنا پڑے گی، یا پھر کرسے ایک کو دوسرے کی زبان یاد

کرنا پڑے گی؟ کیسی طرفہ بات ہے کہ سیکھی ہوئی زبان بھلائی جا رہی ہے تاکہ نئے سرے سے سیکھی جائے!

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے نام کے ساتھ بہت سی "یائے نسبتی" کا دم چھلا لگا لیا ہے۔ ہندوستان میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ شروع میں ان کے ساتھ عورتیں بھی نہ آئی تھیں۔ اس لئے بدیسی "یائے نسبتی" میں کھوٹ تو شروع ہی سے تھا۔ اصلی یائے نسبتی "ہندی" کی ہے اور اسی کی اکثریت بھی ہے۔ حقیقت حال جب یہ ہو تو صرف مذہبی عقیدے کے بناء پر اپنے ہی گوشت اور خون کو غیر سمجھنا اپنے اعضا کو کاٹ پھینکنے کی حماقت کے سوا دوسرا نام نہیں پا سکتا۔ غیریت کے تمام اجزا، خون کی آمیزش اور صدیوں کی وطنیت نے مٹا دئے ہیں۔ اور جو فرق [illegible]ت گنوایا جاتا ہے، ویسا تو صوبوں کو جانے دیجئے ایک ہی شہر کے ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان میں ملے گا، ایک ہی گھر کے دو آدمیوں میں بھی ہوگا۔ چنانچہ اس فرق و امتیاز کو مذہب، کلچر اور زبان کی وجہ قرار دے لینا عقل کے کانٹے پر پورا نہیں اترتا۔ اور اہل وطن جتنی جلدی اس غلطی کا احساس کریں گے قوم و ملک کے لئے اتنا ہی بہتر ہوگا۔

علمائے زبان کا ایک فتوے یہ بھی ہے کہ الفاظ کے طبقے اور گروہ ہوتے ہیں۔ ان کے خاندان اور شجرے، ان کے اندر اختلاف و ہم جنسی ہوتی ہے، ان میں شریف و رذیل بھی ہوتے ہیں اور صحبت کے اثر سے اچھے برے اور برے اچھے بنجاتے ہیں۔ اس بات کو سمجھ لینے کے بعد الفاظ کی درآمد سے خوفزدہ ہونا بے معنی سی بات معلوم ہوتا ہے۔

لفظوں کی شرافت و رذالت کے ذکر میں ان دو لفظوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لفظ "جان" سے ایک لفظ "جانی" بنا۔ جس وقت یہ لفظ بنا ہوگا یقیناً نہایت اعلےٰ اور شریفانہ مفہوم میں استعمال ہوا ہوگا۔ مگر بری صحبت نے اسے ذلیل بنا چھوڑا۔ اسی طرح ایک لفظ ہے "چوتڑ" اس کے مادے کو زبان سے ادا کرنا معیوب ہے لیکن اس کا مشتق لفظ بلا تکلف استعمال کیا جاتا ہے، وہ بدصحبت سے بچا رہا۔ الحاصل جو لوگ زبان کے فلسفے سے تو واقف نہیں مگر لفظوں کا استعمال جانتے ہیں، ایسے لوگ بھی بتا سکیں گے کہ ایک ہی مفہوم کے لئے کئی لفظ سامنے ہونے پر بھی مناسب لفظ کی تلاش کا کانٹا کس طرح کھٹکتا رہتا ہے، اور جب ایک مفہوم کے لئے مناسب لفظ ذہن میں بجلی کی تڑپ کی طرح آجاتا ہے تو کیسے ایک نیا تصور، نیا خیال، عبارت میں نیا زور پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا لفظ سوجھ جانا ہی وہ الہام ہوتا ہے جو سننے یا پڑھنے والے کے ذہن و فہم میں ایک ایسے تار کو چھیڑ دیتا ہے کہ وہ بھی شاعر یا مصنف سے ہم سفیر ہو جاتا ہے۔

ایک غور طلب حقیقت یہ بھی ہے کہ آج تک کوئی مصنف اپنی زبان کے تمام لفظ استعمال نہیں کر سکا ہے۔ ایک قادر الکلام اہل قلم بھی صرف اتنے ہی لفظ استعمال کرتا ہے جن کی رُوحِ معانی سے وہ آشنا ہو چکا ہے۔ اور جن الفاظ کو ایک مصنف چھوڑ دیتا ہے اُنھیں کو دوسرا کمال خوبی و لطافت کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ پھر ایک کامل فن لکھنے والا ایک موضوع کے بیان میں لفظوں کا ایک سیٹ استعمال کرتا ہے اور دوسرے موضوع پر دوسرا سیٹ۔ اس لئے کہ ارسطو کے قول کے مطابق زبان کا رتبہ موضوع کے رُتبے کی مطابق ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ ایک ہی سباق و عبارت میں ایک لفظ مختلف لوگوں کے ذہن میں مختلف تصورات پیش کر سکتا ہے۔ اور لغت کے اندر لفظ کی جو حیثیت ہوتی ہے، عبارت میں آکر بدل جاتی ہے۔ الفاظ نرم و نازک بھی ہوتے ہیں اور سخت و کرخت بھی، تلخ و بدمزہ بھی، تیز بھی اور شیریں و لذیذ بھی، اور اُن کی یہ مختلف حیثیتیں اِن لفظوں (اسماء) کے اُن تصورات کے مطابق ہوتی ہیں جو یہ لفظ ہمارے ذہن میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر یہ علمی حقائق سمجھ میں آجائیں تو عربی فارسی کے مروّج لفظوں سے چڑھنا یا سنسکرت کے بعض نئے لفظوں کے داخلے پر برافروختہ ہونا ناممکن ہوجاتا ہے، اور لسانیات کے مذہب میں تو یکسر ناروا ہے۔

لغت کے اندر لفظ زیادہ سے زیادہ ہوں اور ہر قسم کے ہوں مگر ان کا استعمال تو میرے آپ کے ذوقِ انتخاب پر منحصر ہے، جو ایک فطری طریقہ ہے۔ بولتے وقت میں آپ کو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں اور سنتے وقت آپ میرے مافی الضمیر کو سمجھنا چاہتے ہیں، اب اگر میں آپ کو نہ سمجھا سکا یا آپ نہ سمجھ سکے تو میرا کہنا ضائع ہوا اور آپ کا سُننا بے کار گیا۔ زبان یا بھاشا کے اختلاف کا حل ان دو فقروں کے اندر ہے۔

ہماری زبان جسے آج خواہ اردو کہئے یا ہندی، آگے چل کر وہ ہندوستانی کے نام سے جانی جائے گی، اپنی بناوٹ کے اعتبار سے آریائی نسل کی زبان ہے۔ تفصیلات میں جائے بغیر میں اس بات پر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ زبان ضرورت کے تحت وجود میں آئی اور فطری تقاضوں کے تحت پروان چڑھی، باہر سے آنے والے لوگوں کی ضرورت قوی تھی، اِس لئے اُن کو ملک میں بسنے والوں کی زبان کے لفظ زیادہ سیکھنا پڑے۔ مسلمان ہندوستان میں آئے تو عربی، فارسی اور ترکی بولتے ہوئے آئے ہوں گے مگر کتنا حیرتناک ماجرا ہے کہ ہندوستان میں پہنچ کر انھوں نے صرف ہندوستانی چیزوں ہی کے نام نہیں سیکھے بلکہ اپنے بدن کے اجزاء اور رشتوں کے نام بھی ہندوستانی ناموں سے بدل لئے، اعضائے جسم اور رشتوں کے نام دو ایک کے سوا سب ہندی ہیں۔

ٹرینچ کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ اس نے ایک اور بہت اہم نکتہ سمجھایا ہے، وہ کہتا ہے کہ "کسی انسانی جماعت کے وحشی و نامہذب ہونے کا ثبوت اس کی زبان کا افلاس ہے، اور اس جماعت کو پستی میں ڈالے رکھنے والی چیز بھی اس کی زبان کی بے مائگی ہے۔ کیونکہ انسان کو اتنا ہی علم سکھایا جا سکتا ہے جتنا اُن لفظوں کے اندر ہے جن کو وہ سمجھتا ہے۔" دوسرے لفظوں میں ٹرینچ یہ قول بتاتا ہے کہ زبان کا سرمایہ بڑھائے بغیر کوئی قوم ترقی کے زینے پر نہیں چڑھ سکتی۔ یہی بات اس نظریئے کی بنیاد بنی کہ جس طرح زبان خیال کے لئے غذا بہم پہنچاتی ہے اسی طرح وہ خیال کو محدود بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ اپنی جہالت کے طفیل اگر ہم اپنی زبان کو محدود رکھنے کی ضد میں بامُراد ہو جائیں تو ٹرینچ کا یہ فیصلہ ہمارے حق میں ناطق ہے۔

ضرورت اور بلاضرورت کی دلیل پر اوپر کی سطروں میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے، لیکن اگر وسعتِ زبان کے مسئلے کی علمی و منطقی شکل یہ ہے جو ابھی بیان ہوئی تو الفاظ کے داخلے پر سنسر بٹھانا اخلاقی خودکشی کا مترادف ہے۔

علمِ زبان کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ مُردہ الفاظ کا داخلہ کسی زبان کو زندگی عطا نہیں کر سکتا۔ اپنی زبان کو مالدار بنانا ہے، جو قوم کو علم سکھانے کے لئے ضروری ہے، تو نئے مفاہیم کے لئے مُردہ زبان کو چھوڑ کر زندہ زبان کے الفاظ اختیار کیجئے۔

جو لوگ باضابطہ یعنی منطقی طریق پر سوچنے کے عادی ہیں وہ سبب اور علت پر غور کئے بغیر کسی نتیجے پر پہنچنا غلط سمجھتے ہیں، کہ یہ جہالت کا ثبوت ہے۔ زبان کے متعلق موجودہ اختلافِ رائے اور حجت و بحث میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر وہ کیا اسباب تھے کہ صدیوں سے ایک زبان بولتے بولتے ایک جماعت اس سے بیزار ہو جائے جو باہمی رواداری، قومی میل جول اور ہم رنگی کی جیتی جاگتی شہادت ہو، جسے دو بڑی جماعتوں کی متحدہ کوششوں نے پروان چڑھایا ہو اور جو ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے بھائی چارے کی زندہ یادگار رہو؟

ادنیٰ تامل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اسباب سیاسی تھے۔ غیر ملکی حکومت کے لئے ۱۸۵۷ء کے واقعے کے دوبارہ امکان کو روک دینے کا (تاکہ اس کی لوٹ کھسوٹ جاری رہ سکے) آسان نسخہ یہی تھا کہ دو بڑے فرقوں میں پھوٹ ڈالی جائے۔ آج یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ برطانوی سامراج کی یہ پالیسی کامیابی سے بھی زیادہ کامیاب ہے۔ سرکاری نوکریوں اور پھر کونسلوں کی آبادھاپی کے ساتھ الیکشن کے جداگانہ انتخاب نے اس پھوٹ کو پکا کر دیا جس کی انتہا آج نظر آرہی ہے۔ زبان کا ناخوشانہ بدیسی حکومت ہی کا

اشغل تھا۔ اس کا سنگِ بنیاد یوپی کے لفٹنٹ گورنر سر اینٹونی میکڈانل نے رکھا۔ یہ بیج دوسرے اسباب سے نشو و نما پاکر ایک بڑا تناور درخت بن گیا۔

اس ذیل میں یہ نفسیاتی حقیقت بہت اہم ہے کہ مسلمان اپنے زمانۂ حکمرانی میں احساس برتری بن کر رہ گیا تھا، اور اس احساسِ برتری میں بابر کا خیال کارفرما تھا جس کے تہذیبی گھمنڈ کو ہندو معاشرت اور رہن سہن میں، ہندی علوم اور فلسفے میں کوئی چیز قابلِ قدر نظر نہ آئی اور ہر بات مضحکہ انگیز معلوم ہوئی۔ بابر کو خود اور بابر کے بعد مسلمان نسلوں کو یہ احساس کبھی نہ ہوا کہ پہلی مرتبہ ہر آدمی کو دوسری قوم کے عادات واطوار کچھ نرالے معلوم ہوتے ہی ہیں، فرنگیوں کی بہت سی باتیں ہندوستان کے لوگوں کو نرالی اور اعلیٰ تہذیب سے گری ہوئی معلوم ہوئیں۔ "بندر" انگریزوں کے لئے ایک عام ضمیر بن گیا تھا۔ "ٹانگ اٹھا کر موتنا" ہماری تضحیک کا مورد تھا اسکی زبان یا بولی "گٹ پٹ" کے لفظ سے ظاہر کی جاتی تھی۔ غرض مغربی تہذیب کے اندر شروع میں ہمیں بھی بہت سی باتیں ذلیل و رسوا کن معلوم ہوئی تھیں لیکن آخر ہمارے یہ خیالات و محسوسات بدل گئے۔ مگر ہندو تہذیب و معاشرت کے بارے میں ہم نے بابر کی رائے اور خیال میں کبھی ترمیم کرنا ضروری نہ سمجھا، اور یہ خیال ترک نہ کیا کہ تہذیباً ہم ہندوؤں سے برتر ہیں۔

اردو کی ابتدا عوام کے میل جول سے پڑی۔ مگر اس وجہ سے کہ اس وقت جاگیرداری سماج کا معیارِ شرافت مرتبہ اور دولت تھی، اس لئے عوام اجلاف اور کمین کے نام سے موسوم تھے۔ لہٰذا عوام کے میل جول سے جو زبان بن رہی تھی وہ اس عہد کے ہندو و مسلم شرفا، و امرا، کے لئے حقیر تھی اور اس کا استعمال توہین کا باعث تھا۔ اشراف کے طبقے میں ہندو و مسلم برابر کے شریک تھے اور اسی طرح اجلاف بالعموم دونوں قوموں کے پیشہ ور طبقوں پر مشتمل تھے۔ اشراف فارسی زبان بولتے لکھتے تھے اور اجلاف اس نئی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اردو کا بولنا اشراف کے طبقے میں ممنوع تھا اور غالب کے وقت تک رہا۔ لیکن اس لئے کہ زبان انسان کے قبضے میں نہیں، بلکہ انسان اس کے بس میں ہوتا ہے، اشراف کا طبقہ اسی اجلاف کی زبان بولنے پر مجبور ہو گیا، اور اردو جس سے مراد ہی "بازاری پن" تھا، اردوئے معلّٰے کہلائی اور وہی غالب جس کے لئے اردو بولنا باعثِ ننگ تھا، اردو شعر میں ایک نشانِ راہ قائم کر گیا۔ اس خیال کا وجود کہ مسلمان ہندو سے تہذیباً برتر ہے۔ شرر لکھنوی کے زمانے تک موجود تھا۔ شرر کو یہ گوارا نہ تھا کہ "گلزارِ نسیم" ایک ہندو کی تصنیف سمجھی جائے۔ اس لئے اسے انھوں نے نسیم کے استاد آتش کی تصنیف قرار دیا، کیونکہ ایک ہندو ایسی تصنیف کا اہل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ہندوؤں نے کھلے دل سے مسلم تہذیب اور کلچر کو اختیار کیا تھا، فارسی زبان سیکھی اور علمی و ادبی

مشاغل میں دل کھول کر حصہ لیا۔ ادبی ضاعت میں ان کے کارنامے آج بھی وہی درجہ رکھتے ہیں تصنیف و تالیف کا انداز اور طریقہ ہندوؤں نے بھی وہی اختیار کیا جو مسلمانوں میں رائج تھا۔ کتاب کا آغاز حمد سے ہوتا تھا نعتِ رسول اور پھر منقبت لکھی جاتی تھی۔ اس کے ۔ ودوز ہندوؤں کی تحریر و تقریریں مسلمانوں نے ہمیشہ "بوئے گوری" سونگھی۔

بظاہر یہ خاص اسباب تھے جس کی بنا پر ہندوؤں کو من حیث الجماعت اُردو سے محبت کم ہوتی گئی اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس خیال کو ہماری ایک حماقت سے بڑی تقویت ملی۔ لفٹنٹ گورنر یو پی نے جب بنارس کی تحریک ہندی "کی سرپرستی فرمائی تو ہم اس عیاری کو نہ سمجھ سکے۔ اور اُردو کے تنہا ٹھیکہ دار ہونے کے مدعی بن بیٹھے۔ زبان کے مشترک ورثے کے واحد حقدار ہونے کا اعلان کر دیا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے لکھنؤ جا کر اُردو کی حمایت میں ایک معرکہ آرا تقریر کی۔ ہندو تو ہندی کی تحریک پر اٹل ہو گئے مگر نواب صاحب کو گوشہ نشین کر دئے گئے اور ہندی کی سرپرستی جاری رہی۔

اس وقت اگر مسئلے کو فریقانہ نظر سے نہ دیکھا جاتا تو اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا کہ عدالتی سمنوں پر دونوں رسم الخط میں ایک ہی عبارت چھپ جایا کرتی، اور جس طرح تبلیغ و تنظیم کے غلغلے تک شدھی اور سنگٹھن کا زور رہا اور ایک کے ٹھنڈا پڑ جانے سے دوسری بھی سرد پڑ گئی، کم و بیش یہی حشر ہندی کی تحریک کا ہوتا۔

اس بنیادی غلطی کے ساتھ مسلمان اہل قلم نے اس بات کو یک قلم فراموش کر دیا کہ انکی تصنیف و تالیف کو ہندو بھی پڑھیں گے۔ ہمارے سامنے سارے مسلمان بھی نہیں، صرف پڑھے لکھے مسلمان تھے جن کے۔ لئے ہم لکھنے لگے، اور سر سید کی جماعت کے بعد مخزن کے ادارے تک کی روایات کو ترک کر کے مبالغے کے ساتھ عربی و فارسی لغات کی بھرمار شروع کر دی۔ اور زبان کو زیادہ مشکل اور زیادہ کٹھن بنانے لگے۔ اب چونکہ اُردو کا جاننا حصولِ معاش کے لئے ضروری نہ رہ گیا تھا، اور ہندی میں امتحان آسانی سے پاس کئے جا سکتے تھے، اس لئے ہندوؤں میں اُردو کی تعلیم گھٹتی گئی، یہاں تک کہ موقوف ہی ہو گئی۔

آج یہی غلطی ہندو بھی کر رہے ہیں کہ وہ زبان کو کٹھن سے کٹھن بناتے چلے جا رہے ہیں۔ نتیجہ وہی ہوگا جو بیسویں صدی کے پہلے ربع میں اُردو کو دیکھنا پڑا۔ یعنی معمولی پڑھے لکھے بھی تحریری اُردو کو سمجھنے کے قابل نہ رہے تھے۔

اِس وقت بھی ہم ایک بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں، اس وقت ہماری ساری توجہ اور کوشش اس بات پر صرف ہونا چاہئے کہ آسان اور سلیس زبان میں ادبی محاسن پیدا کریں، کم قیمت کے اخبار، رسالے اور کتابیں شائع ہوں اور تعلیم بالغان پر انتہائی زور دیا جائے۔ مگر اس کے بدلے میں ہم شور و غوغا اور رہین ڈیگا پر اُترے ہوئے ہیں اور اسی میں ہم نے فلاح دیکھی ہے۔ لیکن فی الواقعہ اس طرزِ عمل سے ضد اور عناد میں اضافہ ہوتا ہے، جو یقیناً ہندوستانی زبان کے لئے جس کو ہر چھوٹا بڑا بولتا اور سمجھتا ہے خودکشی کے معنے ہوں گے۔ ایک طرف ہندی سنسکرت کی چھوٹی بہن بن جائے گی اور دوسری طرف اُردو عربی فارسی کا بچہ! دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ایک بہرا ہو جائیگا دوسرا گونگا۔

اہلِ فکر سے چھپا ہوا نہیں کہ دنیا دارِ مکافات یا کرم جگ ہے یہاں کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا' ردِ عمل لازمی ہے، جو ایک فطری قانون ہے۔ زبان کی خود سرانہ فطرت ہماری جاہلانہ اور متعصبانہ کارروائیوں کو چلنے تو نہ دیگی۔ لیکن اُردو کا دائرۂ اثر تنگ سے تنگ تو ضرور ہو جائے گا، اور بالآخر نشر و اشاعت کو محدود کر دے گا۔

آخر میں ایک نظر اس پر بھی ڈالنا بہت ضروری اور اہم ہے کہ اس زبانی آویزش اور الجھن میں کس طبقے اور ذہنیت کے لوگ مبتلا ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تو ممکن ہے کہ ہماری کوششوں کے دھارے کا رُخ بھی بدل جائے۔ بہرحال اس بات کا پتا چلا لینے کے لئے کسی گہرے سوچ اور بحث کی ضرورت نہیں۔ آپ نے کبھی نہ سنا ہو گا کہ دو دیہاتی یا مزدور، کلچر یا زبان کی بحث پر لڑے ہوں، ان طبقوں میں اس بات کا دھیان نہ ہونا کیا معنی وہ تو اس بات چیت کو بھی نہ سمجھ سکیں گے۔ اور یہ کہنا ایک واقعے کا اظہار ہو گا کہ ہندوستانی قوم کی بہت بڑی اکثریت کی سمجھ میں یہ بات نہ بیٹھے گی کہ زبان اور بولی بھی ایسی چیز ہے جس پر جھگڑا ہو سکتا ہے، اور کلچر کوئی چڑیا ہے جو فساد کی جڑ بن سکتی ہے۔ اور چاہے اسے ہندوستانی قوم کہئے یا ہندو یا مسلم، مگر قوم عبارت ہے انھیں بہیا نوے فیصدی عوام سے۔ مگر ہوتا یہی ہے کہ اوپر کے دس پانچ آدمی ایک رائے قائم کر کے "قوم" کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

ایک غیر جانبدار سوچنے والا اس زبان کے جھگڑے کو جنگ زرگری سے زیادہ درجہ نہیں دے سکتا۔ اس کے سامنے یہ حقیقت آئے گی کہ مسلمانوں سے پہلے بھی اور مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں بھی، جاگیرداری سماج نے ہندوستانی عوام کو یہ موقعہ دیا ہی نہیں کہ وہ اپنی حالت پر خود کچھ سوچ سکے۔ بادشاہی اور راج کی اسکیمیں ایک ہی ڈھنگ پر چلائی گئیں، برہمن ہندو راجہ کا صلاح کار اور مشیر ضرور ہوتا تھا مگر راجہ جوابدہ کسی کے سامنے نہ تھا، وہ خود بھگوان روپ ہوتا تھا۔ بادشاہ کے دربا

میں مولوی یہ بتانے کے لئے ہوتے تھے کہ بادشاہ تو ظل اللہ ہے، اس کی شکایت کیسی اور کی کس سے جا سکتی ہے؟ انتہا یہ ہے کہ راجہ اور بادشاہ کی عنایت و مہربانی "الہام الٰہی" اور "ایشور کی کرپا" کے ہم معنی سمجھی جانے لگی تھی۔

اجرت لے کر مذہبی پیشواؤں نے حکومت کو اس ڈھنگ سے مضبوط بنایا اور حکومت کے مظالم کو بھی مذہب کے ذریعے سے نتیجۂ اعمال یقین کرا دیا۔ اس اسکیم میں ذاتوں کی تقسیم سے بھی بہت بڑی مدد ملی۔ اور اس سے مسلمان بھی اتنے ہی متاثر ہوئے جتنے ہندو متاثر ہو چکے تھے۔ غرض مذہب اور وہم نے تقدیر اور پرالبدھ کا سبق دے دے کر غریب عوام کو سنجیدگی سے محسوس کر لینے کے ساتھ گہری قسم کی قناعت سکھا دی گئی۔ پنڈت جی اور مولانا صاحب نے راج اور شاہی کی اسکیم کو اسی ڈھنگ سے اور اس طرح مضبوط کیا۔ انسانی مساوات اور اسلامی اخوت کے سارے عندیئے بادشاہی کے ڈھنگ نے دفن کرا دئے تھے۔ سلطنت کے ساتھ خدا کا سایہ ہونے کا خیال بہت گہرا قائم ہو گیا تھا۔ اور اس عقیدے کے راسخ ہو جانے کے نتیجے میں اشراف کا اجلاف پر اور آقا کا تابع پر سیاسی اقتدار اور اقتصادی غلبہ استمراری ہو گیا۔

لیکن اس وجہ سے کہ اس راج یا بادشاہی کی اسکیم میں حدبندیاں سخت تھیں اس لئے اونچی اور نیچی سماج، دونوں میں زوال آ جانا لازمی تھا۔ اعلیٰ کو ادنیٰ پر جو برائی مل چکی تھی اس کی وجہ سے با اقتدار طبقوں میں بے کار اور نکھٹو لوگوں کی تعداد برابر بڑھتی رہی، مذہبی رہنما خیرات پر بغیر شرمائے بسر کرنے لگے اور زمین کے مالک دوسروں کی محنت کے بل پر عیش اڑاتے رہے۔ اس طرح ملک کی آبادی میں بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی پیدا ہو گئی جو خود کوئی کام اور کسی قسم کی پیدا نہیں کرتے تھے، بلکہ دوسرے کی محنت کے پھل میں سے حصہ بٹاتے تھے اور حصہ بھی بہت بڑا لیتے تھے۔ مغل عہد میں یہ چیز مذہبی عقیدہ بن کر سارے ملک میں پھیل گئی تھی۔ اور ہندوستانی سماج کے نکھٹو دبیز اور موٹے ہوتے رہے۔

مغل حکومت کے زوال اور ہندو رجواڑوں کی آپس کی رقابت نے انگریز کو مداخلت کی دعوت دی۔ اُس وقت بھی ہندو مسلمان نکھٹو اور رعایت خور طبقے آگے بڑھے اور انگریز کے حامی و مددگار بن گئے۔ انگریز نے ایسے بے وقوفوں اور وطن فروشوں کی خاطر خواہ قدردانی کی۔ برطانوی سامراج نے نہ صرف پرانے رعایت خور طبقوں کو برقرار رکھا بلکہ ان میں اور اضافہ کیا۔ اس نے خطاب یافتہ اور پنشن خوار طبقے کے ساتھ وکالت کے پیشے کو بھی اپنا مددگار بنا لیا۔

چنانچہ یہ وہی پرانی سامنتی سماج کا پس ماندہ اور انگریزی سامراج کی ذریات ہے جو اپنی بقا کے لئے پاؤں پیٹ رہی ہے۔ اور عوام کو بے بنیاد قضیوں میں پھنسائے رکھنا چاہتی ہے۔ ان کا مقصد آج بھی وہی ہے جو راج اور بادشاہی کے وقت میں تھا یعنی عوام الناس اپنی اصل مانگوں کو بھولے رہیں، ان کو اپنے حقوق کا دھیان نہ آئے اور وہ اپنی طاقت کو نہ پہچانیں تاکہ یہ حرامخوری کرکے عامی رعایت خور طبقے اپنا تفوق قائم رکھ سکیں اور ان کے موٹے ہونے کے نئے ذریعے یعنی کونسلوں کی کرسیاں اور وزارتیں ان کے ہاتھوں میں محفوظ رہیں۔ اور وہ قانون سازی کی مشین پر قبضہ رکھ کر غصب کی ہوئی جائدادوں اور پیداوار کے ذریعوں کے مالک بنے رہیں۔ اس طرح یہ وہی پرانی برہمنی ذہنیت کا عین سامنے آ رہا ہے کہ زبان بھی ایک مخصوص طبقے کی چیز بنی رہے اور علم و فن کی ٹھیکہ داری اوپر کے مٹھی بھر لوگوں کے ہات میں رہے۔

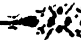
مگر اس لئے کہ محنت کش عوام کے اس شعور اور اس کی اس مانگ کے سامنے کہ وہ محنت کرنے کے بعد بھی بھیک مانگتا ہے۔ اب کوئی عیاری چلنے والی نہیں، ان بحثوں اور ایسے قضیوں کی بنیادیں کمزور ہوگئی ہیں، اور اب یہ جھگڑے زیادہ مدت نہ چل سکیں گے، بغیر چکائے چک جائیں گے، البتہ یہ ضروری شرط ہے کہ ملک کی سیاسی الجھنیں صاف ہوں۔ اور قومی جماعتوں کی لیڈری کے سیاسی تصورات اسی صورت میں صحیح ہو سکتے ہیں جب عوامی تحریکیں، مزدور کسان کی تحریکیں زور پکڑ کر درمیانی طبقے کی لیڈری سے چھٹکارا پائیں گی اور عوام کے لیڈر عوام ہی میں نکلیں گے۔ امتیاز یافتہ اور رعایت خور طبقوں کی خاص رعایتیں ختم کرنے والے قانون مزدور کسان ہی بنا سکتے ہیں، درمیانی طبقے کی لیڈری تو اپنی حفاظت کا قانون بنائے گی۔ بہرحال اب وہ وقت زیادہ دور نہیں۔ اس زمانے میں وقت کی رفتار اتنی تیز ہوگئی ہے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پولس اور فوجوں میں ہڑتال کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا؟ ہندوستان کی سب سے بڑی ریلوے ہڑتال کا نوٹس آج سے بیس برس پہلے خیال میں نہ آ سکتا تھا؟ ہوائی بیڑے کی یا ڈاکیوں کی اتنی بڑی ہڑتال دس سال پہلے سمجھ میں آ سکتی تھی؟ سنہ ۳۶ء تک ایسی کوئی صورت خیال میں لاتے بدن میں کپکپی چڑھتی تھی۔ فوجی بیڑے کی بغاوت کا دھیان کرکے تو بعض لوگ آج بھی کانپ جاتے ہوں گے۔

بہرصورت زمانہ بالکل بدل گیا ہے اور بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں جو ادب آج پیدا ہو رہا ہے اس میں سماجی اور سیاسی انقلاب کی جھلک نظر آ رہی ہے جو مستقبل قریب میں ہونے والا ہے۔

اس لئے اگر "مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست" کا مشورہ صحیح ہے، اگر زمانے سے ساز کرنے کا اصول غلط نہیں، اگر انسانی مساوات فطرت کا منشا ہے، اگر مذہب کی تعلیم انسانیت پرستی سکھاتی ہے، تو ہندوستان کے ان "رعایت خور" طبقوں کی عافیت اس میں ہے کہ عوام کو غلط قضیوں میں اُلجھا کر اپنی غرض پوری کرنے کے بدلے وہ عوامی تحریکوں سے وابستہ ہو جائیں اور اپنی جگہ عوام کے بیچ میں بنائیں، امتیاز و تفوق کو بھولا ہوا خواب سمجھیں، اور اپنی قوم و وطن کیلئے ایک معزز مقام حاصل کرنے میں عوام کو ساتھ لے کر غلامی کا داغ وطن کے حسین چہرے سے دھوئیں! دوسرے ملکوں کے "رعایت خور" طبقوں کے اکثر آدمیوں نے اس حقیقت کو پہچانا اور اس پر عمل کیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنے میں فی الواقع ان کے ہات سے کچھ گیا نہیں، نقصان صرف حرامخوری کی عادت چھوٹ جانے اور لالچ کے نکل جانے کا ہوا۔

مسئلہ زبان کی اگر یہی صورت ہے تو دلوں میں گنجائش پیدا کر کے دیکھا جائے، نقصان صرف تعصب اور نفرت کا ہوگا، زبان اپنی جگہ رہے گی، سب لوگ اسے بولیں گے اور سب لوگ سمجھیں گے۔

ل۔ احمد



قدیم اُردو کی رزمیہ مثنویاں

(از جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن)

یہ ہم کو معلوم ہے کہ قدیم اُردو یا دکھنی زبان کی شاعری کا آغاز تقریباً سنہ ۸۰۰ ہجری سے ہوا اور سنہ ۱۲۰۰ ہجری تک اس زبان میں شاعری ہوتی رہی اور اس کی ابتدا فارسی شاعری کے نمونہ کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھی۔ جس وقت دکھنی شاعری عالم وجود میں آئی اُس وقت تک فارسی شاعری کے کئی دَور گزر چکے تھے۔ فردوسی، ابن حسام اور مولانا جامی نے شاہنامہ، خاورنامہ اور سکندرنامہ جیسی رزمیہ مثنویاں مرتب کردی تھیں۔

دہلی اسکول کی اُردو شاعری میں ہمیں رزمیہ مثنویاں دستیاب نہیں ہوتیں، لکھنؤ اسکول میں انیس نے رزمیہ کلام یادگار چھوڑا ہے۔ مگر انیس سے صدیوں پہلے دکھنی زبان میں رزمیہ مثنویوں کا کافی ذخیرہ ہمدست ہوتا ہے۔ جس طرح انیس نے رزمیہ شاعری کی بنیاد واقعاتِ کربلا پر رکھی ہے۔ اسی طرح دکھنی رزمیہ مثنویاں بھی پہلے پہل کربلا کے جاں سوز اور دردآمیز حالات سے شروع ہوتی ہیں۔ عام طور سے رزمیہ مثنویوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہوں، اس میں حالاتِ جنگ، مقابلہ کی روئداد، ہتھیاروں کے اقسام، معرکہ کا طریقہ وغیرہ اس خوبی سے بیان کیا گیا ہو کہ لڑائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ اس اصول کے مدِنظر اگر دکھنی رزمیہ مثنویوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکھنی شعراء نے کامیاب واقعہ نگاری کی ہے۔ ایک ماہرِ فن کی طرح اُنھوں نے واقعہ کے تمام حالات، تمام خصوصیات بلکہ جزیات تک تفصیل سے بیان کئے ہیں اور ایک قابل مصور کی طرح واقعہ کا فوٹو کھینچ دیا ہے۔ ان کی رزمیہ مثنویوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تسلسل بیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہیں جو کچھ واقعات نظم کئے گئے ہیں وہ اپنے تسلسل کے لحاظ سے مربوط ہیں ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ ملا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے داستان کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

دکھنی رزمیہ مثنویوں کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک تو وہ ہیں جو فارسی مثنویوں سے ترجمہ کی گئی ہیں اور دوسری وہ جو دکھنی شعرا کی ذہنی خیالات کا گنجینہ ہیں۔ اوّل الذکر مثنویوں میں خاور نامہ، جنگ نامہ، ظفر نامہ، جنگ نامہ حیدر، روضۃ الشہداء، روضۃ الاطہار، وغیرہ بیسیوں مثنویاں ہمیں معلوم ہیں جو فارسی مثنویوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ دوسری مثنویوں میں فتح نامہ نظام شاہ، علی نامہ، تاریخ سکندری، جنگ نامہ عالم علی خاں، اور فتح نامہ ٹیپو خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں۔ لیکن اس امر کا خیال رہے کہ دکھنی زبان کی یہی چند رزمیہ مثنویاں نہیں ہیں بلکہ کئی اور مثنویاں بھی رزمیہ مثنویوں کی ذیل میں داخل کی جا سکتی ہیں ان کے علاوہ دکھنی شعرا کی دوسری مثنویاں جو عشق و محبت کی داستانوں سے متعلق ہیں۔ ان میں بھی اکثر و بیشتر جنگ اور معرکہ کے حالات کئی کئی صفحوں میں نظم کئے گئے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دکھنی مثنویوں میں عشق و محبت کی پُر لطف اور دلچسپ داستانوں میں جنگ پیکار کے خوں چکاں حالات بھی ضرور رہوتے تھے۔ چونکہ اُس زمانہ میں آئے دن جنگ و جدال کا بازار گرم رہا کرتا، لڑائی جھگڑوں کا ہنگامہ برپا رہتا، خون کے بادل فضا میں منڈلاتے رہا کرتے تھے۔ اس لئے ماحول سے متاثر ہو کر شعرا بھی اپنی تصانیف میں جدال و قتال کا تذکرہ میدان جنگ کا حال کسی نہ کسی موقع پر ضرور بیان کر دیتے تھے۔ اس موقع پر ہم اوّل الذکر مثنویوں میں سے صرف خاور نامہ کا مختصر تعارف کراتے ہیں اور آخر الذکر میں سے فتح نامہ نظام شاہ اور علی نامہ اور جنگ نامہ عالم علی خاں کا تذکرہ کریں گے۔

خاور نامہ رستمی ابن حسام کے فارسی خاور نامہ کا دکھنی ترجمہ ہے جس کو ۱۰۵۹ہجری میں بیجاپور کے شاعر کمال خاں رستمی نے مدون کیا ہے۔ یہ مثنوی چوبیس ہزار شعر پر مشتمل ہے اور خدیجہ سلطان شہر بانو ملکہ محمد عادل شاہ کی فرمایش پر تیار کی گئی ہے۔ سلطانہ کا یہ کارنامہ تاریخ زبان اُردو سے محو نہیں ہو سکتا۔ اس کی علمی سرپرستی کی یہ یادگار مدتوں زندہ رہیگی افسوس ہے اس بیش بہا تصنیف کا کوئی نسخہ یہاں نہیں ہے۔ انڈیا آفس میں میں نے اس کو دیکھا تھا۔

رستمی کا یہ کارنامہ صرف ترجمہ کی حد تک دکھنی ہے، اس کے ساتھ مختلف خصوصیات کا حامل ہے۔ اوّل تو یہ کہ ڈھائی سال کی قلیل مدت میں چوبیس ہزار شعر کا مکمل کر دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر اس کا تسلسل بیان بھی

قابلِ تعریف ہے۔ زبان کے لحاظ سے بہت صاف ہے۔ اکثر اشعار اس قدر صاف ہیں کہ نثر کا لطف آتا ہے۔ پھر رزم کے واقعات، بزم کے حالات، معرکہ کی روئداد نہایت کامیابی سے پیش کی گئی ہے۔ بحری جنگ، شب خون، حملۂ قلعہ کا محاصرہ، بہادروں کے مقابلہ کا حال، اور دوسرے بہت سے جزیات تک یہاں بیان کئے ہیں۔

دکھنی شعراء کی اچھی رزمیہ مثنویوں میں شوقی کی مثنوی فتح نامہ نظام شاہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس مثنوی میں جنگ تلی کوٹہ کے حالات نظم کئے گئے ہیں۔ دکن کی عظیم الشان لڑائیاں جن میں سلطنتوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا ہے، ان میں سے ایک جنگ تلی کوٹہ بھی ہے۔ اس جنگ میں ایک فریق ویجانگر کا مہاراجہ رام راج اور دوسری جانب بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کی اسلامی سلطنتیں تھیں۔

اگرچہ یہ تینوں اسلامی سلطنتیں متحد اور متفق تھیں مگر ساز وسامان فوج اور ہاتیوں کی کثرت کے لحاظ سے ویجانگر کو بہت زیادہ تفوق حاصل تھا۔ تلی کوٹہ کے میدان میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ معرکہ کا رزار گرم ہوا، ہنگامۂ توپ و تفنگ سے میدانِ جنگ میدانِ محشر بن گیا۔ ویجانگر کے ہاتھی دکھنی سلاطین کے لشکر کو روندنے لگے۔ قریب تھا کہ ان کو شکست ہو جاتی۔ مگر مہاراجہ رام راج کے ہلاک ہو جانے سے جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ سلاطین دکن کی فوج یا تو فرار ہو رہی تھی یا اب ان کی ہمت بلند ہو گئی۔ وہ پلٹ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے، ویجانگر کی فوج اپنے مہاراجہ کے مارے جانے سے دل شکستہ ہو کر بھاگنے لگی۔ اس طرح ویجانگر کی سلطنت کا نام مٹ گیا اور اس کے حصے بخرے ہو گئے۔

شوقی نے ان ہی واقعات کو اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے۔ چونکہ اس کو اس زمانہ میں احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت سے تعلق تھا اس لئے اس نے اپنی مثنوی میں نظام شاہی سلطنت کی تعریف زیادہ کی ہے اور اسی کی فوج کے سر فتح کا سہرا باندھا ہے۔

علی نامہ۔ بیجاپور کے ملک الشعراء ملا نصرتی کا شاہکار علی نامہ بھی ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ اور تاریخی حیثیت سے بھی اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دراصل اس کو علی عادل شاہ ثانی کی سوانح زندگی کہنا چاہیئے۔

یہ ہمیں معلوم ہے کہ سلطان علی عادل شاہ ثانی کا پورا زمانہ جنگ و جدل میں بسر ہوا۔ شروع سے آخر تک میدان کارزار گرم اور ہنگامۂ پیکار برپا رہا۔ اول تو سیواجی نے سر اٹھایا خود

اپنے آقائے ولی نعمت یعنی عادل شاہ کے قلمرو پر دست درازی کی۔ اس کے مقابلہ کے لئے سدی جوہر جس کو صلابت خاں کا خطاب ملا تھا بھیجا گیا۔ مگر یہ خود باغی ہو کر سیواجی سے مل گیا۔ اب سلطان خود بہ نفس نفیس صلابت خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ بادشاہ سے خوفزدہ ہو کر صلابت خاں قلعۂ پنالہ سے فرار ہو گیا۔ علی عادل شاہ نے قلعۂ پنالہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد صلابت خاں کے مقابلہ کے لئے عادل شاہی جنرل روانہ کئے گئے اور پھر خود سلطان بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ عادل شاہی سورما اور بڑے بڑے جوانمرد جیسے شریف خاں، اخلاص خاں، خواص خاں، سلطان کے ہمراہ رکاب تھے۔ بڑی خوں ریز جنگ ہوئی، ہنگامۂ محشر برپا ہوا، قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا، ہزاروں آدمی مارے گئے۔ بہادروں نے خون کی ہولی کھیلی۔ تیر و تفنگ کے جوہر کھائے گئے۔ توپوں اور بندوقوں نے غضب کی آتش باری کی۔ بالآخر صلابت خاں زخمی ہو کر فرار ہو گیا۔ شاہی فوج کا ایک حصہ موسیٰ خاں کی سرکردگی میں اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ سدی مسعود۔ صلابت خاں کے داماد نے تاب مقاومت نہ لا کر شکست کھائی۔ ان پے در پے شکستوں سے دل شکستہ ہو کر صلابت خاں اس دنیا سے چل بسا۔ اس کے مرنے پر اس کے لڑکے عبدالعزیز خاں اور داماد مسعود خاں نے سلطان سے اپنی خطاء وغیرہ کی معافی چاہی اور مورد عنایات شاہی ہوئے اس کے بعد سلطان نے ملیبار اور بدنور کی طرف پیش قدمی کی۔ متعدد قلعے فتح کئے۔ اس طرح علی عادل شاہ فتح و کامرانی کے نقارے بجاتا ہوا بیجاپور کو واپس ہوا۔

دوسری طرف دہلی کی مغلیہ سلطنت سے بھی معرکے رہے، عالمگیر خلد آشیاں کی فوج بیجاپور پر چھاپے مارتی رہی، لیکن مغلوں کو اپنی شہنشاہی کی زبردست پشت پناہی کے باوجود کامیابی نصیب نہیں ہوئی، بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔

ان تمام واقعات کو نصرتی نے علی نامہ میں اپنے مصورانہ چابک دستی سے نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ سلطان کے معرکوں اور جنگوں کی روئداد اس خوبی اور عمدگی سے بیان کی ہے کہ بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس نے واقعہ نگاری کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ فوجوں کی روانگی، بہادروں اور سورماؤں کا مقابلہ، رسالوں اور ہاتھیوں کی مٹ، پھر ہنگامہ کارزار کی گرم بازاری، جنگ و پیکار کی روئداد، شمشیر و سناں کی معروفیت، ہتیاروں کی جھنکار، توپوں کی گرج، دار و گیر کی تفصیل، غرض جنگ کی خوں چکاں داستان نہایت شرح و بسط

سے لکھی ہے۔

نصرتی کی رزمیہ شاعری کے متعلق مولانا ڈاکٹر عبدالحق کی صراحت ملاحظہ کے قابل ہے، مولانا نے تحریر فرمایا ہے :۔

"رزمیہ واقعات کے بیان میں نصرتی کو خاص کمال حاصل ہے۔ وہ فوجوں کی آمد اور جنگ کے زور شور اور ہنگامہ خیزی کو اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کو اردو زبان میں میر انیس سے قبل کوئی نمونہ رزمیہ نظم کا نہیں ملا۔ میر ضمیر نے رزمیہ کی ابتدا کی تھی لیکن وہ بالکل اولیں تھا۔ مولانا کو اگر نصرتی کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو اعتراف کرنا پڑتا کہ میر انیس سے قبل بھی ایک ایسا باکمال شاعر گزرا ہے جس نے مسلسل رزمیہ نظمیں لکھی ہیں اور جو معرکہ آرائی نیز دیگر واقعات کے بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے۔"

غرض کہ نصرتی اپنے رزمیہ کلام کے باعث ہر طرح ستائش کے قابل ہے۔ اگر فردوسی کو اس کے شاہنامہ کی وجہ سے زندگی جاوید نصیب ہے تو نصرتی علی نامہ کے باعث اس کا مستحق ہے۔

جنگ نامہ عالم علی خاں کی تصنیف ۱۱۳۶ھ ہجری میں ہوئی ہے۔ اس میں آصفجاہ اول اور عالم علی خاں کے جنگ کے حالات لکھے گئے ہیں۔ جب حضرت آصفجاہ دہلی سے دکن کی جانب روانہ ہوئے۔ تو یہاں عماد الملک صوبہ دار تھے۔ اس کے سپہ سالار عالم علی خاں نے آپ کا مقابلہ شکر کھیڑہ کے مقام پر کیا۔ بڑی خوں ریز جنگ ہوئی۔ عالم علی خاں نے پوری دلاوری اور بہادری کے جوہر دکھائے، داد مردانگی دی، طرفین کے سیکڑوں آدمی ہلاک ہوئے، بالآخر آصفجاہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور آپ فتح وفیروزی کے ساتھ منصور و مظفر دکن میں داخل ہو گئے۔

ان ہی حالات کو غضنفر نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے اور نہایت کامیابی سے واقعات کا اظہار کیا ہے۔

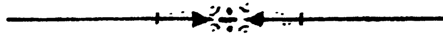
ان مثنویوں کے علاوہ کئی اور مثنویاں رزم نگاری کے باعث قابل تذکرہ ہیں مگر یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک دکھنی مثنویوں کا جو ذخیرہ بہ دست ہوا ہے اس کے لحاظ سے چھوٹی بڑی پچیس۲۵ تیس۳۰ مثنویاں رزمیہ قرار دی جا سکتی ہیں جن میں سب سے طویل مثنوی رستمی کا خاور نامہ ہے جس کے چوبیس۲۴ ہزار شعر ہیں۔ اور مختصر مثنویوں میں علی عادل شاہ کی مثنوی خیبر نامہ ہے جس میں جنگ خیبر کے حالات نظم کئے گئے

ہیں یہ (۷۲) شعر کی مثنوی ہے۔

دکھنی شعرا نے اپنی رزمیہ مثنویوں میں جس طرح مثنوی کی خصوصیات کا لحاظ رکھا ہے۔ وہ حیرت انگیز ہے ان کے مطالعہ کے بعد یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے اچھی مثنوی کے پورے لوازم استعمال نہیں کئے۔ ان کی مثنویوں میں واقعہ نگاری کا نقص نظر نہیں آتا ہے۔ انھوں نے کسی چیز کے بیان کو مبہم اور تشنہ نہیں رکھا ہے، دقیق اور نازک امور اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی واضح طور پر بیان کی ہیں۔ جزئیات کو چھوڑا نہیں گیا ہے۔ حسن ترتیب کے لحاظ سے ان کو جانچا جائے تو بھی دکھنی شعرا کی مثنویاں کامیاب اترتی ہیں، انھوں نے اپنے مسالے کو جس عمدگی سے ترتیب دیا ہے اور جس قابلیت سے واقعات کو مربوط کیا ہے وہ ان کے نکتہ سنجی کی بہت بڑی دلیل ہے۔

بہرحال رزمیہ مثنوی کے جانچنے کے جو لوازم ہیں اور ایک عمدہ مثنوی کے لئے جو معیار مقرر کیا جا سکتا ہے اگر اس معیار کے لحاظ سے دکھنی مثنویوں کو پرکھا جائے تو میرے خیال میں اس کسوٹی پر کئی دکھنی مثنویاں کھری اتریں گی۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی



مصنفینِ سیتاپور کی تصانیف

(از جناب مولانا سید الیاس حسین صاحب)

جناب قاضی سید الیاس حسین صاحب سیتاپوری، فارسی زبان کے ماہر اور طرزِ قدیم تدریس کے محافظ، پُرانی وضع کے دلدادہ اور قدیم تہذیب کے حامل ہیں، شعر کہتے نہیں مگر سخن سنجی اور نکتہ پروری کا بڑا ملکہ رکھتے ہیں۔ تقریباً ربع صدی سے مدرسہ عربیہ نیاز یہ خیرآباد ضلع سیتاپور میں مدرس فارسی ہیں۔ حاملانِ علومِ قدیمہ کی طرح موصوف بھی زمانہ کی ناقدری کا شکار رہے اور خاموشی سے علمی، تاریخی اور ادبی خدمت کرنے کے عادی ہیں۔ وطن سے باہر نکلنا کبھی گوارا نہیں کیا، نہ اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود نام و نمود اور شہرت و وجاہت کے خواہاں ہوئے۔ اسی وجہ سے طبقۂ اہلِ علم موصوف سے ناواقف رہا۔ اوقاتِ فرصت میں اعلیٰ مضامین کے اقتباسات اور ملکی و وطنی اہم معلومات اپنے روزنامچوں میں درج کرتے رہتے ہیں۔ عمدہ اشعار کا ذخیرہ بھی اسی طرح جمع کرتے رہتے ہیں۔ بیسیوں ضخیم مجلدات کا مجموعہ قاضی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

مجھے ان کے دیکھنے کا کئی بار اتفاق ہوا ہے۔ بڑا کارآمد ذخیرہ ہے۔

میرے لکھنے پر موصوف نے مقامی مصنفین کی اردو تصانیف کی فہرست مرتب کر کے ارسال فرمائی اور خانۂ کیفیت میں مفید معلومات کا اضافہ بھی کیا۔

مدیرِ مصنف کی فرمائش پر اشاعت کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

ہندوستان کے مصنفینِ بلاد و قصبات کی مصنفات کی فہارس اگر اسی نہج پر اہلِ ذوق حضرات مرتب کر کے شائع کراتے رہیں تو علم کی بڑی خدمت ہوگی اور ہزاروں مطبوعہ و غیر مطبوعہ گوہرِ نایاب منظرِ عام پر آ جائیں گے۔ میں خود بھی مسلم یونیورسٹی لٹن لائبریری کی گمنام گرنادر کتابوں کے بارے میں قارئینِ مصنف کے لئے کچھ نہ کچھ پیش کرتا رہوں گا +

محمد عبدالشاہد خاں شروانی
اورینٹلسٹ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نمبر شمار	نام کتاب	مضمون	نام مولف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	مطبوعہ یا قلمی	کیفیت
۱	طوفان نوح	تاریخ	مولوی منشی سید اکبر علی صاحب نقوی آملی حنفی۔ قادری ساکن سیتاپور محلہ قضیارہ	ایک کلاں نقشہ	مطبوعہ	صرف ایک بار نقشہ کی صورت میں شائع ہوا تھا اب نایاب ہے۔
۲	تاریخ مسعودی	〃	〃	۲ جزو	〃	حضرت سید سالار مسعود غازی بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مختصر کتاب ہے۔ ایک ہی بار شائع ہوئی۔ اب نایاب ہے۔
۳	مرآۃ النکاح	نصیحت	〃	۳ جزو	〃	یہ کتاب ایک ہی بار چھپی تھی۔ اب نایاب ہے۔ اس کتاب میں جوان بیوہ عورتوں کے نکاح نکرنیکی خرابیاں درج ہیں اور نصیحت آمیز حکایتیں بھی تحریر ہیں۔
۴	مجموعۂ فتاوے حنفیہ	فقہ	〃	تقریباً ۱۰ جزو	قلمی	اس میں ضروری فتوے درج ہیں۔ کسی کی فارسی عبارت ہے اور کوئی اردو میں ہے۔ یہ فتووں کا مجموعہ چھپا نہیں ہے۔
۵	ترجمہ کتاب منقبت سلطانی	تصوف و تاریخ	〃	۸ جزو	〃	علامہ شیخ عبدالحمید صاحب عباسی جائسی جانزپوری کی کتاب منقبت سلطانی کے بعض مقام کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب حاجی قادری شاہ سید عبدالرحمن صاحب الملقب بہ سید شاہ سلطان صاحب ولایت قصبہ آٹ کے حالات میں ہے جو مترجم صاحب کے جد امجد اور آرٹ کے سید ونکے مورث اعلی تھے۔ آٹ ضلع سیتاپور کی تحصیل مسکہر میں مشہور مقام ہے۔
۶	تاریخ سیتاپور	〃	〃	۱۰ جزو	〃	اس کتاب میں سیتاپور کے تاریخی واقعات اور ضروری اور مفید یادداشتیں درج ہیں۔ یہ کتاب شائع نہیں ہے غیر مرتب صورت میں ہے۔
۷	〃	〃	〃	۱۲ جزو	〃	〃
۸	〃	〃	〃	۱۰ جزو	〃	〃
۹	مجرب اعمال	اعمال	〃	۱۲ جزو	〃	مجرب عمل اور تعویذ درج ہیں۔ چھپی نہیں ہے۔
۱۰	〃	〃	〃	〃	〃	〃
۱۱	نصائح وہدایات	نصائح و تجارت	〃	۴ جزو	〃	〃
۱۲	انساب و شجرات	انساب	〃	۱۵ جزو	〃	اپنے اور سیتاپور وغیرہ کے خاندانوں کے نسب نامے اور شجرے اور ضروری حالات۔ چھپے نہیں ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	علم یا فن	نام مولف یا مصنف یا مترجم	حجم	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۱۳	تاریخی اور علمی یادداشتیں	مختلف	مولوی منشی سید اکبر علی صاحب نقوی	۲۰ جزو	قلمی	یہ مختلف کتابوں کے انتخابی مضامین غیر مرتب صورت میں ہیں۔ جن سے ایک نہایت ضخیم اور مفید کتاب تیار کیجا سکتی ہے۔
۱۴	تحفۂ حیدری	مناظرہ	″	″	″	یہ کتاب چھپی نہیں۔ شیعہ مذہب کے رد میں ہے۔
۱۵	ہدایۃ الاسلام	فقہ	″	″	″	شیعہ سنیوں کے نکاح کے جائز و ناجائز ہونے کی بحث میں ہے۔ علماء کے فتوے وغیرہ درج ہیں۔
۱۶	مرآۃ الربا	″	″	۰	مطبوعہ	یہ کتاب سود کی حرمت میں ہے صرف ایک بار چھپی تھی اب نایاب ہے۔
۱۷	جدول قصہ حضرت یوسفؑ	تاریخ	″	[illegible]	″	ایک بڑے ورق پر چھپا تھا۔ حضرت یوسفؑ کا مختصر بیان تاریخی اور تفسیری حوالوں سے لکھا گیا تھا۔ اب نایاب ہے۔
۱۸	ہدایۃ الغافلین	مناظرہ	″	۱۰ جزو	قلمی	یہ کتاب ناتمام ہے۔ شیعہ اور سنیوں کے اختلافات کا بیان ہے۔
۱۹	مثنوی تبصرۃ الایمان	″	″	۵ جزو	″	شیعہ مذہب کے رد میں یہ مثنوی تھی۔ چھپنے سے پہلے تلف ہو گئی۔
۲۰	انتخاب تواریخ	تاریخ	″	۱۲ جزو	″	مختلف تاریخوں کا مفید انتخاب ہے۔ چھپا نہیں۔
۲۱	ترجمہ مرآۃ مداری	″	مولوی منشی سید مہر علی برادر ممدوح الصدر	۵ جزو	مطبوعہ	حضرت شاہ بدیع الدین صاحب مکنپوریؒ کے حالات میں ایک مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ منشی صاحب نے اودھ کے بادشاہوں کی اہلکاری کے دنوں اس کا ترجمہ کر کے لکھنؤ کے مطبع اثنا عشری میں چھپوایا۔ مالک مطبع نے اسے نہایت بری صورت میں چھاپ کر اپنے تعصب کا اظہار کیا۔ کتاب میں ایسے مضمون شامل کر دئے جس سے یہ ثابت ہو کہ مترجم شیعہ مذہب ہے۔
۲۲	کتاب رد مذہب نصاریٰ	مناظرہ	″	۰	۰	عیسائیوں کے رد میں ایک ضخیم و بے مثل کتاب تھی اب نایاب ہے۔
۲۳	آداب المیلاد	میلاد شریف کے آداب میں	مولوی منشی قاضی سید الطاف حسین صاحب سیتاپوری	۵۲ ص	مطبوعہ	مولف موصوف جناب مولوی سید اکبر علی صاحب ممدوح الصدر کے بڑے صاحبزادے اور سیتاپور کے قاضی تھے۔ اس کتاب کا تاریخی نام "القول القوی اللطیف فی آداب المولد الشریف" ہے۔ ایکبار چھپی تھی۔ اب نایاب ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	مضمون	نام مولف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۲۴	کتاب رد وہابیہ	مناظرہ	قاضی سید الطاف حسین صاحب سیتاپوری	۲ جزو	قلمی	وہابیوں کے رد میں ہے اس کا صرف مسودہ ہے جو اب تک چھپی نہیں اس کے آخر میں بعض مضامین مولانا مولوی حاجی قاری حکیم منشی اعظم حسین صاحب صفی چشتی تاجی خیرآبادی جو ہمارے ... کے شامل ہیں
۲۵	بیاض اعمال مجربہ	اعمال	"	۳ جزو	"	اس بیاض میں مجرب عمل درج تھے۔ تلف ہو گئی۔
۲۶	بیاض اشعار منتخبہ	شاعری	"	۵ جزو	"	اس بیاض میں اردو اور فارسی کے مشہور شاعروں کے انتخابی اشعار ہیں۔ یہ چھپی نہیں ہے۔
۲۷	سیتاپور کے نسب نامے وغیرہ	انساب	قاضی سید محمد رضا صاحب سیتاپوری	۱۲ جزو	"	اس کتاب میں سیتاپور کے خاندانوں اور اپنے خاندان کے شجرے اور سلسلے اور سیتاپور کے تاریخی واقعات درج ہیں اور بعض مفید نصیحتیں بھی۔ یہ بزرگوار قاضی سید الطاف حسین صاحب موصوف الصدر کے حقیقی بھائی اور سیتاپور کے مشاہیر سے تھے اپنے بھائی کے بعد یہی سیتاپور کے سنیوں کے قاضی ہوئے تھے۔ یہ کتاب چھپی نہیں
۲۸	تتمہ تاریخ سیتاپور مولفہ سید اکبر علی صاحب	تاریخ	"	۸ جزو	"	اپنے والد صاحب کے بعد سیتاپور کے جو واقعات پیش آتے رہے آپ نے اُن کی تاریخ میں درج کر دئے۔
۲۹	مصنفین اسلام	"	۔	۔	"	مولوی حکیم شیخ اکرام علی فاروقی حنفی۔ فریدی بعفتہ(؟) وجیہ شریف کی کتاب تھی ان کی اولاد کی غفلت سے یہ کتاب اُن کے خاندان سے جاتی رہی۔
۳۰	ترجمہ اخوان الصفا	ادب	۔	۱۲۸ صفحہ	مطبوعہ	یہ کتاب مترجم کے زمانہ میں بھی چھپی انکے بعد انکے پوتے حسن رضا نے چھپوائی اب انجمن ترقی اُردو نے بھی چھپوائی ہے۔
۳۱	دیوان	"	اُستاد منشی علی رضا صاحب رضا نبیرہ مترجم اخوان الصفا امامی المذہب	۔	قلمی	یہ دیوان چھپا نہیں ہے۔
۳۲	آئینۂ تماش بینی	نظم نصیحت	اُستاد منشی علی محمد رضا صاحب نبیرہ مترجم اخوان الصفا امامی المذہب	ایک جزو	مطبوعہ	عیاشی کی خرابیوں کا بیان ہے۔ یہ کتاب صرف ایک بار چھپی۔ اب نایاب ہے۔
۳۳	تحفہ مہوشاں	فن مہوشی	حکیم مولوی سید افتخار حسین صاحب غالب	۴ جزو	قلمی	۔ ۔ ۔ ۔

نمبر شمار	نام کتاب	مضمون کتاب	نام مؤلف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۳۴	ترجمہ قانونچہ	طب	حکیم سید مہدی حسن صاحب	.	قلمی	پوری کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔
۳۵	بیاض مجربات	"	"	.	"	اس میں مجرب نسخے ہیں۔
۳۶	مرثیے	ادب و شاعری	حکیم مولوی شیخ کرامت علی صاحب	.	"	یہ مرثیے انیس و دبیر کے طرز پر ہیں۔ چھپے نہیں ہیں۔
۳۷	کوکبۂ فارغ	مرثیے شاعری	سید محمد فضل صاحب فارغ	صـ ۲۱۲	مطبوعہ	انیس کے طرز پر یہ مرثیے ہیں فارغ سیتاپوری کے بیٹے سید محمد حیدر نے چھپوا دیئے۔ یہ فارغ انیس کے شاگرد بھی تھے۔ اس کتاب میں چھ مرثیے ہیں۔
۳۸	علمی۔ مذہبی ادبی مضامین	ادب	مولوی منشی سید ہادی حسن صاحب	.	قلمی	منتشر حالت میں یہ مضامین ہیں۔ اگر مرتب کئے جاویں تو کارآمد ہیں۔
۳۹	علمائے سیتاپوری	تاریخ	ڈاکٹر نادم	صـ ۱۶	مطبوعہ	اس میں مترجم اخوان الصفا کے حالات ہیں۔
۴۰	مولود شریف	مولود شریف	سید افضل حسین نقوی نوی	۳ جزو	قلمی	یہ کتاب چھپی نہیں ہے۔
۴۱	حال فارغ	تاریخ	حکیم سید نہال حسین صاحب	صـ ۶۸	مطبوعہ	اس کتاب میں فارغ سیتاپوری کے مختصر حالات ہیں۔
۴۲	ثمرۃ المکاشفہ	مناظرہ	"	صـ ۹۶	"	اس کتاب میں کتاب شجرات طیبات پر اعتراض کئے گئے ہیں
۴۳	مرثیے	ادب و شاعری	سید ظہور الحسین فروغ	.	قلمی	فروغ انیس کے طرز پر ہیں۔ چھپے نہیں۔ فارغ کے بھائی اور انیس کے شاگرد تھے۔
۴۴	شجرات طیبات	انساب	"	صـ ۹۵۲	مطبوعہ	یہ ضخیم کتاب سادات بدولی کے حالات میں ہے۔ آخر میں بطور ضمیمہ کے سیتاپور کے سیدوں کا مختصر حال درج کر دیا گیا ہے۔
۴۵	کتاب فقہ	فقہ	مرزا عظمت اللہ بیگ صاحب	۳ جزو	قلمی	یہ کتاب چھوٹی تقطیع پر لکھی گئی تھی۔ روزمرہ کے ضروری مسائل درج تھے۔ چھپی نہیں۔
۴۶	کلیات نامی	ادب	منشی سید نیاز احمد صاحب نامی جعفری	۸ جزو	"	نامی صاحب کا کلیات ان کے صاحبزادے سید شکیل احمد گرامی نے جمع کیا تھا۔ چھپا نہیں۔ اس میں اردو، فارسی وغیرہ ہر قسم کے اشعار تھے۔
۴۷	تحقیق طاعون	طاعون کے متعلق ضروری مضامین	"	صـ ۲۳	مطبوعہ	یہ کتاب چھپ گئی ہے مگر اس قدر غلط کہ اس کا کوئی صفحہ بلکہ کوئی سطر غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	فن جس میں کتاب ہے	نام مولف یا مصنف یا مترجم	تعداد صفحہ	قلمی یا مطبوعہ	کیفیت
۴۸	تذکرۂ شعراء بھوپال	ادب	منشی سید نیاز احمد صاحب نامی جعفری	۳ جزو	قلمی	اس میں بھوپال کے اُن شاعروں کا حال اور اُن کے اشعار درج تھے جنکے یہاں مشاعروں میں نامی صاحب خود جاکر شریک ہوتے تھے یا وہ اُن کے یہاں مشاعروں میں آتے تھے۔ چھپا نہیں۔
۴۹	مرثیہ	ادب و شاعری	"	۰	"	حضرت امام حسینؑ کی تلوار کی تعریف شاعرانہ انداز میں نظم کیا تھا۔ چھپا نہیں۔
۵۰	کتاب شیعہ اور سنی کے اتحاد کے بیان میں	نصیحت	"	۰	"	اس کا صرف مسودہ ہوا تھا۔ چھپی نہیں۔
۵۱	قبلہ نما	۰	"	صہ ۱۲	مطبوعہ	جناب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیۂ ریاست بھوپال کے سفر حج سے واپسی پر بطور مبارکبادی کے یہ مسدس لکھا گیا تھا۔
۵۲	حاشیہ کتاب آداب المیلاد	میلاد شریف	مولوی قاضی منشی سید ابرار حسین صاحب جعفری حنفی قادری تحصیل معرکہ	۰	"	کتاب آداب المیلاد پر آپ کا حاشیہ بھی چھپا ہے جس سے آپ کی وسعت معلومات اور تبحر علمی عیاں ہے۔
۵۳	مضامین گلدستۂ ریاست	زمینداروں کے مفید مطلب	"	صہ ۲۶۸	"	یہ کتاب اگرچہ سیٹھ سوامی دیال صاحب تعلقدار معز الدین پور پرگنہ و تحصیل بسواں ضلع سیتاپور کے نام سے شایع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اول سے آخر تک آپنے اصلاح کی ہے مگر باستثنائے بعض مضامین کے اس میں زیادہ حصہ آپ ہی کے مضمون کا ہے۔
۵۴	واقعات سیتاپور وغیرہ	تاریخ	"	۵ جزو	قلمی	اس میں سیتاپور کے تاریخی واقعات اور بھی ضروری اور مفید یادداشتیں وغیرہ درج ہیں۔
۵۵	بیاض مجمع السرور	۰	"	صہ ۳۰۰	"	مفید اور کارآمد مضامین درج ہیں۔
۵۶	بیاض	"	"	۰	"	اس بیاض کے علاوہ چند بیاضیں اور بھی ہیں جن میں مجرب نسخے، مجرب عمل، حکیموں، عاملوں، صوفیوں وغیرہ کی تحقیقیں اور انتخابی اشعار و حکایات و لطائف وغیرہ درج ہیں۔
۵۷	کتاب الاخلاق	اخلاق	"	۸ جزو	"	علم اخلاق میں کتاب تھی اس کا صرف مسودہ ہوا تھا۔
۵۸	کتاب الاعمال	اعمال و وظائف	"	صہ ۸۲	"	اس کتاب میں مجرب عمل درج ہیں۔

نمبر	نام کتاب	مضمون	نام مولف یا مصنف یا مترجم	ضخامت	مطبوعہ یا قلمی	کیفیت
۵۹	ارمغانِ ہاتف	شاعری	سید احمد حسن عرف امداد میاں ہاتف	صـ ۸۰	مطبوعہ	سیتاپور کے شاعروں کا انتخاب۔
۶۰	ناول	ادب	۔	۔	قلمی	بہت بڑے ناول کا مسودہ ہے۔ اگر ختم ہو کر چھپ جاتا تو پہلے ہی حصہ کا حجم فسانۂ آزاد کے پہلے حصہ سے کچھ ہی کم ہوتا۔
۶۱	ادیب فارسی	تعلیم فارسی بزبانِ اردو و فارسی	جناب منشی سید فرزند حسین صاحب عثمانی سیتاپوری، جناب مولوی قاضی منشی سید الطاف حسین صاحب، جناب مولوی قاضی منشی سید ابرار حسین صاحب سیتاپوری، وزیر بیگ صاحب شاہ آبادی	صـ ۱۱۲	مطبوعہ	اس کتاب کے چار حصے ہیں اب نایاب ہے۔ اس کے سرورق پر بابو بلدیو پرشاد وکیل کا نام ہے اور کسی شریک تصنیف کا نام نہیں درج ہے۔ اگر یہ کتاب باقاعدہ پڑھائی جاوے تو فارسی میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت پیدا ہو سکتی ہے۔
۶۲	مکتوب محمدی	خط نویسی	جناب استادی منشی سید فرزند حسین صاحب متوطن قصبہ پالی ضلع ہردوئی مہتمم و منیجر مطبع صبح صادق سیتاپور	۴ حصے حجم حصہ اول صـ ۵۲	〃	مکتوب محمدی کے چاروں حصے اگر قاعدے اور اصول سے پڑھائے جاویں تو اردو اور فارسی میں کافی لیاقت پیدا ہو سکتی ہے اور خط و کتابت اور روزمرہ کی ضروری تحریروں اور عدالتی کارروائی سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے اور شکستہ اور شفیعہ خط بخوبی لکھ پڑھ سکتا ہے۔ اس کی ترتیب لائق صد ہزار آفریں ہے۔ اس کا پہلا حصہ تو نایاب نہیں ہے لیکن اور حصے قریب قریب نایاب ہیں۔
۶۳	زلف عروساں	تاریخ خوشنویسی	۔	۔	〃	یہ کتاب خوشنویسی اور خوشنویسوں کی تاریخ میں ہے صرف ایک ہی بار چھپی تھی اب نایاب ہے۔ اگر یہ دونوں کتابیں مل سکتی ہیں تو غالباً ضلع ایٹہ کے قصبہ مارہرہ کے سجادہ نشین سید محمد میاں صاحب کے کتب خانہ میں ہونگی۔ کیونکہ انھیں کے دادا سید شاہ محمد صادق صاحب وکیل ہائی کورٹ مقیم سیتاپور محلہ تاسین گنج کے مطبع صبح صادق میں چھپی تھیں۔

وَلی گجراتی

(استدراک)

(۲)

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

مصنف کے گذشتہ شمارہ میں ہم نے اپنے پچھلے مضمون کے چند مسامحات کی تصحیح کے ساتھ بعض استدراکات بھی پیش کیے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہم چند مزید امور کا اضافہ کرتے ہیں۔ جن سے وَلی کے گجراتی ہونے پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

ایک دکھنی شہادت مولوی باقر آگاہ دکن کے ایک محقق عالم تھے جو نہ صرف مختلف علوم و فنون اور عربی فارسی اور ہندی کے متبحر عالم تھے، بلکہ اُردو زبان و ادب کے بڑے ماہر اور اپنے زمانہ کے بہترین مصنف اور شاعر تھے، چنانچہ مختلف موضوعات پر ان کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ وَلی کی وفات سے تقریباً ۳۵ برس کے بعد مولوی باقر آگاہ ویلور میں ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے، ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی اور مدراس میں مدفون ہوئے، تقریباً ستّرہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں ہیں۔ اُن کے متعلق مؤلف "تذکرہ اُردو مخطوطات" لکھتے ہیں:-

> "آگاہ اُردو کے بڑے محسنوں میں سے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں پر قابو تھا۔ غزل، قصیدہ، مثنوی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ دکھنی علم و فضل اور شعر و سخن ان پر ختم ہو گیا۔ ان کے بعد جنوبی ہند میں اتنا بڑا ادیب اور شاعر پیدا نہ ہو سکا۔ وہ میرؔ اور سوداؔ کے ہمعصر تھے۔ لیکن زبان قدیم استعمال کی ہے اس لئے شمالی ہند میں شہرت نہیں حاصل ہوئی"۔ [۱]

اپنے قصۂ رضوان شاہ و روح افزا معروف بہ "مثنوی گلزار عشق" کی تمہید میں آگاہ نے اُردو زبان کی تدریجی ترقی پر بحث کرتے ہوئے وَلی کو گجراتی لکھا ہے۔ یہاں ان کی تمہید متعلقہ حصہ نقل کیا

[۱] جلد اوّل صفحہ ۷۶

جاتا ہے:-

"مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان یعنی (یعنی) دہرزہ دراں (درایان) لایعنی دکھنی پر اعتراض اور گلشن عشق وعلی نامہ پڑھنے کے اعتراض (اعتراز) کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب لک (تک) ریاست سلاطین دکن کے (کی) قائم تھے (تھی) زبان اون کی درمیان اون کے خوب رائج اور طعن شماتت (طعن و شماتت) سے سالم تھی۔ اکثر شعرا وہاں کے مثل نشاطی وفراقی وشوقی وخوشنود وغواصی وذوقی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی وجناب وغیرہم کہ بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصائد وغزلیات (وغزلیات) مثنویات ومقطعات نظم کئے اور داد سخنوری کا دی (دے) لیکن نصرتی ملک الشعرا اور تنگ نظری سے ہمراہ ہو۔ جب شاہان ہند اس کلیتہً (کشمیر) جنت نظیر کو تسخیر کرکے طرز روزمرہ دکھنی بہ یخ محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی اور ہندوستان میں مدت تک زبان ہندی کہ اوسے برج بھاکا بولتے ہیں رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت اون کی اصل اصول اور مخرج فنون فروع واصول ہے۔ پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی وفارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص کو ل اوس کی (کے) کھونے لگے سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمیٰ ہوئی۔"

"جیسا کہ شناکی وظہوری نظم ونثر فارسی میں بانی طرز جدید کی (کے) ہوئی (ہوئے) ہیں ولی گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبتدا اور استاد ہے بعد اوس کی (کے) جو سخن سنجان ہند پیدا ہوئے بے شبہ اس یخ کو اوس سے لیے اور من بعد اوس کو باسلوب خاص مخصوص کرتے اور اسے اردو کے بھاکا سے موسوم کئے۔ اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کی (کے) جیسا شاہجہاں آباد و لکھنؤ و اکبر آباد وغیرہ دواج تمام پایا اور جوں جاہی (جاہیے) سبھوں کو من بھایا اور آخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تلک اس فن میں اکثر مشاہیر شعرا عرصہ (وجود میں؟) آئے اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں مثل درد، مظہر، فغان، درد مند، یقین، سوزاں، ایبر (آبرو؟)، آرزو، سودا، تاباں وغیرہ ہم (وغیرہم)۔"[1]

مندرجہ بالا تمہید کتاب "دکھنی مخطوطات یورپ میں"[2] صفحہ ۴۵۶ - ۵۷ سے نقل کیگئی ہے۔ جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے اس بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی اور ایک مقام پر اس کا اقتباس بھی کیا ہے تو اس میں اس کا آخری حصہ جس میں ولی کا ذکر ہے نہیں آنے پایا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اہل قلم نے بھی اس کی طرف کوئی نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی۔ حالانکہ

---

[1] اصل متن کی غلطیوں کی تصحیح ہم نے بین قوسین کی ہے۔ [2] مقالات ہاشمی

ولی کے گجراتی ہونے پر آج سے ڈیڑھ[۱۵۰] سو برس پیشتر کی ایک دکنی عالم کی تحریر بڑی اہمیت رکھتی ہے، خصوصاً اس اعتبار سے کہ اس کا لکھنے والا اُردو زبان کی تاریخ سے واقفیت رکھتا تھا اور ولی کی ایجاد غزل ریختہ کے سبب ان کو سبھوں کا ابتدا اور استاد مانتا تھا۔ لہٰذا ایسے محقق کا بیان ولی کے گجراتی ہونے پر "قولِ فیصل" کا حکم رکھتا ہے۔

سیرِ گجرات کا نظریہ

سب سے پہلے آصفی ملکاپوری[۱] نے اور اُن کے تتبع میں حسن مرحوم[۲] اور دیگر دکنی اہلِ قلم[۳] نے ولی کے "قطعۂ در فراقِ گجرات" کے ایک شعر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ولی گجرات میں صرف سیر و تفریح کی غرض سے گئے تھے ورنہ اُن کا اصل وطن اورنگ آباد تھا[۴]۔ وہ شعر یہ ہے:-

اس سیر کے نشے سوں اول تر دماغ تھا
آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمارِ دل

ہم اپنے پچھلے مضمون میں اس پر کافی بحث کر چکے ہیں، یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کلیاتِ ولی کا دوسرا اڈیشن، جو حال ہی میں "انجمن ترقی اُردو" نے شائع کیا ہے اور جو طبع اول کی بہ نسبت دیوانِ ولی کے زائد نسخوں سے تصحیح و مقابلہ کے بعد مرتب ہوا ہے، اس میں مصرعے سے لفظ "سیر" موجود ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی جگہ "شہر" چھپا ہے۔ اگر معتبر نسخوں کے مطابق یہ صحیح ہو تو اس بحث کا یہیں پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور اس قطعہ کے موضوع کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ لفظ "شہر" ہو۔ چنانچہ اب اس کے معنی بھی زیادہ واضح اور درست ہو گئے ہیں۔ کیونکہ "اس شہر" (اس کے شہر۔ مطلع میں گجرات کی طرف اشارہ ہے) اور مصرعۂ ثانی میں "اس فراق" (اس کے فراق) کا مشارٌ الیہ بھی گجرات ہے اور اس کے لئے "سیر"

---

۱ محبوب الزمن جلد دوم صفحہ ۱۱۳۶

۲ کلیاتِ ولی صفحہ ۲۰۵ کا نوٹ۔

۳ یادگارِ ولی صفحہ ۵۰

۴ ایک دکنی اہلِ قلم لکھتے ہیں: "شفیق اور فتوت اور محمد تقی ولی کے اورنگ آبادی ہونے پر متفق ہیں اور دکن میں سوا اورنگ آباد کے کسی شہر کو ولی کا وطن ہونے کا دعویٰ بھی نہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ولی اورنگ آباد دکن کے اصل باشندے تھے" (مقالاتِ ہاشمی صفحہ ۱۰۶) میر اور اُن کے تتبع میں شیفتہ کسی نے ولی کو اورنگ آباد کا باشندہ نہیں لکھا جن کی حقیقت ہم اپنے پچھلے مضمون میں ظاہر کر چکے ہیں۔ فتوت اور محمد تقی کی نسبت یہ صریحی غلط بیانی ہے اس لئے کہ ان دونوں میں سے کسی نے بھی ولی کو اورنگ آبادی نہیں لکھا۔ فتوت نے صرف "دکھنی" اور "زاد و بودش دکھن" (مقالاتِ ہاشمی صفحہ ۱۲۵) اور محمد تقی نے "متوطن دکن" (مقالات صفحہ ۱۲۱) لکھا ہے۔

کی بہ نسبت "شہر" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہاں ولی نے اپنے وطن مالوف احمد آباد کو "شہر" کہا ہے، تواریخ میں احمد آباد کو عام طور سے دار الملک گجرات لکھا گیا ہے۔

ملک دکن اور دکنی زبان

ہم اپنے مضمون میں اس بات کے متعدد شواہد پیش کر چکے ہیں کہ ولی نے اپنے تئیں اور دوسروں نے اُن کو "شاعر ملک دکن" لکھا ہے تو اس سے اُن کی مراد خطہ گجرات ہے جس پر عام طور سے دکن کا اطلاق ہوتا تھا۔ اسی طرح ولی کے دکنی زبان میں شعر کہنے کے متعلق بھی ہم نے مفصل بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض گجراتی شعرا کے اپنے ملک گجرات کو "ملک دکن" اور اپنی زبان کو "دکھنی" کہنے کی چند مثالیں ہم پہنچی ہیں جن کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں:-

۱۔ سید محمد اشرف متخلص بہ اشرف خاص احمد آباد گجرات کا باشندہ اور ولی کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے اشعار ذیل میں اپنے وطن گجرات کو "ملک دکن" لکھا ہے:-[1]

یہ شعر سُن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف   تمام شاعر ملکِ دکن سخن کی قسم[2]

ہوا سر مشق ہر یک صاحب طبع   سخن اشرف ترا ملکِ دکن میں

وصف میں تیرے شعر بولے ہیں   شاعرانِ دکن امیر الدین

کیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سوں اماموں کا   ہوا مشتاق ہر یک شاعر ملکِ دکن میرا

اسی طرح اپنی مثنوی "جنگ نامۂ حیدر" میں جو اس نے ۱۱۲۵ھ میں لکھی تھی کہتا ہے:-[3]

ہوس دل میں آیا کروں ترجماں   کروں فارسی کا یو دکھنی بیاں

بزاں فارسی کوں دکھنی مثال میں   پھر آیا ہوں اس کو ہر یک حال میں

۱؎ گلشن گفتار صفحہ ۱۲، ملاحظہ ہو مصنف شمارہ ۱۵ میں ہمارا مضمون سابق "اشرف گجراتی" یہ ہمارا ایک مفصل مقالہ عنقریب رسالۂ اردو میں شائع ہوگا جس میں ہم نے اشرف کو گجراتی اور ولی کا شاگرد ثابت کیا ہے۔

۲؎ حمید نے اپنے تذکرہ میں اشرف کی ۵ شعروں کی غزل نقل کی ہے اس کا یہ شعر ہے۔ حمید خود دکنی ہے اور اشرف کو گجراتی لکھا ہے اس کے باوجود اس شعر کے متعلق اُس نے کسی قسم کا ریمارک نہیں کیا۔

۳؎ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۴۹۔

۲۔ گودھرا (ضلع گجرات) کا ایک شاعر فتح شریف علی اپنے "پندنامہ لقمان" میں لکھتا ہے:۔

وہ لے نثر میں فارسی تھا اوّل ۔۔۔ کیا نظم دکھنی سوں یو بے بدل

تعجب ہے کہ اس شاعر کو مؤلف "تذکرہ اردو مخطوطات" نے دکنی لکھ دیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:۔

"فتح شریف گوڈر کا رہنے والا ایک دکنی شاعر تھا[۵۱]"

اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ "گوڈر" دکن کا کوئی شہر ہوگا۔ اس کی ایک تصنیف "زلیخائے ثانی" کی نسبت مؤلف مذکور نے لکھا ہے:۔

"مصنف کے ایک نامور دوست محمد امین نے فرمائش کی کہ تم بھی زلیخائے ثانی کا ایک ایسا قصہ لکھو

جس کی وجہ سے شہر گوڈرا کی شہرت ہو جائے"

یہاں شاعر کا وطن گوڈر سے گوڈرا ہو گیا۔ لیکن یہ "گودھرا" کی خرابی ہے جو دکن میں نہیں بلکہ گجرات کے ضلع پنچ محال میں بی بی سی آئی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ اور یہ محمد امین وہی ہے جس نے مثنوی یوسف زلیخا ۱۱۰۸ھ میں اپنے وطن گودھرے ہی میں لکھی تھی۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

بتاں چالیس سو کیر چھ دو اور سو ۔۔۔ میں لکھا گودھرے کے بیچ سن لیو

اس پر مؤلف "دکھنی مخطوطات" کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"اور یہ گودھری (گجراتی) زبان میں لکھی گئی ہے۔ مگر چونکہ امین کو دکن سے بھی تعلق رہا ہے اس لئے اس

مخطوطے کی صراحت ناظرین کی نذر کی جاتی ہے[۵۲]"

"مخطوطے کی صراحت" کا اشارہ غالباً اسپرنگر کی طرف ہے جس نے اس کو "دکھنی نظم" بتایا ہے لیکن مصنف تو یہ کہہ رہا ہے کہ اس نے یہ مثنوی شہر گودھرا میں لکھی ہے۔ گودھرے کو گودھری پڑھ کر اس کو گودھری اور گجراتی (حالانکہ یہ دونوں علیحدہ زبانیں ہیں) سمجھ لینے میں غلطی ہوئی ہے۔ آگے چل کر مؤلف نے تسلیم کیا ہے کہ امین گجراتی تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک میری تحقیقات ہے ان کا تعلق گجرات سے تھا۔ عالمگیر کے عہد میں دکن کا رخ کیا[۵۳]"

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ "دکن کا رخ کرنے" کے متعلق مؤلف کا ماخذ کونسا ہے؟

۳۔ تبر المحمد جو گجرات کے سند دیوان میں سے تھے اور جنہوں نے اس فرقے کے بزرگوں اور پیشواؤں کے

---

۵۱ تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ ۱۳۱۔

۵۲ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۔۔۔

۵۳ ″ ″ ″ صفحہ ۔۔۔

حالات میں ایک مثنوی "فیض نام" ۱۲۱۱ھ میں لکھی ہے۔ اس میں وہ اپنی زبان کو دکنی لکھتے ہیں:-

سہل کر دکنی میں لکھی کتاب — سو آدمی سمجھیں ہر یک دکنی شتاب
کہ سب کو دکنی زباں میں کلام — رکھیا نانو اس کا یقیں فیض نام

اس کے متعلق پروفیسر شیرانی مرحوم رقمطراز ہیں:-

"یہ لوگ (مہدوی) اصلاً گجرات کے رہنے والے تھے جہاں اردو کی وہ شاخ جسے گوجری کہا جاتا تھا رائج تھی، اور دکنی زبانیں آپس میں اس قدر مشابہ ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس واسطے یہ لوگ دکنی لٹریچر سے گہری آشنائی رکھتے ہوں گے۔ ان کی دو ... شاعری کا پہلا نتیجہ ایک ایسی زبان میں ہے جسے دکنی کے سوا دوسرے نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے میری مراد مثنوی فیض نامہ ہے اور جو اوائل گزشتہ صفحات میں مذکور ہو چکا ہے۔ عبدالصمد اس کا مصنف ہے۔"[1]

ایک گجراتی مصنف کے اپنی زبان کو "دکنی" لکھنے پر شیرانی مرحوم کو اس کی توجیہ کرنی پڑی، اور آخر انھوں نے اپنا یہ قیاس پیش کیا ہے کہ یہ گجراتی مصنف دکنی لٹریچر سے گہری آشنائی رکھتے ہوں گے حالانکہ مرحوم نے خود تسلیم کیا ہے کہ گوجری اور دکنی اس قدر مشابہ ہیں کہ ان میں فرق کرنا دشوار ہے۔ یہ رائے خود ایک علیحدہ بحث ہے۔ لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک گجراتی مصنف کی تصنیف ہے اور گجرات ہی میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی پر بحث کرتے ہوئے مرحوم نے اس کی جو لسانی خصوصیات دکھائی ہیں وہ اکثر گجراتی ہیں۔[2]

۴۔ عبداللہ بن اسحاق واعظ ریاست گونڈل (کاٹھیاواڑ) کے شہر "دھوراجی" کے رہنے والے تھے ۱۱۹۶ھ میں انھوں نے "نشاۃ العشق و منور" لکھی ہے۔ وہ کاٹھیاواڑ گجرات کے باشندہ ہونے کے باوجود اپنی زبان کو دکنی لکھتے ہیں:-

زباں دکنی میں ایک قصہ سناؤں — سخن جو دیں اسو سب کو سناؤں
میں عبداللہ واعظ ابن اسحاق — ہوا یا ... مرے غم کا تریاق
شروع قصہ کیا دسویں صفر کو — وہ دن کا پہر کا وقت ظہر کو
ختم دسویں ربیع اول کیا ہے — گیارہ سو چھیانوے اندر لکھا ہے

---

[1] اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۳۰ء صفحہ ۴۴

[2] " " " صفحات ۸۸ و ۹۹۔

مہینہ ایک میں قصہ ٹھا ہے — سنو سورت میں یہ قصہ بنا ہے

شروع قصہ کیا گونڈل کے اندر — اوسے پورا کیا دھوراجی بھیتر [1]

ولی کے نام کی تحقیق

گزشتہ مضمون میں ہم نے ولی کے نام سے مختصر بحث کی ہے۔ یہاں ہم اس پر تفصیلی نظر ڈال کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولی کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ جو احمد آباد کے مشہور بزرگ حضرت علامہ شاہ وجیہ الدین علوی قدس سرہ کے خاندان سے تھے۔

اردو شعرا کے حالات میں تین قسم کی کتابیں ملتی ہیں:-

(۱) قدیم تذکرے جو بارھویں صدی کے نصف سے لے کر تیرھویں صدی کے آخر تک لکھے گئے ہیں کچھ تو ذاتی تحقیقات اور کچھ سنی سنائی روایات پر مبنی ہیں۔

(۲) "جدید تذکرے" جو چودھویں صدی میں لکھے گئے ہیں جن میں سے اکثر قدیم تذکروں سے ماخوذ ہیں یا تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہیں۔

(۳) "مستشرقین یورپ کی تصانیف" مثلاً یورپ کے کتب خانوں کے اردو مخطوطات کی فہرستیں جن میں ان مخطوطات کے مطالعے سے یا قدیم و جدید تذکروں سے تحقیق کر کے شعرائے اردو کا ذکر کیا گیا ہے۔

ذیل میں ہم ان تینوں قسم کے تذکروں کے بیانات ولی کے نام کے متعلق نقل کرتے ہیں

قسم اول:-

(۱) "مخزن نکات" از قائم چاند پوری (۱۱۶۸ھ) ولی کی وفات کے ۵۰ برس بعد کی تصنیف

"شاہ ولی اللہ مولدش گجرات، گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از اولیا مشاہیر است افتخار می داشت" (ص ۱)

(۲) "تذکرۂ شعرائے اردو" مولفہ میر حسن (۱۱۸۸ھ - ۱۱۹۲ھ)

"درویش غنی و جلی شاہ ولی المتخلص بہ ولی مشہور معروف مردے بود از خاک گجرات" (ص ۲۰۴)

احمد گجراتی کی نسبت لکھتے ہیں:-

"چوں معاصر شاہ ولی اللہ بودہ در سر ریختہ نیز گفتہ" (ص ۴۱)

(۳) "تذکرۂ گلزار ابراہیم" از علی ابراہیم خاں خلیل (۱۱۹۸ھ)

"ولی دکنی شاہ ولی اللہ اصلش از گجرات" (ص ۲۴۶)

[1] قصہ ... بہ عزبارہ قصہ، مطبوعہ کریمی پریس بمبئی ۱۳۲۰ھ، صفحات ۶۹ و ۸۴

(۴) "تذکرۂ گلشن ہند" از مرزا علی لطف (سنہ ۱۸۰۱ء)

"ولی تخلص شاہ ولی اللہ نام" (صفحہ ۱۷۵)

(۵) "تذکرۂ طبقات سخن" مؤلفہ شیخ غلام محی الدین قریشی تخلص عشق و مبتلا میرٹھی (سنہ ۱۲۲۲ھ) تذکرۂ آبرو:-

"چوں دیوان ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بعہد محمد شاہ بدہلی رسید تتبع آن شد" [۵۱]

(۶) سخن شعرا از عبدالغفور خاں نساخ (سنہ ۱۲۹۱ھ)۔

"ولی تخلص شاہ ولی اللہ اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمۃ کے" (صفحہ ۵۰۶)

قسم دوم:-

(۷) "آب حیات" آزاد:- "شمس ولی اللہ" (صفحہ ۸۳)

(۸) "جلوۂ خضر" از صفیر بلگرامی: "ولی اللہ ولی" (ج ۱ صفحہ [illegible] و صفحہ [illegible])

(۹) "گل رعنا" از مولوی عبدالحی: "شمس الدین لقب ولی اللہ نام" (صفحہ [illegible])

(۱۰) "ارباب سخن" از حسرت موہانی: "شاہ ولی اللہ" (صفحہ [illegible])

قسم سوم —

(۱۱) "دیوان ولی" مرتبہ گارساں دی تاسی (سنہ ۱۸۳۴ء)

"ولی کا نام شاہ ولی اللہ تھا" (مقدمہ [illegible])

(۱۲) "مخطوطۂ دیوان ولی" (مملوکہ گارساں دی تاسی) "شاہ [illegible] ولی اللہ" [۵۲]

(۱۳) "یادگار شعراء" مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر (سنہ ۱۸۵۴ء)

"ولی شاہ ولی اللہ ساکن گجرات" (صفحہ [illegible])

(۱۴) "اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری" از طامس ولیم بیل (سنہ ۱۸۹۴ء)

"شاہ ولی اللہ ولی تخلص ساکن گجرات" (صفحہ ۴۱۵)

(۱۵) "اڈنبرا کیٹلاگ": "شاہ ولی اللہ گجرات کے باشندے تھے" [۵۳]

(۱۶) "آکسفورڈ کیٹلاگ": "ہندوستان کے ممتاز شاعر شاہ محمد ولی گجراتی" [۵۴]

(۱۷) "انڈیا آفس کیٹلاگ" از بلوم ہارٹ "ولی دکنی جن کا نام شاہ ولی اللہ تھا بعض محمد ولی اور بعض ولی اللہ سے موسوم کرتے ہیں۔ ولی الدین بھی کہا گیا ہے۔ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے" [۵۵]

---

[۵۱] ہندوستانی بابت جولائی ۱۹۳۱ء "دہلی میں اردو شاعری کا آغاز" صفحہ ۳۲۵ ، [۵۲] دیکھو یادگار ولی صفحہ ۹۱۲
[۵۳] گارساں دتاسی مرتبہ زور قادری صفحہ ۳۶ ، [۵۴] یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۳۳۳
[۵۵] " " "
[۵۶] " " " صفحہ ۳۳۳

(۱۸) "ہندوستان کی پیمائش لسانی" از جارج گریرسن (سنہ ۱۹۱۹ء) "دتی کا نام شاہ ولی تھا" (صفحہ ۲۴۹)

(۱۹) "تاریخ ادب اردو" از گراہم بیلی (سنہ ۱۹۳۲ء) "شمس الدین ولی اللہ" (صفحہ ۳۳)

بعض تذکرہ نویسوں نے "محمد ولی" لکھا ہے جو پورے نام "محمد ولی اللہ" کا مخفف ہے، چنانچہ گردیزی، شفیق، فائق، شورش، ذکا، قاسم، نے بھی یہی نام لکھا ہے۔ مصحفی ملکاپوری اور حکیم سید شمس اللہ قادری نے بھی "محمد ولی" کو ترجیح دی ہے، خود خاندان شاہ ولی اللہ کی قلمی بیاضوں اور ان کی مُہروں اور دستخطوں میں لکھے ہوئے ناموں میں بھی تھوڑا تھوڑا فرق ہے چنانچہ

(۱) شجرۂ نسب میں : "شاہ محمد ولی اللہ" (۲) مُہر میں : "محمد ولی اللہ"

(۳) مولوی سید احمد ابو سید عابد علوی کی بیاض میں : "شاہ ولی اللہ"

(۴) ان کے بھانجے شاہ یحیٰ ابن غنی علوی متوفی سنہ ۱۱۵۵ھ کی لکھی ہوئی تاریخ وفات میں "ولی اللہ"

(۵) ملفوظات کبیری میں "میاں ولی اللہ"

لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا پورا نام "شاہ محمد ولی اللہ" ہے جس کو بعض نے "شاہ ولی اللہ" بعض نے "محمد ولی اللہ" اور بعض نے صرف "ولی اللہ" یا "میاں ولی اللہ" لکھدیا ہے، جو ان کے پورے نام کے اجزا، یا مختصر شکلیں ہیں، اور غالباً اسی آخری نام کی بناپر دیوان ولی کے بعض قدیم مخطوطوں میں کاتبوں نے ان کا نام "میاں ولی محمد" لکھ دیا ہو تو تعجب نہیں۔ چنانچہ ثناء اللہ فانی کے لکھے ہوئے مخطوطہ سنہ ۱۱۳۸ھ میں "سید ولی محمد" اور انڈیا آفس کے مخطوطہ دیوان ولی مکتوبہ سنہ ۱۱۵۰ھ کے کاتب محمد تقی نے "میاں ولی محمد" لکھا ہے۔ تذکروں میں یہ نام صرف "گلشن گفتار" میں ملتا ہے۔ اس کے سوا کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ تقریباً تمام تذکروں میں شاہ محمد ولی اللہ، محمد ولی اللہ، ولی اللہ، اور محمد ولی لکھا ہوا ہے۔ جو ایک ہی نام کو ظاہر کرتا ہے، اور اسی پر تمام قدیم وجدید تذکرے متفق ہیں۔

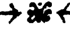
عزیز مکرم سید ظہیر الدین مدنی (پروفیسر گجرات کالج) نے سنہ ۱۱۰۰ھ کے ایک "تمسک نامہ" میں شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے دستخطوں میں ولی اللہ کے والد کا نام دو طرح سے لکھا ہوا پایا ہے چنانچہ ایک نے "محمد شریف" لکھا ہے، تو دوسرے نے "شریف محمد"۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ جب شاہ ولی اللہ کے بیٹے اپنے دادا کا نام دو طرح سے لکھتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں اگر کاتبوں نے ان کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ کا نام "محمد ولی" کی بجائے "ولی محمد" لکھدیا۔

اختر جوناگڑھی

ایک دلچسپ سفرنامہ

سنہ ۱۹۰۷ء کا جاپان

(از جناب ڈاکٹر حاجی محمد حسین صاحب مرحوم)



ذیل کا مضمون ایک نہایت دلچسپ اور معلوماتی "سفرنامہ" بصورت مکتوب ہے، جو ہماری درخواست پر اوائل سنہ ۴۲ء میں جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم نے ازراہ "مصنف نوازی" عنایت کیا تھا لیکن چونکہ اُس وقت "ہندوستان اور جاپان کی جنگ" جاری تھی، اس لئے باوجودیکہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ پھر بھی صحافتی ذمہ داری کی نزاکتیں مانعِ اشاعت رہیں۔

اب کہ ہمارے "دشمنِ دین و ایمان" اپنے کیفرِ کردار کو پہونچ کر تہس نہس ہو چکا اور کسی قسم کی سب و شتم" یا "ثنا و صفت" نہ تو "مصالحِ جنگ" پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ مخالف کو نقصان یا فائدہ پہونچا سکتی ہے، اس لئے یہ "تاریخی" خط (سفرنامہ) نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے۔

جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری مرحوم و مغفور نے اس خط کے کاتب و مکتوب الیہ کا حسبِ ذیل تعارف بھی ہمیں لکھ دیا تھا:-

"خان بہادر ڈاکٹر حاجی محمد حسین صاحب میڈیکل کالج لاہور کے پاس شدہ تھے۔ ہندوستان میں ڈاکٹری کی ملازمت کے بعد جدہ میں حکومت برطانیہ کی طرف سے "نائب قونصل" کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ اور اس حیثیت سے وہاں عرصۂ دراز تک رہے۔ پنشن پانے کے بعد وہ مع اپنے بیوی بچوں کے انگلستان چلے گئے اور کئی سال تک وہاں رہے۔ وہ بہت دولتمند سمجھے جاتے تھے۔ انگلستان کے قیام سے جب جی بھر گیا تو ہندوستان آ کر دہرہ دون رہے اور وہاں "دار السلام" کے نام سے ایک شاندار اور دہرہ دون میں سب سے بڑی کوٹھی بنا کر اسی میں قیام کیا۔

پھر مدینہ منورہ جا کر علاج کے ذریعہ مخلوقِ خدا کی خدمت کی۔ دوبارہ دہرہ دون آئے تو وہاں انگریزی طریقۂ تعلیم کا ایک اسکول قائم کر کے اسے چلایا۔

آخر عمر میں وہ ڈیرہ دون کی تمام جائداد فروخت کرکے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہیں قیام کیا۔

طالب علمی کے زمانہ سے ان کی بڑی دوستی مولوی عبداللہ جان صاحب سے تھی (جن کے نام یہ خط ہے)
مولوی صاحب موصوف لدھیانہ کے رہنے والے تھے اور سہارنپور میں نامور وکیل تھے۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے
شخص تھے۔ عربی اور فارسی مثل مادری زبان کے بولتے اور لکھتے تھے۔ اسی طرح انگریزی بھی روانی کے ساتھ بولتے
اور لکھتے تھے جو انھوں نے بعد میں پڑھ لی تھی۔ وہ مدت تک حاجی محمد حسین صاحب کے ساتھ انگلستان میں مقیم رہے
(سنا ہے اسی قیام میں حاجی محمد حسین صاحب نے ان کو کئی لاکھ روپئے کے نوٹ نذر کرنے چاہے مگر انھوں نے قبول نہ کیا)
مولوی عبداللہ جان صاحب کو سرسید علیہ الرحمۃ اور علیگڑھ تحریک سے عشق تھا۔ وکالت کے زمانہ میں ہر سال
آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر چندہ ہائی تعداد میں بنانے رہتے اور اس کے ہر اجلاس میں نیز علی گڑھ کالج
کے تمام جلسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ وہ عرصہ دراز تک کالج کے ٹرسٹی رہے۔ ان کا انتقال
سہارنپور میں ہوا۔ اور وہیں دفن ہوئے۔ دونوں اصحاب حکومت برطانیہ کے بڑے وفادار اور سچے خیرخواہ تھے۔"

راقم السطور مدیر مصنف نے دونوں اصحاب کو دیکھا ہے۔ سنہ یاد نہیں غالباً سنہ ۲۵ء اور سنہ ۳۰ء کے دوران میں کسی سال حاجی محمد حسین صاحب یونیورسٹی کانووکیشن میں تشریف لائے تھے۔ پستہ قد گٹھا ہوا بدن اور نہایت رنگ۔ تنہا داڑھی رکھتے تھے اور ٹخنوں تک کی نیچی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ اسٹریچی ہال کے سامنے احباب کے جھرمٹ میں بہت جوش کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

مولوی عبداللہ جان صاحب انتہائی مہمان نوازی، احباب پرستی اور شاہانہ خصائل کے باعث بہت کلفت زدہ ہو گئے تھے۔ اور مولانا سید فضل احمد صاحب مرحوم ہی کے یہاں کاظم منزل میں ایک عزیز خاص کی طرح رہتے تھے۔ ذاتی اثاثہ اور متعلقین ختم ہو چکے تھے۔ سپید نیچی داڑھی، بلند قامت، گورا رنگ، نورانی چہرہ، اور ضعیف العمری کے باوجود نہایت وجیہ اور باوقار شخصیت کے مالک تھے، ہر قسم کی معلومات اور قابلیت کا مجسمہ تھے۔ مولانا مرحوم ہی کے یہاں ۲۶ء یا ۲۷ء میں پہلی بار ان کی زیارت نصیب ہوئی۔ مرحوم کے اور سرسید کے نام خطوط کا ایک بہت بڑا ذخیرہ خان بہادر قاضی عزیزالدین احمد صاحب بلگرامی (علیگڑھ) کے پاس محفوظ ہے۔

جناب حاجی مولوی ابوالحسن صاحب غازی پوری سابق ڈائرکٹر تعلیمات ریاست کشمیر کے پاس بھی بوجہ تعلقات خصوصی مولوی عبداللہ جان صاحب کے بہت سے خطوط تھے جو موصوف نے قاضی صاحب کے ذخیرہ میں اضافہ کر دئے ہیں۔ غالباً یہ مجموعہ خطوط کتابی شکل میں مرتب ہو کر شائع ہوگا اور زمانہ سے

انیسویں صدی کی ربع آخر اور بیسویں صدی عیسوی کی ربع اول کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر بہت کچھ روشنی پڑے گی۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ ۔

سید الطاف علی بریلوی

انٹرنیشنل ٹرین ڈی لوپ

۱۱ ستمبر ۱۹۰۷ء

مائی ڈیر مولوی صاحب۔

السلام علیکم۔ مزاج عالی۔

جب سے میں آپ سے رخصت ہو کر یورپ کی طرف روانہ ہوا۔ آپ کو بہت ہی کم خط لکھنے کا موقع ملا۔ اور سارا وقت ایک مسلسل مشغولیت میں گزرا۔ کل ۷ بجے شام کو ولاڈی واسٹک سے اس ٹرین میں سوار ہوا ہوں اور گیارہ دن کا ماسکو تک متواتر سفر رہا ہے۔ اس لئے ذرا دم لینے کی فرصت ملی ہے۔ اور جی چاہا کہ آپ کو مختصراً اپنے شروع سے سفر کا کچھ حال سناؤں۔ بہت سا نہیں، تو تھوڑا ہی سا اپنے اس سفر کے لطف میں شریک کروں۔ کلکتہ تک کی حالت سے تو آپ واقف ہیں اور ممکن ہے بڑھا بھی دیکھ چکے ہوں۔ لہٰذا میں اپنے سفر کو کلکتہ سے شروع کرتا ہوں۔

۵ر جولائی کو میں اور ائر دول جنگ مع مسٹر دل جنگ و مس دل جنگ کے B.I. کے جہاز "سنڈولا" میں رنگون کے لئے روانہ ہوئے۔ پہلی دن تو ہگلی کے کناروں کی خوشنما بہار میں بسر ہوا۔ دوسرے دن خوب بارش رہی۔ اور کسی قدر تلاطم۔ تیسرا دن بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ چوتھے دن رنگون پہنچ گئے۔ جہاز کنارے لگایا گیا اور ہم لوگ اترے۔ یہاں کے سب سے اچھے ہوٹل میں جو دریا کنارے ہے۔ فروکش ہوئے۔ یہاں ہمارے دوست علی عارف صاحب (جو کئی برس ہوئے میرے ساتھ آپ کے مہمان ہوئے تھے) ملے اور انھوں نے رنگون کی خوب سیر کرائی۔ اور اچھی طرح رنگون کے اندرونی اور ظاہری حالات سے واقفیت پیدا ہوئی۔ یہاں سے ۱۱ر جولائی کو روانگی کا قصد تھا مگر اس ہفتہ کا B.I. جہاز جو پینانگ اور "سنگاپور" جاتا اس کا جانا منسوخ ہو گیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو جہاز اس ہفتہ روانہ ہونے والا تھا وہ موقع پر کچھ کسی قدر بے کار ہو گیا تھا۔

الغرض ایک ہفتہ اور رنگون میں ٹھیرنا پڑا۔ ہم نے بھی چاہا کہ اس کو ضائع نہ کریں۔ رنگون تو دیکھ ہی چکے تھے۔ "مانڈلے" کی سیر کا قصد کیا وہاں پہنچے۔ وہاں کی بھی خوب سیر کی۔ بہت بڑا شہر ہے۔ سڑکیں

ہیں کہ گھنٹوں گاڑی میں چلے جائیے کہیں ختم ہی نہیں ہوتیں۔ مگر بالکل ویران۔ اس پر بھی لکھنؤ اور دلی کی سی مردگی برستی ہے۔ بادشاہ تھی باکا پیلیس رو رو کر اپنی جان کھو رہا ہے۔ اور کچھ سالوں میں اپنے تئیں مٹائیگا یہ محل عیسائیوں کے احاطہ میں ہے۔ یہاں ایک "مارکٹ" نہایت عمدہ ہے۔ اور اس میں دکان دار اکثر پری جمال ہیں۔ برہما میں سارے کام عورتیں کرتی ہیں۔ اور مرد صرف کھانا اور آرام کرنا جانتے ہیں۔ ہاں رنگون کے شہر کی کیفیت میں چھوڑ گیا۔ رنگون بالکل نئی وضع کا شہر ہے۔ سڑکیں نہایت صاف کلکتہ اور بمبئی کی سڑکوں سے اچھی۔ گاڑیاں نہایت نفیس۔ گھوڑے نہایت خوب صورت۔ مکان اور بازار نہایت شان دار۔ یہاں اور مانڈلے میں دونوں جگہ دکان دار اکثر ہندوستانی ہیں۔ صرف چھوٹی چھوٹی دکانیں ہر چیز کی ہیں اور اُن پر مرد کم نظر آتے ہیں۔ مانڈلے میں بھی اتنا وقت نہیں بسر ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہاں "مانڈلے" سے اور آگے ایک بے مثل پل بنایا گیا ہے جس پر سے ریل گزرتی ہے۔ اس کے دیکھنے کو چلے گئے۔

یہ پل بہت لمبا ہے اور دو سو فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ اور سب سے زیادہ وصف یہ ہے کہ اس کے کھمبے وغیرہ سب لوہے کے ہیں اور یہ پہاڑ کے ایک درّہ میں واقع ہے جس درّے میں ایک دریا آکر ٹھیک اس پل کے نیچے پہاڑ میں غائب ہو جاتا ہے اور پل کی دوسری طرف کئی گز پر پھر نمودار ہو جاتا ہے۔ یہاں سے چل کر وہ پہاڑ دیکھا جہاں یہاں کا گورنر گرمی میں رہتا ہے اس کا نام "میمیو" ہے۔ یہ ایک معمولی پہاڑی اسٹیشن ہے۔ "مانڈلے" اور "رنگون" کے اور عجائبات میں یہاں بدھوں کے پگوڈا قابل بیان ہیں۔ سب سے بڑا پگوڈا رنگون میں ہے اور عجیب نقاشی اور صناعی برمیوں نے اس پر صرف کی ہے۔ برہما کی عورتیں عام طور پر زیادہ خوب صورت نہیں۔ مگر بعض بعض بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ایک بات اُن میں عجیب یہ ہے کہ سب کی سب خوش وضع۔ اور خوش خلق، خوش باش۔ اور ہمیشہ خوش۔ کسی سے یہاں ہنسی مذاق کی باتیں کیجئے۔ سوا ہنس ہنس کے جواب دینے کے کوئی آپ سے رنجیدہ نہیں ہوگا۔ "مانڈلے" میں ایک بہت بڑی ریشمی کپڑوں کی دکان پر ہم لوگ پہونچے۔ دکان دار دو نہایت حسین عورتیں تھیں۔ ان سے کپڑا بھی خریدتے جاتے تھے۔ اور مذاق بھی ہوتا جاتا تھا۔ اور وہ بھی نہایت خوش تھیں۔ ہمارے دوست علی عارف صاحب نے ایک سے کہا کہ یہ (میری طرف اشارہ کرکے) تم کو پسند ہیں وہ ہنس پڑی۔ اور کہا میں بڑی ممنون ہوں۔ اس کے بعد میں نے چاہا اُس کا فوٹو لوں۔ فوراً اُٹھی ہو گئی۔ جدہ پہنچ کر کبھی یاد آیا تو آپ کو بھی ان کی زیارت کرا دوں گا۔ غرض کہ سترہ جولائی تک نہایت لطف کے ساتھ "برہما" میں گزار کر اٹھارہ کو رنگون سے ...... کے جہاز "تارا" میں روانہ ہوئے۔ دو دن

میں "پنیانگ" پہنچے۔ یہ "اسٹریٹ سٹلمنٹ" کا پہلا شہر ہے۔ نہایت اچھا پُرفضا بندر ہے۔ شہر کے پشت پر پہاڑ ہیں اور بندر اور شہر کی سبزی کو زیادہ خوشنما کر دیتے ہیں۔ یہاں سے رکشا کی سواری شروع ہو جاتی ہے۔ گاڑیاں بہت کم ہیں اور وہ بھی اچھی نہیں۔

ہم لوگ جہاز سے اُترے اور شہر کی سیر کی۔ یہاں ایک قسم کا پھل ہوتا ہے جو کٹھل سے بہت مشابہ مگر بہت چھوٹا۔ اس کو "دُریان" کہتے ہیں اور یہاں والے اس کی اس قدر تعریف کرتے ہیں کہ اس سے بڑھکر دُنیا میں کوئی اور پھل ہی نہیں۔ مگر ہے یہ کہ اس کے کھانے کے لئے آدمی کو پہلے چینیوں اور برہمیوں کی قوتِ شامہ پیدا کرنی چاہئے تب وہ کھا سکتا ہے۔ اِس کی بو اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ہوا کے رُخ پر میلوں کی خبر لیتی ہے اور پُرانی سنڈاسوں کا عطر نکالا جائے تو بھی شاید اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ سارا شہر "دُریان" کی بُو سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں والے "دُریان" کے مغز کو کھاتے ہیں اور اس کے چھلکے کا اچار بناتے ہیں۔ یہاں دیکھنے کے قابل ایک "بوٹانیکل گارڈن" اور "آبشار" ہے۔ چند ہوٹل اور بینک بھی یہاں ہیں۔ شہر دیکھ بھال کر پھر جہاز پر واپس گئے اور اگلے دن سنگاپور کے لئے روانہ ہو گئے۔

سنگاپور کا "بندر" نہایت عمدہ "بندر" ہے اور یہاں دس لاکھ پونڈ کے صرف سے ایک نیا "ڈاک" بن رہا ہے۔ اس کے تیار ہو جانے کے بعد سارے شرق میں یہ "بندر" لاثانی ہو جائے گا۔ سنگاپور بمبئی کی طرح ایک جزیرہ ہے۔ بہت سرسبز۔ اور باوجودیکہ خطِ استوا سے بہت قریب ہے۔ یہاں گرمی اس قدر نہیں۔ شب کو کمرہ میں سوئے اور صبح کے قریب بالکل دولائی کی سردی تھی۔ بارش یہاں بہت ہوتی ہے اور یہی اس کو ٹھنڈا رکھتی ہے۔ یہاں سید عمر صاحب کے ہاں مہمان ہوئے۔ یہ صاحب عرب ہیں اور میرے خود کے دوست ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد نے اس جزیرے میں اس قدر ملکت پیدا کر لی ہے کہ یہاں کے پرنس سمجھے جاتے ہیں۔ دو دن یہاں رہنا ہوا۔ شہر یہ بھی بالکل یورپین وضع کا ہے اور چونکہ "فری پورٹ" ہے تجارت کا "سینٹر" ہے یہاں "الفریڈ تھیٹریکل کمپنی" بمبئی والی موجود تھی۔ رات کو اس کا تماشہ دیکھا اور نہایت اچھے دو دن گزار کر ۲ جولائی کو ایک جرمن "میل اسٹیمر" میں سوار ہو کر راہی "ہانگ کانگ" ہوئے۔ چار دن میں ہانگ کانگ پہونچے۔

جرمن جہاز میں یہ میرا پہلا سفر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جرمن آج کل سب سے بڑھ گئے۔ کسی ملک کے جہاز میں یہ آسائشیں نہیں جو اس میں موجود۔ اور تو اور آپ کے میلے کپڑے بھی روز کے روز دُھلتے جائیں صبح سے شام تک سات مرتبہ آپ کو کھانا دیں۔ اور ہضم کرنے کے لئے بڑی بڑی ڈک موجود ہیں۔ جس قدر چاہئے ورزش کیجئے۔ ٹہلئے۔ دوڑئے۔ کرکٹ کھیلئے۔ یہاں کھانوں کے وقت گھنٹہ نہیں بجایا جاتا

بلکہ بگل بجتا ہے اور چائے اور ڈنر کے وقت بینڈ بجتا ہے اور جب نکلتا ہے تو بینڈ بجاتا ہوا۔ ہر کیبن میں بجلی کی روشنی اور پنکھا اور نل۔ نوکر نہایت باادب باسلیقہ اور حاضر باش۔ غرض کہ ہانگ کانگ میں اُترے۔ یہ ایک عجیب قسم کا "بندر" ہے۔ چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا۔ بالکل ایک جھیل کی سی شکل۔ اصل میں ہانگ کانگ ایک جزیرہ ہے۔ "بندر" کے ایک طرف یہ واقع ہوا اور دوسری طرف اصل کنارہ جو چین کی زمین سے متصل ہے۔ "ہانگ کانگ" کی آبادی بالکل یوروپین اور عمارتیں نہایت ہی بڑی۔ "الیکٹرک ٹریموے" پہاڑ کی چوٹی تک موجود۔ پہاڑ پر چڑھتی ہوئی آبادی نہایت خوشنما۔ دوسری طرف چینی شہر پُرانی وضع کا۔ میلے چھوٹے مکانات اور بدوضع۔ دونوں شہروں کے درمیان ۱۰۔۱۵ منٹ پر "اسٹیم لانچ" آتی جاتی رہتی ہیں۔ اور اس طرح دونوں کو ایک کر رکھا ہے۔ ٹامس کک نے جس نے دنیا بھر میں سیاحوں کی آرام رسانی کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ یہاں بھی آفس کھول رکھا ہے۔ اس کے آفس میں پہونچے اور یہاں کی سیر میں اس سے بہت مدد ملی۔ پہاڑ کی چوٹی پر ٹریموے سے جا کر ایک ہوٹل ملتا ہے یہاں آرام کیجئے اور اس جزیرہ کے اطراف کی سیر کیجئے اور لطف اُٹھائیے۔

اگلے دن یہاں سے روانہ ہو کر اگست کی تیسری کو "شنگھائی" پہونچے۔ یہاں جہاز تقریباً ایک دن دریا میں چل آتا ہے۔ اور شہر سے ۱۸ میل پر (بڑا جہاز) ٹھیر جاتا ہے۔ یہاں سے شہر تک "اسٹیم لانچ" مسافروں کو لاتی لے جاتی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں یہ مسافت طے ہوتی ہے۔ یہاں میں تنہا اُترا اور "شنگھائی" پہونچا۔ چونکہ یہاں ترجمان کی ضرورت ہے لہذا سیدھا "ایسٹر ہاؤس ہوٹل" میں پہونچا۔ یہاں ایک کمرہ لیا۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ ٹفن کھایا۔ گاڑی منگائی اور ایک گائڈ لیا اور چل دئیے پھرنے کو۔ پہلے پُرانا چینی شہر دیکھا۔ بہت بڑا شہر ہے۔ مگر بنارس کی سی گلیاں، دکانیں مختلف تجارتی اموال سے پُر۔ تاجر سب چینی۔ اکثر میلے۔ نالیاں سڑی ہوئی۔ پہلے تو تین گھنٹہ پیدل پھر کر شہر دیکھا پھر یہاں کے "مندر" دیکھے۔ بعض بُدھ کے اور بعض اور دیوتاؤں کے جوان لوگوں نے خود پیدا کر لئے ہیں۔ جن کو نہ "بُدھ ازم" نہ "کنفیوشزم" سے کچھ واسطہ ہے۔ ان دیوتاؤں میں سے کوئی پانی کا مالک ہے کوئی سمندر کا کوئی موت کا۔ کوئی زندگی کا۔ غرض ایسے ہی مہملات سب ہیں۔

چینیوں کا قبرستان دیکھا یہ ایک نہایت عمدہ چیز ہے۔ یہ ایک بہت بڑا مکان ہے جس میں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں جیسے پُرانے زمانہ میں مصر وغیرہ میں ہوا کرتے تھے جن کو "کیٹا کومبز" کہتے ہیں وہ زمین کے اندر ہوا کرتی تھیں۔ یہ سطح زمین پر ہیں۔ لاش ایک صندوق میں رکھی جاتی ہے اور اسباغ کرنے کے بعد ایک کوٹھری میں رکھ دی جاتی ہے۔ لاش کے وارث نسلاً بعد نسلاً دو دو آنہ کرایہ ہوا

اس کا کرایہ بھرا کرتے ہیں۔ چینیوں میں بھی بہت سی ذاتیں ہیں اور اس لحاظ سے بہت سے قبرستان بھی ہیں جو لوگ غریب ہیں وہ زمین میں دفن کئے جاتے ہیں۔

یہاں کا جیل دیکھا جہاں کچھ پُرانی وضع کے قیدی جو لکڑیوں میں بندھے ہوئے۔ کسی کی گردن شکنجہ میں کسی ہوئی مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا۔ اور دوسری قسم کا جیل بھی ہے جو نئے سسٹم کے موافق بنا ہوا ہے۔ یہاں کے گورنر کا دربار روم دیکھا۔ دربار روم کیا چنڈو خانہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک گڑھیا اس کے سامنے ہے جس کے پانی پر سبز کائی جمی ہوئی ہے۔ گائڈ نے کہا کہ نہایت عمدہ باغ ہے مجھے سخت تعجب ہوا کیونکہ گڑھیا کے کنارے صرف تین چار ہی درخت تھے۔ کمرہ کو دکھلانے کے بعد ایک تنگ سے راستہ سے گائڈ دوسری طرف لے چلا۔ راستہ بالکل پہاڑی معلوم ہوتا تھا۔ کچھ چڑھنے اُترنے کے بعد کچھ درخت نظر آئے۔ اور ایک کمرہ۔ غرض اسی طرح کے بہت سے سین اس باغ میں ہیں اور ایک لحاظ سے واقعی یہ باغ نہایت عجیب ہے کہ چینیوں نے جو قدرتی طور پر نیچر کے فریفتہ ہیں شہر کے اندر ایک پہاڑی باغ اس طرح کا بنا دیا ہے کہ اس کے اندر کے رہنے والے کو کبھی نہ معلوم ہو کہ وہ میدان میں ہے اور شہر میں۔ یہاں سے نکل کر چینی چائے گھر" جس کو عام لوگ استعمال کرتے ہیں دیکھا اس مکان میں جو نہایت کثیف ہے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی میزیں پڑی ہیں اور بیٹھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی تپائیاں۔ لوگ یہاں آکر چائے پیتے ہیں گپ لگاتے ہیں۔ اخبار خوانی کرتے ہیں۔ اور بعض بعض کچھ ناشتہ بھی۔ دو منزلہ مکان ہے۔ اوپر جانے کی سیڑھی اس قدر تنگ کہ ہندوستان کا ایک بونا بھی اوپر نہ پہونچ سکے۔ نتیجہ یہ کہ چینی موٹے نہیں ہوتے۔ یہاں سے واپس ہو کر اپنی گاڑی پر سوار ہو کر ایک اور چائے خانہ میں جو ایک محفوظ بڑے باغ میں واقع ہے اور یہ باغ بھی ایک پہاڑی وضع کا بنایا ہوا ہے۔ پہونچے۔ یہ چائے خانہ اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے ہے۔ یہاں ایک پیالی چا کے لئے آدھا ڈالر یعنی ۱۲؍ دینے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد نئی شنگھائی کی سیر کی۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ "شنگھائی" میں انگلش، فرنچ، جرمن، امریکن، نو آبادیاں ہیں اور ہر ایک کو اپنی نو آبادی میں اپنے قوانین کے موافق اختیارات حاصل ہیں اس لئے ہر ایک گویا ایک مستقل شہر ہے یہ حصہ نہایت پُر فضا، سڑکیں بالکل یورپ کی سی۔ مکانات بڑے عالی شان، بڑے ڈبل ڈبل ہوٹل دکانیں یورپ کی دکانوں سے مقابلہ کرنے والی۔ دکان دار اکثر غیر ملکی۔ مگر ان نو آبادیوں کو دیکھ کر چینیوں نے بھی اس کے متصل ایک نیا شہر آباد کیا ہے وہ اس سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ یہاں جاپانی دکاندار بہت موجود ہیں جو ہر طرح یورپین تاجروں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ بازاروں کی سیر کے بعد گائڈ صاحب نے

فرمایا کہ یہاں گرلس ہاؤسس بھی اچھے اچھے ہیں۔ ہم نے بھی سمجھا۔ ع

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اور کہا بہتر دکھائیے۔ یہ ہم کو ہدایت کرکے وہاں تک لے گئے یہاں چینی حوریں دیکھیں جو واقعی بہت خوبصورت اور قابل قدر خوبصورت کہ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے ان کے چھ چھ پانچ کے سر بھی برے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ خیر چند ایسے مکانوں کی سیر کرکے پیر مغاں صاحب ہم کو ایک ایسے "چائے خانہ" میں لے پہنچے جس کی یہاں کے بڑے بڑے لوگ سرپرستی کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا سہ منزلہ مکان ہے۔ صاف، ستھرا۔ میزیں عمدہ، نوکر پاکیزہ۔ ہر قسم کے نقل اور پینے کی چیزیں مل سکتی ہیں۔ علاوہ اس کے شام کے قریب یہاں سینکڑوں پری جمالوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ باوجودیکہ ایک پیالی چاء اور نقل کا یہاں ایک ڈالر دینا پڑتا ہے مگر وہ کتنے ہی ایسے ڈالر نکال لیتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ بغرض تفریح یہاں آتے ہیں اور چلتے ہوئے اگر جی چاہا تو کسی کو گاڑی میں بٹھا ساتھ لے گئے۔ بندہ نے بھی یہ سمجھا کہ من عاشر القوم فھو منھم۔ چلتے ہوئے ایک حور کو گاڑی میں لے آیا۔ ایک ہوٹل میں پہونچے۔ جو خاص ہوٹلوں میں سے ہے۔ اور یہاں چند گھنٹے دنیا کا غم غلط کیا۔ اب ڈنر کا وقت تھا ان کو لئے ہوئے ایک فرسٹ کلاس رسٹورینٹ میں پہونچے۔ کھانا کھا کر ایک چینی تھیٹر دیکھنے گئے۔ چینی تھیٹر سے خدا کی پناہ۔ بیسیوں ڈھول، گھنٹے پر اکتفا نہ کرکے ڈنڈی بھی بجاتے ہیں۔ اور گانا تو معلوم ہوتا ہے کہ نہایت دردناک دھاڑیں مار مار کر منہ بنا بنا کر روتے ہیں اور کم بخت نازک نفیس نفیس صورتوں کو بھتنوں کا سوانگ بھرا کر سارے سین کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ خدا جانے ان کو اس میں کیا لطف آتا ہے۔ آدھے گھنٹہ سے زیادہ نہیں بیٹھا گیا اور بھاگے ہماری ساتھی اسٹیم لانچ تک پہونچانے آئیں اور وہاں سے اُنھیں خدا حافظ کہہ کے ہم اپنے اسٹیمر پر پہونچے۔

شنگھائی میں دو دن ٹھیر کر ہمارا اسٹیمر ناگاساکا کے لئے روانہ ہوا۔ اگلے دن ناگاساکا پہونچے یہ جاپان کا پہلا بندر ہے۔ یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ یہاں کی خدائی ہی نرالی ہے۔ بندر میں داخل ہونے سو پہلے ہزاروں کشتیاں ملیں۔ بیرونی بندر میں جہاز نے لنگر کیا۔ تین جاپانی ڈاکٹر صاحب آئے یعملہ جہاز اور مسافروں کا معائنہ ہوا۔ اس کے بعد جہاز کو اندرونی بندر میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ جاپانی پائلٹ نے جہاز کی کمان لی اور جہاز کو اندرونی ہاربر میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ یہاں کتنی ہی اسٹیم لانچیں جو ہوٹلوں کی ہیں آ پہونچیں۔ اور ہوٹلوں کے ایجنٹ اپنے اپنے کارڈ تقسیم کرکرکے لوگوں کو اپنی اپنی طرف مائل کرنے لگے۔ انگریزی۔ جرمنی۔ فرنچ فراٹے کے ساتھ بولتے ہیں۔ چونکہ ہم نے ٹکٹ یکوہامہ تک کے لے رکھے تھے۔ ہوٹل میں ٹھیرنے کی تو ہم کو ضرورت نہ تھی۔ مگر شہر کی سیر کے

لئے ایک گائڈ لیا اور سب اُترے اور سارے شہر کی سیر کی۔ عجیب لطف آیا۔ سارا شہر یورپین اسٹائل کا صاف ستھرا۔ دکانیں نہایت آراستہ۔ چیزیں نہایت سلیقہ سے رکھی ہوئی۔ لوگ بہت صاف اور پاکیزہ مگر یوروپین نہیں۔ بلکہ ایشیائی۔

خدا کی خدائی یاد آتی تھی اور کہتے تھے کہ خدایا کبھی ہم لوگوں کی بھی یہ حالت ہوگی۔ مگر جواب ملا کہ "ہنوز دلی دور است"۔ پہلا تاثر جاپانیوں کا بہت اچھا ہوا۔ اور آخر تک وہ قوی ہوتا گیا۔ یہاں شب کو تھیٹر دیکھا۔ اسٹیج کے سین بدلنے کے لئے پردے گرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک سین ختم ہوا اور اسٹیج گھوم گیا۔ دوسرا سین جو پہلے سے تیار رہتا سامنے آگیا۔ "ناگاساکے" کی اچھی طرح سیر کرکے اسٹیمر پر واپس گئے۔ اگلے دن اسٹیمر یہاں سے چل کر "کوبے" پہنچا۔ یہ "ناگاساکے" سے بہت بڑا پورٹ ہے، یہاں بھی ایک گائڈ لیا اور "میکاڈو ہسٹل" پہنچے۔ یہ ایک جاپانی ہوٹل ہے۔ مگر عمدہ سے عمدہ انگریزی ہوٹل کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہاں دو روز تک سیر کی۔ یہاں سے چل کر "یکوہامہ" پہونچے۔

یہ سب سے زیادہ اہم جاپانی "بندر" ہے اور پائے تخت "ٹوکیو" سے صرف ۴۵ منٹ کا راستہ ہے اور سچ پوچھئے تو یوں کہئے کہ "ٹوکیو" کا شہر ہے۔ "یکوہامہ" اور "ٹوکیو" کے درمیان ۱۸ میل کی مسافت ہے۔ مگر مسلسل آبادی چلی گئی ہے۔ آدھے آدھے گھنٹہ میں ٹرین اور الکٹرک ٹریم روانہ ہوتے ہیں۔ اور ہزاروں آدمی برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ "یکوہامہ" کی آبادی تین لاکھ سے کچھ اوپر ہے اور "ٹوکیو" کی ۱۸ لاکھ سے کچھ اوپر۔ مگر "ٹوکیو" وسعت میں کلکتہ سے چھ گنا ہوگا۔ ایک ایک بازار گھنٹوں کی مسافت۔ یہاں سے جاپانیوں کی بہشت یا کشمیر کہئے جس کا نام "نکو" ہے گئے۔ اس کے بعد کئی اور شہر دیکھے۔ غرض کہ پورا ایک مہینہ جاپان میں بسر کیا اور خوب دیکھا۔ یہاں کے حالات تفصیلاً بیان کرنے کے لئے تو ایک کتاب چاہیئے مگر مختصراً لکھنے کے لئے میں اس کے حالات کو مختلف ہیڈنگس میں تقسیم کرتا ہوں۔ اور جو کچھ میں نے سمجھا اور دیکھا وہ پیش کرتا ہوں۔

۱۔ زمین سارے کا سارا "جاپان" پہاڑوں اور وادیوں سے بنا ہوا ہے۔ پہاڑ بہت بلند نہیں مگر دو تین ہزار فٹ بلندی کے اکثر۔ سب سے اونچا پہاڑ فیوجی ہے اس کی بلندی بارہ ہزار فیٹ ہے۔ پانی کی یہ کیفیت ہے تجری تحتہا الانھر گویا "جاپان" کی شان میں ہے۔ سارے ملک میں کوئی جگہ غیر شاداب نہیں دیکھی اور شاداب سے منشا۔ ایسی شادابی ہے جیسے برسات کے زمانہ میں "دہرہ دون" وغیرہ میں آپ نے دیکھی ہوگی۔ سارے ملک میں ایک چپہ زمین غیر مزروع نہیں اور زراعت بھی نہایت سائنٹفک اصول پر۔ غلوں میں چاول سب سے زیادہ۔ مکئی بھی دیکھی اور بھٹے کھائے۔

جوار بھی دیکھی۔ گیہوں۔ جو۔ جئی۔ ساتواں۔ کودوں۔ مٹر۔ سیم۔ لوبیا مختلف قسم کا اور چند قسم کی پھلیاں جو ہندوستان میں نہیں دیکھیں یہاں ہوتی ہیں۔ ترکاری ہر قسم کی اور پھلوں میں انگور زیادہ اچھا نہیں، سیب عمدہ، ناشپاتی نہایت عمدہ، شفتالو نہایت عمدہ۔ زردآلو۔ آلو بخارا۔ انار سب موجود ہیں۔ کیلہ یہاں نہیں ہوتا۔ مگر "فارموس" سے آتا ہے۔ لیچی اور اور جیسے "فروٹس" "چین" سے آتے ہیں۔ روئی بہت کم ہاں شہتوت بہت۔ اور ریشم کی بہت کثرت۔ چیڑ۔ دیار وغیرہ کے درخت بہت کثرت سے اور لکڑی کی افراط۔ بانس بہت۔ پہاڑوں کی سبزی ہندوستان کے پہاڑوں کی سی۔ صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں پہاڑوں میں پھول کم ہیں اور پھل دار درخت خودرو تقریباً ندارد۔ چیری یہاں کے نیشنل درختوں میں سمجھا جاتا ہے۔ اور جب چیری پھول لاتا ہے تو گویا یہاں عام "عید" ہوتی ہے۔ دریا بہت مگر بہت بڑے نہیں۔ گومتی جیسے اور اُس سے کچھ بڑے۔ اور کچھ چھوٹے۔ شمالی حصہ میں بہت سے آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں۔

۲۔ آب وہوا معتدل۔ آج کل سوا بلند پہاڑیوں اور شمالی حصہ کے اکثر جگہ گرمی ہے اور بعض جگہ تو اچھی خاصی ہندوستان کی سی گرمی۔ ان مقامات میں ٹمپریچر تقریباً ۹۰ درجہ فارن ہائٹ ہوتا ہے مگر شب کو مکانوں کے اندر کھڑکیاں کھول کر بے تکلف سو سکتے ہیں۔ دھوپ خوب گرم ہوتی ہے اور بے چھاتے کے کام نہیں چلتا۔ بارش بہت ہوتی ہے۔ سردی کے زمانہ میں شمالی حصہ میں بہت زیادہ مگر جنوبی حصہ میں بھی برف پڑتا ہے۔ اور کئی مہینے یہ کیفیت رہتی ہے۔ اکثر طوفان بھی آتے ہیں۔

۳۔ آدمی پست اور میانہ قد۔ منگولین ٹائپ مگر بدصورت نہیں۔ اور عورتوں میں ہم لوگوں کی خوبصورتی کے معیار کے موافق تقریباً سو میں دس خوبصورت۔ اور پندرہ ۱۵ سے بیس ۲۰ فیصدی متوسط باقی گرے ہوئے۔ رنگ گورا۔

۴۔ وضع عورت، مرد سب ایک قسم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ ڈھیلے چوغے خاص وضع کے اور کمر بندھی ہوئی اور پیروں میں کھڑاؤں۔ اور بہت اونچے کھڑاؤں بعض بعض چار انچ اونچے اور کھڑاؤں پہن کر اس بے تکلفی سے دوڑتے پھرتے ہیں جیسے ہم لوگ ننگے پاؤں یا بوٹ یا جوتے پہن کر کپڑے نہایت سادے رنگوں کے پہنتے ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ عورتیں زیور بالکل نہیں پہنتیں، ساری آرائش اُن کے بالوں میں ہے۔ بال نہایت صاف رکھے جاتے ہیں۔ اور باندھے جاتے ہیں اور خاص طرح کے سر پر۔ گویا ایک تاج معلوم ہوتا ہے اور اکثر بالوں میں خوشبودار تیل لگاتی ہیں اور پھول بھی رکھتی ہیں۔ کمر پر جو پٹکا باندھا جاتا ہے وہ پشت کی طرف خاص طور پر ٹائی کی طرح ایک بڑے

ٹاٹ میں باندھا جاتا ہے مگر بعض لڑکیاں بیس۲۰ بائیس۲۲ برس کی عمر تک کی ایک گون کی صورت کی چیز۔ جُبہ کے اوپر پہن لیتی ہیں اور بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ مرد اکثر یوروپین کپڑے پہننے لگے ہیں اور ہیٹ تو سب پہنتے ہیں۔ اعلیٰ سے ادنیٰ تک۔ بقول ڈاکٹر دل جنگ سنگھ اس ملک میں تہذیب تیر کی طرف سے شروع ہوئی ہے اور ہمارے ہندوستان میں پیر کی طرف سے۔ مگر مرد جو کوٹ پتلون پہنتے ہیں گھروں میں وہ بھی اپنے دیسی لباس کو پسند کرتے ہیں۔ موزے ایک خاص قسم کے کپڑے کے بنائے جاتے ہیں جن میں انگوٹھا الگ رہتا ہے۔ سب پہنتے ہیں ادنیٰ اور اعلیٰ۔ مزدور اور قلی بھی بے موزے پہنے نہیں دیکھئے گا۔

پنکھے کا بہت استعمال ہے تقریباً ہر ایک کے ہاتھ میں گرمیوں میں پنکھا رہتا ہے۔ چھاتے دھوپ کے لئے اکثر یورپین وضع کے اور بارش کے لئے اپنی وضع کے جیسے برہما والے بھی استعمال کرتے ہیں مگر یہاں اکثر واٹر پروف کاغذ کے بناتے ہیں۔ مردوں میں جو کوٹ پتلون پہنتے ہیں بوٹ کا استعمال بھی زیادہ ہے مگر گھروں میں وہی اپنے موزے اور کھڑاؤں اور عورتیں بھی جو کالجوں اور اسکولوں میں جاتی ہیں بوٹ پہننے لگی ہیں۔ ہاں مرد جو اپنی دیسی وضع میں رہتے ہیں وہ بجائے پائجامہ کے ایک نہایت چھوٹا سا جانگیہ یا لنگوٹ پہنتے ہیں اس کے اوپر ایک سفید جُبہ اس کے اوپر ایک سیاہ جُبہ اور کمربند۔ اور عورتیں اکثر ایک سُرخ تہ بند باندھتی ہیں اس کے اوپر دو جُبے۔ اور کمربند۔ یا ایک جبہ اور ایک گون (جاپانی) لوگ نہایت خلیق اور باادب۔ خلق اور ادب گویا اُن کی فطرت ثانیہ ہوگئے ہیں۔ تواضع تکریم لکھنؤ والوں کی اُن کے سامنے ہیچ ہے یہاں نماز کے سارے ارکان معمولی تواضع میں ختم ہوجاتے ہیں۔ نہایت معمولی سلام رکوع کی حالت میں ہو کر کیا جاتا ہے۔ (سوا فوجی سلام کے) اور ہاتھ باندھ کر۔ اگر اس سے بڑھ کر تعظیم کی تو قعود کی حالت میں ہو کر آدھے سجدہ کی حالت پیدا کر لی اور اور بڑھے تو بالکل سجدہ کر لیا۔ اور ہاتھ پیشانی کے نیچے رکھ لئے۔ اور یہ عام طور پر تواضع کی رسم ہے۔ کوئی عورت یا مرد ایک دوسرے کو بے تعظیم دیئے ہوئے ملاقات نہیں کرتا۔

۵۔ عادات

سوا ایک علت کے کہ پاخانہ پھر کر آب دست نہیں لیتے اور کاغذ کی صفائی پر اکتفا کرتے ہیں۔ مگر باہر نکل کر ہاتھ ضرور دھو لیتے ہیں۔ پیشاب کرنے کے بعد بھی یہی حالت ہے اور ہر طرح سے نہایت صاف۔ روز غسل کرتے ہیں۔ اور بہت مل دل کر۔ ہر ایک برش سے درست ہوتا ہے اور دن میں کئی مرتبہ رومال بھگو کر منہ اور گردن صاف کرتا ہے۔ کھانا چینیوں کی طرح ۲ دو لکڑیوں سے کھاتے ہیں۔ کھانا ان کا اکثر بسیندا ہوتا ہے۔ اور کچا۔ کچی مچھلی نہایت ذائقہ سے کھائی جاتی ہے۔

صرف سر کہیں جھکو کر۔ مکانات دو منزلے سے زیادہ بلند بہت کم ہوتے ہیں اور فرنیچر بہت کم اور صاف انتہا سے زیادہ۔ مکانوں میں باریک گھاس کے بُنے ہوئے چٹائی کے گدیلے بچھے ہوتے ہیں اور بہت ہلکے کاغذ منڈھے ہوئے فریموں کے پارٹیشن ہوتے ہیں جو اوپر نیچے کے خانوں میں اِدھر اُدھر کھسک سکتے ہیں۔ جب چاہا اِس طرح دو کمروں کو ایک کر لیا۔ اور جب چاہا دو۔ بلکہ یوں کہئے کہ اکثر مکانوں میں سارا گھر ایک کمرہ بھی بن سکتا ہے اور متعدد کمرے بھی۔ سبزہ اور پھول کے عاشق ہیں۔ کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جس میں چند گملے جن میں چھوٹے چھوٹے خوشنما پودے نہ رکھے ہوں اور ہر دوسرے تیسرے دن گلدستے نہ بدلے جاتے ہوں۔ سبز چائے خاص قسم کی جو جاپان میں بوئی جاتی ہے نہایت ہلکے چھوٹے چھوٹے پیالوں میں بے دودھ اور شکر کی بہت استعمال ہوتی ہے۔ کسی کے گھر جائیے تو تواضع یہ ہوگی۔ سب سے پہلے آپ کے داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا خاص قسم کا ٹرے لاکر رکھا جائے گا اس میں ایک چھوٹے سے چینی کے برتن میں انگارے راکھ میں دبے ہوئے نہایت نفاست سے رکھتے ہیں اور ایک چھوٹی سی موٹی بانس کی پور جو ایک طرف سے بند اور ایک طرف سے کھلی ہوتی ہے رکھی ہوگی۔ آگ آپ کے سگرٹ یا پائپ سلگانے کے لئے اور دوسری چیز اُس کی راکھ جھاڑنے کے لئے یا تھوکنے کو۔ سگرٹ آپ اپنے سمجھئے گھر سے نہیں ملیں گے۔ اس کے بعد فوراً چاء آئے گی اور اُس کے ساتھ ہی ایک رکابی میں کسی قسم کا چاول کا بنا ہوا یہاں کا کیک کم سے کم ایک کیک جو بسکٹ کے برابر ہوگا آپ کو کھانا ہوگا اور چائے کی بھی پیالیاں پینا ہوں گی۔ بعض جگہ جہاں آپ کی زیادہ خاطر منظور ہے وہاں آپ کو کسی قسم کا موسمی فروٹ بھی ملے گا اور صاحب خانہ خود چھیل کر اور کاٹ کر آپ کو دے گا۔ یہاں چونکہ پردے کو کوئی نہیں جانتا اس لئے عورتیں برابر ملاقاتوں میں حاضر رہتی ہیں اور اکثر خاطر تواضع میں وہی زیادہ حصہ لیتی ہیں۔ بعض بعض عادات یورپ والوں سے ملتی ہوئی ہیں۔

مثلاً بندہ ایک مس صاحبہ سے ملنے کو گیا جو "ٹوکیو یونیورسٹی کی گریجوئٹ ہیں اور ایک اخبار کی اڈیٹر بھی۔ بے تکلف یورپین لیڈیز کی طرح وہ ملیں اور خاطر تواضع میں سرگرم رہیں اور اُن کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ دوسرے کمرہ میں بیٹھے رہے جب تک مس صاحبہ نے خود اپنی والدہ کو بلا کر تعارف نہیں کیا وہ کمرے میں نہیں آئیں۔ شرم وحیا بہت کم ہے۔ اب تک دیہاتوں میں اور قصبوں میں مرد عورت سب ایک جگہ بالکل برہنہ ہو کر نہاتے ہیں اور کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اب یورپین اور اور اجانب سے خلط ملط ہونے سے اس بات کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ اور شہروں میں یہ چیز بالکل نہیں نظر آتی۔ عورتوں سے اس قسم کی باتیں جو یورپ والے بھی روا نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک کنواری لڑکی سے (یہ نہیں کہ

وہ بد چلن ہو بلکہ اچھے سے اچھے گھرانے کی) اس قسم کی بات کرنا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے یا نہیں، اور نہیں تو کیوں اب تک شادی نہیں کی۔ اور اب شادی کرو گی اور کیسے شخص سے کرو گی اور علیٰ ہٰذا لقیاس کوئی عیب نہیں۔ اور لڑکی بھی آپ کو جواب دینے میں نہیں جھجھکے گی۔ شادی کی یہ حالت ہے کہ ۱۹ برس تک کی لڑکی اپنے والدین کی اجازت سے شادی کرتی ہے۔ مگر اپنی پسند سے۔ اور اس کے بعد اُس کو اختیار ہے۔ قانوناً اُس کو کوئی روک سکتا۔ جس سے چاہے وہ شادی کر سکتی ہے۔ اور شادی کے کوئی مذہبی رسم و قواعد نہیں۔ رجسٹریشن آفس میں جا کر میاں بیوی رجسٹر کرا آئے۔ فرصت شد۔ چونکہ ذات پات چھوت چھات کا یہاں کوئی جھگڑا نہیں اس لئے ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی یا اور کسی قوم اور مذہب والے سے یہاں والیوں کو شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ عارضی شادیاں بھی اکثر ہوتی ہیں۔ کیونکہ طلاق بھی بہت آسان ہے جب دونوں راضی ہوئے جا کر رجسٹریشن کورٹ میں لکھوا دیا کہ آج سے ہم نے اپنے تعلقات قطع کئے۔ فرصت شد۔

۶۔ ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ معلوم ہوتا ہے کہ سارے باشندے ایک خاندان کے ممبر ہیں اور میکاڈو اس خاندان کا ہیڈ ہے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کا سا برتاؤ۔ بات چیت نہایت مؤدبانہ اور ہنس ہنس کر۔ ایک مہینہ جاپان میں رہا۔ مگر لڑکوں تک کو آپس میں جھگڑتے یا زور سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ پھر کہئے تو سہی رُوس یا اور کوئی اُن کو کس طرح نیچا دکھا سکتا ہے۔ مجھے تو بالکل شہد کی مکھیوں کی سی حالت ان کی معلوم ہوتی ہے۔ گورنمنٹ اس قدر وطن دوست کہ ظاہر ہے پچاس برس میں یہاں والوں نے کیا کر دکھایا۔ کوبے میں ایک "ڈوک" دیکھنے گیا۔ میلوں میں یہ کارخانہ ہے چار جہاز اِس وقت اُس میں بن رہے تھے۔ ایک جاپانی کروزر، چھ ہزار ٹن کا، دو چینی گن بوٹ اور ایک سات ہزار ٹن کا پسنجر اسٹیمر۔ منیجر مجھ سے اس طرح ملا کہ گویا وہ میرے سامنے ایک نہایت حقیر شخص تھا مگر سمجھئے تو سہی میری اُس کے مقابلے میں حقیقت ہی کیا تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ پنتالیس ہزار آدمی روزانہ کام کرتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کس قدر لوہے اور فولاد کا خرچ ہوگا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ سارا "میٹیریل" جاپانی ہے اس لئے کمپنی کا ایک دوسری جگہ "اسٹیل ورک" ہے۔ وہاں سے ہر قسم کی چیزیں ڈھل کر اور پریس ہو کر یہاں آتی ہیں اور یہاں تعمیر جہازوں میں کام آتی ہیں۔ آدمی تو ہم لوگ بھی ویسے ہی ہیں جیسے جاپانی مگر اتفاق کہاں سے لائیں۔ اور اپنی گورنمنٹ کیسے پیدا کریں۔ واقعی ؎

دو دل یک شود بشکند کوہ را
پراگندگی آرد انبوہ را

اور جہاں وہ مل کر ایک دل ہوں تو نتیجہ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ جیسا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔
جاپان آتے ہوئے جرمن جہاز پر کئی ایک انگریز بھی تھے۔ ایک دن کچھ نہایت پُر فضا سینری کا ڈاکٹر
ول جنگ خاکہ کھینچ رہے تھے کہ ایک انگریز نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو کہیں کسی جاپانی نے دیکھ لیا تو
پکڑے جاؤ گے۔ یہاں نقشہ کھینچنے اور فوٹو لینے کی سخت ممانعت ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ میں ایک
دفعہ سخت مخمصہ میں پڑ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے اپنی "ڈرائنگ بک" بند کر کے رکھ دی۔ اُس کے بعد یہ بھی کہا کہ
جاپانی "کسٹم ہوس" والے مسافروں کی چیزوں کو نہایت سختی سے دیکھتے ہیں اور ساری چیزیں تہ و بالا
کر دیتے ہیں اور باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ گیا کہ ابھی جاپانی تہذیب قریب ہے یہ لوگ یورپ کی نقل کرتے
ہیں مگر بے سمجھے بوجھے۔ اوّل تجربہ تو "یکوہامہ" میں ہوا "کسٹم ہاؤس" والے اس قدر شائستہ ہیں کہ
میں نے کسی یورپ کے ملک میں نہیں دیکھے۔ ہمارے پاس چار بکس سگریٹ کے تھے اور سگریٹ چونکہ
گورنمنٹ "مونوپلی" ہے اس لئے کوئی اس کو یہاں سوا گورنمنٹ کے نہیں لا سکتا۔ مگر یہ اجازت ہے کہ
ایک آدمی ایک کھلا ہوا بکس اپنے استعمال کے لئے داخل کر سکتا ہے۔ "کسٹم" والے نے خود کہا کہ آپ لوگ
چار آدمی ہیں اس لئے آپ لے جا سکتے ہیں۔ باوجودیکہ دو عورتیں تھیں۔ ہمارے ساتھ کسی یورپین ملک
میں ہرگز اس کا خیال نہ ہوتا۔ اٹلی میں۔ فرانس میں۔ ٹرکی میں ایک سگار تو داخل کر نہیں سکتے۔ اس جدید
تہذیب یافتہ قوم کی کیفیت ایسے ایسے کارخانوں کی موجودگی سے آپ سمجھ سکتے ہیں جیسا اوپر میں لکھ
چکا ہوں۔ "ٹوکیو" کے ایّام قیام میں میں کاؤنٹ اکوما سے ملا جو موجودہ جاپان کے بنانے والوں میں
سے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے۔ وزارت تعلیم۔ وزارت خارجہ اور اس قسم کے بہت سے اعلےٰ عہدوں پر رہ چکا
ہے۔ تقریباً دو گھنٹے باتیں ہوئیں۔ میں کیا کہوں آپ سے اس قدر خلیق آدمی کم ہوتے ہیں۔ اور اُس کی
معلومات کی حالت سے میں دنگ تھا۔ ہندوستان کی بابت بہت سی باتیں رہیں۔ کہنے لگا یہ ہندوستان
میں آج کل کیا اُودھم مچی ہوئی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے، آپ نے ایشیا
والوں کی آنکھیں کھول دیں۔! کہنے لگا مگر شور و غل سے کام نہیں چلا کرتا۔ کہنے لگا دو چیزیں ہندوستانی
پیدا کر لیں پھر نہ لاٹھی کی ان کو ضرورت ہے نہ ڈنڈے کی۔ انگریز خود بخود چلتے پھرتے نظر آئیں گے اور
وہ دونوں تعلیم اور اتفاق ہیں۔ کہنے لگا نہایت افسوس کا مقام ہے کہ وہ ملک جو آبادی اور
زرخیزی کے لحاظ سے ساری دُنیا میں درجۂ اوّل کی طاقت ہونے کا مستحق ہے ایسی حالت میں ہو یہاں
ایک بات جاپانیوں میں اور عجیب ہے وہ یہ کہ یہ لوگ اس قدر آپس میں رازدار ہیں کہ جس کی دُنیا میں
مثال نہیں۔ آپ اِس مُلک میں عمر بھر رہئے اور سینکڑوں جانی دوست پیدا کر لیجئے مگر کیا مجال آپ کو

ان باتوں کی خبر بھی ہو جو "قومی راز" ہیں۔ سارے جاپان میں آپ پھریئے آپ کو ایک فوجی وسپاہی نہیں نظر آئے گا۔ نہ ایک جنگی جہاز۔ ایسی ایسی جگہ فوجیں رکھتے ہیں جہاں غیر ملکیوں کا گزر ہی نہیں اور جہاز بھی ایسے بندروں میں۔ مجھے خیال ہوا کہ جس قدر بنگالی بیچنے چلانے والے ہیں، اُتنے ہی یہ خاموش اور کارکن۔ ایڈمرل الکرف جو منچوریا کا گورنر جنرل تھا اور جو باعث جنگ ہوا۔ ۲۱ برس "ٹوکیو" میں روس کا سفیر رہ چکا تھا مگر کم بخت کو ذرہ بھر خبر نہ تھی کہ جاپان کیا کر رہا ہے اور اُس کی فوجی اور بحری تیاری کیا ہے۔ اگر اُس کو پہلے سے یہ کیفیت معلوم ہوتی تو کیا کُتے نے اُسے کاٹا تھا کہ بھڑ کے چھتہ کو ہاتھ لگاتا۔

یہاں کی جیل میں گیا یورپ کی جیلوں سے اچھے۔ قیدیوں کے لئے ستھریاں ہیں کے جیل میں دیکھیں، اور چونکہ جوتہ پہن کر کوئی کسی مکان میں داخل نہیں ہوتا، اس لئے صفائی میں تو کوئی جاپانی مکانوں کو مات کر ہی نہیں سکتا۔ سینکڑوں عمدہ عمدہ قیدیوں کی بنائی ہوئی بائیسکلیں دیکھیں اور بالکل ہاتھ سے بناتے ہیں مشین کا نام نہیں۔ چھاتے نہایت عمدہ ان کی تیلیاں بیچ کے لوہے کے سینخ اور ہینڈل سب ہاتھ سے اور معمولی ہاتھ کے پریس سے اس قدر جلدی بناتے ہیں کہ دیکھنا ایک تماشہ ہے۔ لکڑی کے چھلکے جو رندے میں نکلتے ہیں اُن کے پتلے فیتے بنتے ہیں جیسے یورپ والے گھاس کے بناتے ہیں۔ یہیں دیکھا کہ جو جیل دیکھنے جائے اُس کو جب تک وہ ویٹنگ روم میں بیٹھے پینے کو چائے اور سگرٹ بھی ملے۔ لوگ یہاں کے کسی حالت میں ہوں خوش۔ کسی کو اس طرح تباہ اور غمزدہ حالت میں نہیں دیکھا جیسا اَور ملکوں میں عام طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ بھیک مانگنے والے شاذ و نادر کہیں دیہات میں نظر آجاتے ہیں۔ شہر میں کہیں نہیں۔

ہاسپٹل یہاں کے دیکھے یورپ کے ہاسپٹل سے اچھے۔ لاوارث بچوں کے پرورش کے مکانات ایسے ایسے جیسے آپ کے علی گڑھ کالج کا کمپونڈ اور مکانات۔ ملک چھوٹا، لوگ چھوٹے مگر کام بہت بڑے۔ بڑے بڑے شہروں میں رنڈیاں ایک جگہ بلکہ ایک کمپاؤنڈ میں رکھی جاتی ہیں مگر یہ کمپاؤنڈ ایسا نہ سمجھئے جیسا ہندوستان میں گو۔وں کی چھاؤنیوں میں ہوا کرتا ہے۔ ہر ایک ایسے کمپونڈ میں سینکڑوں بڑی بڑی عالی شان عمارتیں ہوتی ہیں۔ بڑی چوڑی چوڑی سڑکیں۔ عمدہ عمدہ دکانیں۔ ہر قسم کی خورد نوش کی چیزیں مہیا اور وہاں ہزاروں پریاں۔ "ٹوکیو" میں ایسے پانچ کمپونڈ ہیں اور ہر کمپونڈ میں تقریباً پانچ ہزار پریزاد رہتے ہیں۔ یہ کمپونڈ ہمیشہ شہر کے کناروں پر ہوتے ہیں۔ ان جگہوں کی حالت شب کو دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ پریاں گھر سے نہیں نکلتیں۔ خریدار گھر گھر پھرتے ہیں۔ رنڈی کی خرچی اور اُس کے گھر میں خلط

تواضع کے بل ہوٹلوں میں آتے ہوئے ہم نے جاپان ہی میں دیکھا۔ جہاں جی چاہے جائیے۔ جو جی چاہے کھائیے۔ پیجئے۔ رات بسر کیجئے۔ اپنا کارڈ اور ہوٹل کا پتہ دے کر چلے آئیے۔ بل دوسرے دن آپ کے پاس آجائے گا۔ اور آپ نہ ملے تو ہوٹل والا ادا کر کے آپ کے اکاؤنٹ میں رکھ دے گا۔ واللہ ترقی ہو تو یہاں تک ورنہ ہیچ۔ پیرس کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی اور خوش معاملگی اور اعتبار کا درجہ خیال کرنے کے قابل ہے۔

یہاں کے کارخانوں میں گیا۔ دست کاری میں دنیا میں کوئی فیشن ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ کو سخت تعجب ہوگا میں نے لکڑی کی ایک طشتری خریدی ہے جو چار انچ لمبی چوڑی ہے اور وزن میں ایک تولہ سے یقینی کم ہے مگر قیمت ۳۰ روپیہ۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح اس پر محنت کی گئی ہوگی۔ سنہری نقاشی اور وارنش کے کام کی یہ طشتری ہے جس کو انگریزی میں "لیکوس ورک" کہتے ہیں۔ صفت اس کی یہ ہے سینکڑوں برس کے استعمال سے اس کا رنگ نہیں بدلتا۔ اور کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیجئے تب بھی کوئی اثر نہیں۔ یورپ والوں نے سر ٹکرا مارا مگر یہ بات نہیں حاصل ہوئی۔ ڈرائنگ روم کا ایک کیبنٹ دیکھا اسی کام کا جس کی قیمت پینتالیس ہزار روپیہ ہے۔ چینی کے ویس دیکھے معمولی تو ہزاروں آپ نے دیکھے ہوں گے۔ رسٹ سوا اور سلین مشہور ہے اُس کا ویس تیس انچ اونچا اور بارہ سو روپیہ قیمت۔ سگرٹ کیس لوہے پر کوفت کے کام کا ایک سو سے پانچ سو روپے تک کا۔

مینا کاری ایک ہندوستان میں ہوتی ہے۔ خدا کی مار۔ یہاں کی مینا کاری دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ میرا گائڈ مجھے "براس فیکٹری" دکھانے کو لے گیا۔ میں سمجھا ایسی ہوگی جیسے مُرادآباد میں برتن بنتے ہیں۔ یا جے پور میں برتن وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ فیکٹری میں جا کر معلوم ہوا کہ جاپان کی دُنیا ہی نرالی ہے چھوٹی سی چھوٹی چیز مثلاً سگرٹ کیس یا کارڈ کیس کے تیس، چالیس روپیہ دام۔ اور خوشی سے دینے کو جی چاہے۔ نقاشی تو جاپان پر ختم ہے۔ ریشم پر سوئی سے ایسا کام بنانا انھیں کا کام ہے۔ آپ اگر دیکھئے تو یہ معلوم ہو کہ زندہ جانور یا پرند بیٹھا ہے یا اُڑ رہا ہے۔ مخملی تصویریں جن کا کوئی نمونہ رفتہ رفتہ شاید آپ تک بھی پہونچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصور نے قلم سے کھینچی ہے۔

الحاصل جاپان نے مجھے تو بالکل شیفتہ کر لیا اور ایک جاپانی لیڈی سے خط و کتابت بھی شروع ہے کیا عجب ہے کہ کسی دن ایک مکان جاپان میں ہو اور وہاں یہ بندہ اپنی جاپانی سواری کو لئے ہوئے بڑھاپے کے دن گزار رہا ہو۔ جاپان کے راگ کہاں تک گاؤں۔ بہت ہوا۔ ڈاکٹر دل جنگ سے ۸ اگست کو میں رخصت ہوا۔ اِن کو "کوبے" میں چھوڑ کر میں "ٹوکیو" "یکوہامہ" "اوساکہ" وغیرہ پھرتا رہا۔ وہ مع

اپنے فیملی کے یکم ستمبر کو جرمن میل میں سوار ہو کر "سیلون" گئے اور وہاں سے "جے پور" بخیریت پہنچیں گے، اور شاید کبھی زبانی جاپان کی کیفیت آپ کو سنائیں۔ اور بندہ تنہائی سے گھبرا کر "سروگا" پہنچا۔ جہاں روسی جہاز "ولاڈی واسٹک" جاتا ہے اور ۷ ستمبر کی شام کو سوار جہاز ہو کر روانہ ہوا۔ اس وقت طوفان کا سگنل اڑ رہا تھا اور جہاز والے کہہ رہے تھے کہ خدا خیر کرے۔ مگر میل کا جہاز رک نہیں سکتا۔ جہاز نے اپنے وقت پر لنگر اُٹھایا۔ اور چلدیا۔ رات تو خیر اچھی گزری۔ مگر صبح سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جہاز سمندر میں ایک تنکا ہے کہ جس کو ہوا اور پانی بچوں کے کھیل کی طرح بجا رہے ہیں اور تماشا دیکھتے ہیں۔ سارے کیبنوں میں دو دو فٹ پانی۔ بستر ے، کپڑے شرابور، پکڑنے کے لئے بنکس میں رسیاں باندھ دی گئی تھیں۔ جن کو پکڑ کر ہم لوگ اپنی اپنی جگہ چپٹے ہوئے پڑے تھے۔ اور موجوں کی بوچھار کھڑکیوں اور دروازوں کی درازوں میں سے منوں پانی ہر لحظہ اندر لاتی تھیں اور ہمارے سروں پر وار جاتی تھیں۔ اور ہم لوگ تھے کہ دم بخود بھیگی بلی کی طرح سمٹے پڑے تھے۔ کبھی یہ معلوم ہوا کہ جہاز بالکل پانی کے اندر غائب ہوا چاہتا ہے یا اپنی جگہ سے باوجود رسیاں پکڑنے کے کھسکنے لگے۔ تو خدا یاد آ گیا۔ اور کہہ اُٹھے "خدا خیر کرے۔"

"سروگا" سے "ولاڈی واسٹک" ۳۶ گھنٹہ کا راستہ ہے۔ مگر الحمد للہ ہم لوگ دو دن خوب طرح طوفان کھا کر اور کئی کشتیاں اور سیڑھیاں وغیرہ کھو کر اور سارے سامان کو ستیا ناس کر کے چوتھے دن بخیر و سلامت "ولاڈی واسٹک" پہونچے۔

اُسی دن اس ٹرین میں سوار ہو کر (۱۰ ستمبر، ۷ بجے شام کو) روانہ ہو گئے۔ آج پیر کا دن اور ۱۶ تاریخ ہے اور ہم ہیں کہ رات دن چلے جا رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو سنیچر کے روز "موسکو" پہونچیں گے (۲۱ ستمبر) "ولاڈی واسٹک" سے اُدھر جس قدر بڑھے ہیں سردی بڑھتی گئی۔" ولاڈی واسٹک میں ۷۵ ڈگری تھی، صبح کو تین دن سے برابر ۳۰ ڈگری ہوتی ہے۔ خدا کا ملک ہزاروں کوس بے آدم زاد پڑا ہے۔ ریل کی سڑک کے کنارے ذرا ذرا سی آبادی کہیں کہیں نظر آتی ہے اور وہ بھی اس قدر جیسے سمندر میں قطرہ، کیا زمین ہے۔ کیا درخت ہیں۔ کیا سبزہ ہے۔ مگر سوا اس کے کہ روس زبردستی گھیرے گھیرا ہے اور کچھ نہیں۔ کسی کا بھی نہیں۔ پرسوں شب کو ڈاکوؤں نے لگیج وان کی کھڑکی توڑ کر چاہا تھا کہ کچھ نکال لیجائیں۔ مگر اسٹیشن آ گیا اور حضرات تشریف لے گئے۔ صرف دو ہی تین بکسوں میں سے کچھ گیا۔ راستہ میں ٹرین ایک ریچھ اور ایک گائے کو شہید کر چکی ہے اور ابھی ایک کتے صاحب بھی تشریف لے گئے۔ یہاں کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ اور سگرٹ پر زور رہے ہے۔

ہم سمجھتے تھے ریل کا سفر گو لمبا ہی ہو جہاز کے سفر سے اچھا۔ مگر اب تو طبیعت تنگ آگئی۔ ہر ایک اپنے کمرہ میں ایک قیدی کی طرح جو جس تنہائی میں ہو، بند بیٹھا ہے۔ صرف کھانے کے وقت تو ڈائننگ کار میں سب جمع ہوتے ہیں۔ یا کہیں بڑا اسٹیشن آگیا تو اتر کر ذرا ٹہلے پھرے۔ ورنہ وہی "گوشۂ تنہائی"۔ گیارہ کو میں نے یہ خط شروع کیا تھا آج "سولہ" تو ہوگئی۔ دیکھئے کب ختم ہوتا ہے۔

کل شام کو ۵ بجے "ماسکو" پہونچ کر ہوٹل "برلن" میں مقیم ہوا۔ سردی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ "فریزنگ پوئنٹ" کے قریب ہے۔ اور بارش بھی کم کم ہوتی رہتی ہے۔ شہر بہت بڑا ہے۔ گرجے بکثرت۔ یہاں کا اُوپرا کل رات کو دیکھا دنیا میں اس کے مقابلہ کا اور نہیں ہے۔ اس وقت تو یہیں تک بس کرتا ہوں۔ والسلام۔

ہاں بندہ پندرہ اکتوبر تک غالباً جدہ پہونچ جائے۔ جواب کا وہاں منتظر رہوں گا۔

آپ کا

محمد حسین

۲۲ ستمبر ۱۹۰۷ء

تاریخی نوادر

ضیاء الملک جنرل محمود خاں

(از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی)

شاہ عالم نے تخت آبائی کو مرہٹوں اور انگریزوں کے ہاتھ سستے داموں فروخت کر کے ملتِ اسلامیہ پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ایک صدی کے اندر اندر وہ عظیم الشان سلطنت جس کی آبیاری شیر دل بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، اور عالمگیر نے اپنے خون سے سینچ کر کی تھی۔ مرہٹہ قسمت آزماؤں اور انگریز سوداگروں کے رحم و کرم پر جینے لگی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ نازک ترین دَور مسلمانانِ ہند کے لئے سخت ابتلاء اور آزمائش کا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر عین اُس وقت جنوبی ہند میں حیدر علی، ٹیپو سلطان اور شمالی ہند میں نواب علی محمد خاں، نواب نجیب الدولہ، حافظ الملک حافظ رحمت خاں۔ نواب احمد خاں بنگش، نواب دوندے خاں اور نواب وزیر خاں وغیرہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کے مصداق سینہ سپر ہو کر میدانِ عمل میں نہ آتے تو مسلمانوں کے لئے ہندوستان دُوسرا اسپین بن جاتا۔ "جنگ پانی پت" میں روہیلہ سرداروں میں سے اکثر نے مرہٹوں کو شکست فاش دے کر ہمیشہ کے لئے اِنکا زور توڑ دیا۔ شیواجی کے جانشینوں کا یہ عبرت ناک انجام دُنیا نے دیکھ لیا۔ لیکن اس کے بعد ایک نئی جماعت "ایسٹ انڈیا کمپنی" حکومت و امارت کے خواب دیکھنے لگی جس نے ایسی الٹی چال سے اُبھرنا شروع کیا کہ ع

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

ملک کا سنجیدہ طبقہ ان کی جانب ابتداءً متوجہ نہ ہوا، ورنہ سوداگروں کی ایک غیر معروف چھوٹی سی ٹولی کی یہ جرأت کب ہو سکتی تھی کہ وہ سات سمندر پار کر کے حصول سلطنت کا نقشہ جماتی۔ باوجودیکہ عوام مجاہدین کے ہاتھ میں تلوار اور تخت حکومت پر مغل شہنشاہ متمکن تھا ہم ہندوستانیوں کی خانہ جنگی اور غفلت شعاری سے کمپنی بہادر کی بیباکی اس درجہ بڑھی کہ ۱۸۵۵ء میں لال قلعہ کی برائے نام یادشاہت بھی خار کی طرح کھٹکنے لگی۔ اور اُس نے اب بلاشرکت غیرے زمام حکومت سنبھال لینے کا تہیہ کر لیا۔

جاں باز روہیلے جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سے مسلسل مصروف جد و جہد

تھے کب خاموش رہ سکتے تھے۔ بڑی بے جگری اور پامردی کے ساتھ آگے بڑھے۔ سانڈرس رقمطراز ہے:-

"تمام روہیلکھنڈ میں بدعملی اور بدنظمی کمال کو پہنچ گئی تھی۔"

جنرل بخت خاں کا دہلی پہونچ کر تحریک کی باگ ہاتھ میں لینا تھا کہ پوری روہیلہ قوم میں سرفروشی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ ملک کی آزادی اور اس کی عظمتِ رفتہ کے واپس آنے کے خواب دیکھنے لگے۔

جنرل محمود خاں

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والی تمام دوسری شخصیتوں کی طرح جنرل محمود خاں کے حالات پر بھی گہری تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جنرل صاحب سے روشناس ہونے کے لئے لے دے کر صرف سرسید کی نادر الوجود کتاب "سرکشی ضلع بجنور" ہی اس کے علاوہ جس مورخ نے قلم اٹھایا وقتی مصالح کی بنا پر اسی کتاب سے استفادہ کیا کیونکہ خوف تھا کہ کہیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے ؎

اے وضعِ احتیاط یہ فصلِ بہار ہے گلبانگ شوق زمزمہ سنجِ فغاں نہ ہو

حد یہ کہ مصنف "عجیب التواریخ" جنھوں نے جنرل محمود خاں کا عروج و زوال کا پورا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اپنی تاریخ میں ان کے کارہائے نمایاں کے لئے صرف نصف صفحہ دے سکے اور وہ بھی سرسید کی کتاب سے خوشہ چینی کرنے کے بعد لیکن۔ ؎

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بے کار گریباں تو مرا دور نہیں

انھیں مخالفانہ اور معاندانہ تحریروں کو پڑھ کر ان کی کوہِ وقار شخصیت اپنے اصلی خد و خال میں آسانی سے بے نقاب ہو جاتی ہے اور ایک گہرا اور دیرپا نقشِ وفا چھوڑتی چلی جاتی ہے۔

جنرل محمود خاں کے تفصیلی حالات دانستہ منظرِ عام پر نہ لانے کی کوشش کا ثبوت نواب عبدالسلام خاں مصنف 'نسب افاغنہ' کی ایک تحریر سے بھی ملتا ہے۔ جو مرحوم کی مرتبہ فہرست کتب موجودہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ' میں نظر سے گزری "عجیب التواریخ" کے خانہ کیفیت میں لکھتے ہیں۔

"حالات تباہی خاندان (محمود خاں) زمانہ غدر اور بعض واقعی اعتراضات کتاب سرکشی ضلع بجنور' مولفہ سرسید احمد خاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ناگوار واقعات کتاب مذکور میں درج تھے۔ یہ انتخاب کیا گیا۔ مگر مرزا صاحب (نصیر محمد خاں برلاس) کو ہمت نہ ہوئی کہ سرسید صاحب کی وجاہت کی وجہ سے اپنی کتاب لکھ کر چھپواتے۔

میری استدعا پر مجھے عنایت کی یہ انتخاب اس حالت میں نہیں ہے کہ کوئی تصنیف بغیر دوسری کتابوں کی مدد کے مکمل ہو سکے۔ اس کتاب کے ساتھ ساتھ ایک روز نامچہ "ضلع بجنور زمانۂ غدر" مرزا صاحب نے عنایت کیا اس کا پتہ مجھے کچھ نہیں معلوم ہوا کہ اس کا مصنف کون ہے۔"

بہرحال اب جنرل محمود خاں کا حال سنئے:۔

حسب و نسب

محمود خاں نجیب الطرفین یوسف زئی روہیلہ پٹھان تھے۔ نواب معین خاں عرف بھنو خاں ابن نواب ضابطہ خاں ابن نواب نجیب الدولہ کے لڑکے تھے۔ نجیب آباد ضلع بجنور کی کوٹھی مبارک محل میں پیدا ہوئے اس محل اور نواب کی دوسری عمارتوں کے بارے میں مصنف "نجیب التواریخ" رقمطراز ہیں:۔

"راقم نے قبل از غدر جبکہ میری عمر ۱۶ برس کی تھی۔ سیر قلعہ اور مہتاب باغ کی کی تھی اور جس احاطہ میں تحصیل نجیب آباد اور تھانہ پولیس واقع ہے وہ محلسرائے نواب کی تھی۔ دروازہ نہایت عجیب اور با شوکت تھا۔ باغ میں ایک مکان بھی بھون تھا۔ ایام گرما میں اس کی چھت سے باریک بوندیاں مینھ کی سی برسائی جاتی تھیں۔"[۱]

[۱] نجیب التواریخ صفحہ ۱۰۶

تعلیم و تربیت اور ابتدائی حالات

نواب بھنو خاں نے محمود خاں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا جب سن شعور کو پہونچے تو علاقے کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ ایک دوسری بیگم سے نواب بھنو خاں کے ایک اور صاحبزادہ جلال الدین خاں مخاطب بخطاب محافظ الملک جلال الدین خاں بہادر تھے والد کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں میں تقسیم ترکہ کے وقت باہمی نزاع ہو گیا، جو آخر وقت تک قائم رہا۔

چنانچہ روشن الدولہ نواب محمد سعد اللہ خاں منصف اودھ جو نواب عبد القادر خاں شہید کے متبنّٰی اور نواب بھنو خاں کے داماد تھے، تقسیم ترکہ کے لئے منحصر علیہ قرار پائے۔ انھوں نے کُل جائداد کے پانچ حصے قرار دے کر تین حصّوں کا مالک نواب محمود خاں کو (اس سبب سے کہ وہ بڑے اور رئیس خاندان تھے) قرار دیا اور دو حصے جلال الدین خاں کو دئے بڑے بھائی کے حصّے کی بیشی رنج و ملال کا باعث ہوئی پھر بھی دونوں بھائی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

نواب محمود خاں فیاض اور فضول خرچ تھے، داد و دہش کے باعث ہمیشہ مقروض رہتے۔ یہاں تک کہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں اپنی کثیر جائداد نواب محمد سعید خاں بہادر والئی رام پور کے پاس مرہون کر دی۔

نواب محمود خاں نہایت خوش طبع یار باش اور مہمان نواز تھے۔ سپاہیانہ مزاج رکھتے تھے۔ شکار کا بہت شوق تھا۔ اکثر وقت اسی شغل میں بسر ہوتا۔ گولی کا نشانہ خوب لگاتے، انگریز حکام، مرزا نثار فرخ شاہزادہ دہلی اور کبھی کبھی مہاراجہ ہندو راؤ ساتھ ہوتے تھے۔ ۵۱

غدر ۱۸۵۷ء اور جنرل محمود خاں کی حکومت

مئی سے لیکر جون ۱۸۵۸ء تک تمام ملک میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہنگامہ برپا ہوگیا۔ جوش وخروش کا ایک سیلاب تھا جو اُمنڈ اُمنڈ کر اس کے اقتدار کو خس وخاک کی طرح بہائے لئے جا رہا تھا۔ عوام بغیر کسی امیر با اقتدار کے ہر جگہ "محمدی جھنڈا" بلند کر کے جہاد کا اعلان کرتے تھے۔ مغل بادشاہ کی کمپنی نے جو توہین وتحقیر کی تھی اور اس کے اختیارات کم کرنے کے لئے جو پُر فریب جال بچھایا تھا اس کا جواب اُنکے خیال میں صرف یہ تھا کہ ایسے ناموافق حالات اُس کے خلاف کر دئے جائیں کہ بالآخر وہ رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہو جائے اسی صورتِ حال کا اعادہ نجیب آباد میں بھی ہوا۔ مولوی منیر خاں کا چار سو جہادیوں کے ساتھ نجیب آباد آنا تھا کہ عوام میں انگریزوں کے خلاف سخت اشتعال پھیل گیا۔ مُلّا اخون یوسف کو مسلمانوں نے اپنا مرشد بنا کر جہاد کے لئے تیاری کی اور جلال آباد جا کر "محمدی جھنڈا" کھڑا کیا۔ احمد اللہ خاں اور محمد شفیع خاں بھی آگئے۔ ۵۲ سر سید رقمطراز ہیں:۔

"مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹنے کی خبر سنتے ہی بجنور میں کسی کے دل میں عہدہ داروں کی دہشت باقی نہیں رہی، بڑا اندیشہ ہم کو حکام انگریزی کا تھا۔ کیونکہ یہ نمک حرام کمبخت نلنگے ہندوستانیوں سے چنداں سروکار نہیں رکھتے تھے۔" ۵۳

انگریزوں کا فرار

نجیب آباد میں حالات سرعت کے ساتھ بگڑ رہے تھے۔ سپاہ حاصل کرنے کی تمام کوششیں ناکامیاب ہو چکی تھیں اس لئے انگریزوں نے خاموشی کے ساتھ بجنور کو خالی کر دیا۔ نواب شجاع اللہ خاں لکھتے ہیں:۔

"کلکٹر نے سو آدمی نواب محمود خاں سے طلب کئے اور نواب سے کہا کہ ہم بسبب ہنگامہ پردازی دل کے یہاں سے پرٹھ جاتے ہیں اور ضلع کا بندوبست بوجہ قدیم رئیس ہونے کے تمہارے سپرد کیا جاتا ہے۔ انتظام ضلع کا کرو۔" ۵۴

انگریزوں کے چلے جانے کے بعد سر سید لکھتے ہیں کہ:۔

---

۵۱ نجیب التواریخ صفحہ ۲۰۹، روزنامچہ بہادر شاہ ۵۲ نواب شجاع اللہ خاں

۵۳ سرکشی ضلع بجنور صفحہ ۱۳ ۵۴ مرتبہ ۷ اگست ۱۸۶۹ء روزنامچہ غدر عبدالسلام خاں

"اس وقت تمام ضلع کی نظر محمود خاں پر تھی۔[۵۱] جو گرد و پیش کی فضاء سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے خود سرسید بھی ہوا کا رُخ پلٹتے ہی جنرل صاحب کے موافقین میں شامل ہو کر بظاہر ان کی خیر خواہی کا دم بھرنے لگے۔"

چنانچہ نواب شجاع اللہ خاں رقمطراز ہیں:-

"سید احمد خاں آئے اور محمود خاں سے کہا آپ کو خوب معلوم ہے کہ ڈپٹی رحمت خاں چودھریان ہندوؤں کو ضلع سپرد کرائے دیتے تھے لیکن میں نے کوشش کر کے آپ کے سپرد کرا دیا اور بلا شرکت آپ کو رئیس کرا دیا۔"[۵۲]

اعلان امارت

۵ر جون ۱۸۵۷ء کو نجیب آباد میں جنرل صاحب نے اپنی امارت کا اعلان کیا احمد اللہ خاں[۵۳] نے نجیب آباد کے باہر "محمدی جھنڈا" اٹھایا اور جلال آباد کے قریب مورچہ لگایا ان کے ساتھ شفیع اللہ خاں بھی درستی سامانِ جنگ میں مصروف تھے۔ اُس وقت اُن کے پاس چار ہزار آدمی ملازم تھے۔[۵۴]

تمام ضلع میں نواب محمود خاں کی بے کھٹکے حکومت قائم ہو گئی اور اُن کے جملہ مشیر انتظام ضلع کی طرف متوجہ ہو گئے۔ احمد اللہ خاں مختار کل قرار پائے۔ اُن کے دھام پور پہونچنے پر سب ہندو اور مسلمان اس سے متفق ہوئے اور ہر طرح اس کی اطاعت اختیار کی۔ بقول مصنف گزیٹیر ضلع بجنور:-

"یکایک لوگوں کی قسمت ایک ایسی تشدد پارٹی کے ہاتھ میں آگئی جو اسلام کی ماننے والی اور تخت دہلی سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتی تھی۔

ایک بہادر پٹھان سردار ماڑے خاں کی سرکردگی میں بھی ایک فوج بنائی گئی تھی۔"[۵۵]

شاہ دہلی کی اطاعت

محمود خاں نے ۱۲ر جولائی کو محمد خاں کے ہاتھ ایک عرضداشت دہلی روانہ کی۔ اس کے جواب میں بہادر شاہ نے امیر الدولہ ضیاء الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ کا خطاب مرحمت فرمایا۔ نیز یہ بھی تحریر کیا کہ تم نے جو حال ضلع اور پرگنوں کی بدنظمی کا لکھا ہے اُس کا انتظام کرو۔ تمہارے باپ دادا کے حال پر بادشاہان دہلی کی مہربانی رہی ہے۔ خزانہ کا حال بھی لکھ کر روانہ کرو تم ہمارے دولت خواہ ہو۔[۵۶] تین مغل شہزادے بھی دہلی سے نجیب آباد آئے۔[۵۷]

---

[۵۱] سرکشی ضلع بجنور صفحہ ۱۲۔
[۵۲] روزنامچۂ غدر نواب شجاع اللہ خاں ۱۸۶۹ء
[۵۳] محمود خاں کے بھانجے تھے
[۵۴] سرکشی ضلع بجنور صفحہ ۹
[۵۵] گزیٹیر ضلع بجنور
[۵۶] عروج عہد انگلشیہ
[۵۷] "" "" صفحہ ۲۲۹

اس دوران میں جنرل صاحب اندرونی، ملکی و مالی انتظام میں اس درجہ منہمک رہے کہ سرسید اور ان کے دست راست رحمت خاں کی موجودگی کو چنداں اہمیت نہیں دی۔ ڈپٹی رحمت خاں خیر خواہی کے پردے میں ہندو چودھریوں کو اُن کے خلاف بغاوت کرنے پر اُبھار رہے تھے۔ یہی وہ فتنہ تھا جو آگے چل کر محمود خاں کی حکومت کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور انگریزی حکومت کے دوبارہ قیام کا سبب بنا۔

دوستوں سے ہم نے وہ صدمے اُٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی بُرائی کا گلہ جاتا رہا

سرسید کو خود تسلیم ہے کہ :-

"درحقیقت ہماری خفیہ خط وکتابت جان کرافٹ ولسن بہادر سے تھی" [۵۱]

محمود خاں انگریزوں کی اس چال کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے اس لئے وہ بدستور ڈپٹی رحمت خاں اور سرسید سے سرد مہری سے پیش آتے رہے۔ چنانچہ سرسید رقمطراز ہیں :-

"۵ رجون کو تیسری مرتبہ محمود خاں نے ہنگامہ برپا کر ملنے کیا۔ میں اُسی وقت محمود خاں کے پاس گیا جو پٹھانوں کے غول میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے کہا مجھ کو کچھ علیحدہ عرض کرنا ہے۔ اُس نے عجب دعز دسے کہا یہاں کون غیر بیٹھا ہے سب اپنے بھائی ہیں۔ مگر میرے اصرار پر اُٹھ آیا" [۵۲]

محمود خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لئے چودھریوں کی جماعت پر بدستور سابق پدرانہ شفقت جاری رکھی۔ اور احمد اللہ خاں نے مندروں پر پہرے لگوا دئے تاکہ کوئی مسلمان ان کو گزند نہ پہونچائے جس سے آپس میں جھگڑے کی صورت پیدا ہو آخر کیوں نہ ہو یہ لوگ نجیب الدولہ جیسی پُرعظمت شخصیت کے نام لیوا تھے جن کے بارے میں مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی لکھتے ہیں :-

"نواب نجیب الدولہ نے نجیب آباد کے بازار خاص میں کوئی مسجد تعمیر نہیں کی کہ مبادا ہندو دکانداروں کو تکلیف ہو۔ نیز جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو قبر کے لئے جو جگہ تجویز ہوئی وہ ایک ہندو جاٹ کی ملکیت تھی اُس نے انکار کر دیا تو دوسری جگہ تجویز ہوئی وہ بھی کسی ہندو کی تھی۔ اسی طرح معلوم ہوا کہ تمام حوالی ہندوؤں کو عطا کئے ہوئے ہیں۔ مجبور ہو کر نواب نے کہا چلو جنازہ مانسرئی [۵۳] لے چلیں۔ آخر ایک ہندو کو رحم آیا اور

۵۱-۲ "سرکشی ضلع بجنور"
۵۳ صوبہ سرحد کا ایک موضع جہاں سے نجیب الدولہ آئے تھے۔

اس نے اجازت دی کہ مقبرہ اس کی زمین پر بنایا جائے۔"[۵۱]

یہی وہ چودھری تھے جن کو بلا وجہ مشتعل کرکے انگریزوں کے حامیوں نے "ہلدور" میں قتل عام کرایا۔ سرسید لکھتے ہیں:-

"قبل طلوع آفتاب سے شام تک مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ اور اس کے بعد تمام مکانات جلادیے گئے کوئی گھر باقی نہیں بچا۔"[۵۲]

لیکن بیرچشمی اور وسیع القلبی میں محمود خاں اپنے پردادا نجیب الدولہ کے قدم بقدم تھے چودھریوں کے خلاف کوئی منتقمانہ کارروائی عمل میں لانے کی انھوں نے اجازت نہیں دی۔ حالانکہ مسلم عوام بہت زیادہ مشتعل تھے اور سرسید کے خلاف ان کو برانگیختہ کر رہے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں:-

"چاندپور میں اس سے زیادہ مصیبت دیکھی تھی جب ہم وہاں پہونچے اور مسلمانوں کو معلوم ہوا تو صدہا آدمی گنڈاسہ، تلوار، بندوقیں، لے کر ہم پر چڑھ آئے اور سب بلوائی پکار پکار کہہ رہے تھے کہ چودھریوں سے سازش کرکے مسلمانوں کو مروایا۔ مسلمانوں کو ذبح کرایا اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔"[۵۳]

لیکن آفریں ہے جنرل صاحب کو جن کی ہمت بلند نے چودھریوں اور سرسید سے کوئی بازپرس نہیں کی۔ اور اصلی دشمن کو بیخ و بن سے اکھاڑنے پر ہی اپنی تمام تر توجہ مبذول رکھی۔

نجیب آباد اور اس کے نواح کا بخوبی انتظام کرنے کے بعد جنرل صاحب نے اپنی کثیر التعداد فوج کو امروہہ، مراد آباد، بریلی، اور ادھر روانہ کیا جہاں علما، اور مجاہدین اپنے خون سے ہولی کھیل کر ایک فیصلہ کن جنگ لڑ رہے تھے، ان کی فوج کو بالعموم نجیب آبادی تلنگے کہا جاتا تھا۔

چنانچہ جب امروہہ میں سیدوں نے بغاوت کا علم بلند کیا تو سید گلزار علی صاحب[۵۴] ہلدور گئے اور مجاہدین کی کافی تعداد لے کر امروہہ آئے اور اعلان کیا کہ:-

"مارے خاں بھی آئیں گے۔"[۵۵]

فیروز شاہ نے جب مراد آباد کا محاصرہ کیا تو ان کے ہمراہ نجیب آباد کی فوج تھی۔ مولوی منشی

---

[۵۱] "رسالہ عبرت" فروری ۱۹۱۹ء

[۵۲ و ۵۳] "سرکشی ضلع بجنور" صفحہ ۱۰۶

[۵۴] غدر سے پہلے مراد آباد میں مختار کل تھے ۱۶ر مئی ۱۸۵۷ء کو امروہہ آئے یہاں سیدوں کی آبادی تین ہزار تھی ان کی رہنمائی کی اور امروہہ میں تحریک شروع کی، ناکامیابی کے بعد بریلی میں روپوش رہے، ایام جلاوطنی سخت عسرت اور مفلوک الحالی میں بیتے لوگ کہتے تھے بہت وجیہ، شکیل، فیاض، جری اور بہادر تھے۔

[۵۵] "تاریخ امروہہ" صفحہ ۸۳، مصنفہ محمود احمد عباسی۔

قربان علی ساکن دھام پور اپنے معتقدین کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ لکھنؤ گئے اور احمد اللہ شاہ صاحب کے ساتھ مصروفِ کارزار رہے۔ مصنف "قیصر التواریخ" رقمطراز ہے:۔

"لکھنؤ کی فتح کے بعد جرم ثابت ہوا۔ تین برس کی سزا ہوئی۔ الہ آباد کے جیل خانہ میں ہیں۔ سنتے ہیں کہ اب غذا میں تخفیف ہو گئی ہے۔ کپڑے بدلتے ہیں۔ پلنگ پر سوتے ہیں۔ نگینہ کی تمام جائداد گھر کی نقد و جنس بحق سرکار ضبط ہو گئی۔" ۵۱

اسی طرح بریلی میں جب خان بہادر خاں نے اپنی امارت کا اعلان کیا اور "نکٹیا" کے پل پر ان کے اور انگریزوں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی۔ فیروز شاہ کے ساتھ کافی تعداد نجیب آبادی مجاہدین کی تھی۔ ۵۲

مارچ ۱۸۵۸ء میں اودھ کا سب سے بڑا محاذ آزادی سر کرنے کے بعد انگریزوں نے اطمینان کے ساتھ نجیب آباد کے خلاف اقدام کیا۔ مصنف "بجنور گزیٹیر" لکھتا ہے:۔

انگریزوں کا حملہ اور شکست

"لکھنؤ کی فتح کے بعد کرنیل کیمبل رڑکی اور روہیلکھنڈ کی طرف بڑھا۔ یہ فوج مسٹر جانسن کے ماتحت تھی ۱۵ اپریل کو اس فوج نے "ہردوار" پر قبضہ کیا۔ پھر گنگا کو عبور کر کے ناگل کی طرف بڑھی تاکہ دشمن کا جو کہ جنگل میں مضبوط طاقت میں تھا مقابلہ کرے چار میل چلنے کے بعد باغیوں کی ایک بڑی تعداد سے مقابلہ ہوا۔"

سرسید لکھتے ہیں:۔

"شیو پرشاد نے خبر دی کہ نواب کی فوج اندر ہی ہے۔ ڈائمنڈ صاحب نے نہر پر کھڑے ہو کر دوربین سے دیکھا اور حکم دیا کہ نہر کا پانی چھوڑ دیا جائے۔ اس حکمت سے دشمن کو موت نے جنگل میں پکڑ لیا۔ بیسیوں پانی میں ڈوب گئے اور باقی جو پانی کے بیچ میں کھڑے تھے یا کنارے پر تھے سب کو مار دیا گیا۔ نہر ایجنٹ شیو پرشاد کو سو روپیہ انعام کے ملے۔" ۵۳

---

۵۱ "قیصر التواریخ" صفحہ ۲۴۳

۵۲ میرے خاندان کی ایک بزرگ خاتون نے گل ور دخاں کی زبانی جنہوں نے بچشم خود فیروز شاہ کو نبرد آزمائی کرتے دیکھا تھا اُن سے بیان کیا کہ فیروز شاہ مع اپنی فوج کے جس طرف نکل جاتے تھے دشمن کی فوج میں ہل چل پڑ جاتی اور وہ خود مع گھوڑے کے خاک و خون میں اس قدر لوٹ جاتے تھے کہ سوائے ان کی تلوار کی چمک کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جب خان بہادر خاں نے اپنے ہاتھی کی باگ موڑی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کو خیر باد کہا۔ فیروز شاہ اس کے بعد بھی لڑتے رہے یہاں تک کہ تمام رفقاء ایک ایک کر کے ان پر نثار ہو گئے وہ یکہ و تنہا رہ گئے تو کہیں غائب ہو گئے۔

۵۳ "سرکشی ضلع بجنور"۔

نجیب آبادی فوج کو غیر متوقع طور پر ہزیمت ہوئی۔ نیز تمام اقطاع ملک "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی گرفت میں آجانے سے محمود خاں سخت بدحواس ہو گئے اور انھوں نے اندازہ لگا لیا کہ اب آزادی ملک و ملت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا جنرل محمود خاں، سعد اللہ خاں، اور احمد اللہ خاں بھی آخری بار مشورہ کے لئے جمع ہوئے ۵۰

آج جاں بازوں کا مجمع ہے درِ قاتل پر
کون کرتا ہے فدا تیغ پہ سر دیکھیں تو

ان سب کے مشورے سے مانے خاں، شفیع اللہ خاں، نتھو خاں، قادر خاں اور مولوی عنایت علی نے نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کئے لیکن جائے پناہ کی تلاش عبث سمجھ کر جنرل محمود خاں نے اپنے کو انگریزی فوج کے سپرد کر دیا اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ پورا ملک "برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی" کے خونخوار پنجوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔

دردانگیز انجام

حب الوطنی کے جرم میں کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی لیکن اس پر عملدرآمد کی ہنوز نوبت نہ آئی تھی کہ انھوں نے آخرت کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ جیل خانہ ہی میں انتقال فرمایا۔ جنرل صاحب کے اوصافِ حمیدہ کا اعتراف آج تک روہیلکھنڈ میں کیا جاتا ہے۔

سُنا ہے حد درجہ دلیر اور بہادر ہونے کے باوجود لاغر اندام اور متوسط القامت تھے۔ غلامی کی پہلی بیڑی 'بنگال' اور آخری بیڑی 'نجیب آباد' نے پہنی۔ بہادر شاہ پر 'مغلیہ خاندان' کا خاتمہ ہوا۔ اور محمود خاں پر 'آزادیٔ روہیلکھنڈ' کا۔

برٹش کمپنی کے مظالم

سرسید لکھتے ہیں:-

"لوگوں کو عبرت ناک سبق دینے کے لئے نجیب آباد میں بھی انھیں مظالم کا اعادہ کیا گیا جو بقیہ ہندوستان پر توڑے جا رہے تھے۔"

"۱۹ر اپریل ۱۸۵۸ء کو محمود خاں کے چھوٹے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں کو نورپور میں پھانسی کی سزا دی گئی اور ان کا دیوان خانہ بارود سے اڑا دیا گیا۔" ۵۱

"نگینہ کے باغوں میں چھپے ہوئے لوگوں کو انگریزی فوج نے قتل کیا۔ قاضی محلہ کے سب آدمی مارے گئے۔ دھام پور کی سڑک پر جس قدر لوگ ہاتھیوں پر سوار ملے سب کو قتل کیا گیا۔ خاص باغی دیہات بنا دئے گئے تھے۔ کہ وہ بالکل غارت کر دئے جائیں اور اُن میں تمام باغیوں کے سر لٹکائے جائیں۔" ۵۲

۔ ۔ "سرکشی ضلع بجنور"   ۵۲ "عروجِ عہدِ انگلشیہ"

جانسن کی رائے تھی کہ:۔

"موت کی سزا طرح طرح کی تکلیفیں دے کر دی جائے۔ مثلاً مجرم کی کھال اُتاری جائے، زندہ جلایا جائے، پھانسی آسان موت ہے۔" لے

"جو مسلمان تنومند وجیہہ تھے اُنھیں پکڑ کر کوتوالی پہونچایا گیا۔ بہت کم ایسے مسلمان تھے جو سپاہیانہ شان نہ رکھتے ہوں اور پھانسی سے بچے ہوں۔"

پشاور سے لے کر مشرقی و شمالی ہند تک شاید ہی کوئی مالدار، مولوی، غازی مسلمان ہوگا جو نہ پکڑا گیا ہو۔ دس برس تک برابر ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت صغریٰ برپا رہی۔

"ایک محکمہ گواہوں کی دار و گیر کے لئے بھی تیار رہا جس کو چاہا حبس دوام کر دیا۔" لے۲

"مجرم کراچی میں اکڑوں بٹھا دیا جاتا اور مشکیں کسی ہوتیں۔ تختہ پر مجرم کو چڑھا کر گلے میں پھندا ڈال کر نیچے گرا دیتے تھے۔" لے۳

"روبکاری اور سزا یابی کے وقفہ میں گورے باغیوں کو بڑی اذیت دیتے۔ مثلاً بال کھینچتے، سنگین بدن میں چبھوتے۔ ان حرکتوں کو دیکھ کر افسر مسکراتے تھے۔ کمشنری صاحب ظالموں کو ہلاک کرنے میں پتھر سے زیادہ سخت اور فولاد سے زیادہ تھے۔" لے۴

اس قومی بدنصیبی اور ہولناک زمانہ میں عوام پر یہ مظالم کچھ تعجب خیز نہ تھے اُن کے سرتاج شہنشاہ ہند بہادر شاہ تک رنگون کی قید فرنگ اور جلاوطنی کی حالت میں جبکہ اُن کے پوست و استخوان پر سایہ کا گمان ہوتا تھا۔ دل ہلا دینے والے مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے۔

ایک انگریز ممبر پارلیمنٹ رقمطراز ہے:۔

"میں نے بہادر شاہ کو ایک کھرّی چارپائی پر پڑا ہوا دیکھا۔ ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا ٹاٹ اُنھوں نے اوڑھ رکھا تھا۔ و برگ ٹاٹ کو ہٹا کر اپنے بازو دکھائے جو بے فرش کی چارپائی پر پڑے رہنے کے باعث زخمی ہو گئے تھے اور زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے۔" لے۵

اس زمانہ میں فارسی اور عربی کا رنگ اردو زبان پر غالب تھا۔ اس لئے بالعموم انگریزوں کے لئے مسلمان قرآن شریف کا لفظ "نصاریٰ" بولتے تھے۔ لیکن اس لفظ کے لکھنے پر بھی مسلمانوں

لے "عروج عہد انگلشیہ" لے۲ "بلاپانی" از مولانا جعفر تھانیسری
لے۳ ؍؍ ؍؍ لے۵ رسالہ گجراتی کا دیوالی نمبر سنہ ۱۹۲۴ء صفحہ ۲

پر کون سا ظلم تھا جو رَوا نہ رکھا گیا۔

"حیاتِ جاوید" میں مرقوم ہے:-

"بعض اضلاع میں مسلمانوں کی ایّامِ غدر کی ایسی تحریریں پکڑی گئیں ہوئیں جن میں انگریزوں کو نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا۔ حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا اور اُن کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو اُن کی قسمت میں لکھی تھیں"۔[1]

لیکن کیا آزادی کے اِن پروانوں اور شہیدانِ وطن کا خون رائگاں گیا — نہیں ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تحریکِ آزادی کے بنیادی ستون ہیں۔ ہماری موجودہ "تحریکِ آزادی" کے بنیادی ستون ہیں ان کی زندگی اور موت دونوں مبارک اور قومی حیاتِ نو کا پیغامِ جانفزا ہیں ؎

تمہیں سے اے مجاہدو! جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعلِ وفا فروغِ شش جہات ہے
تمہاری ضو سے پُرضیا جبینِ کائنات ہے

کواکبِ بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

انیس فاطمہ

---

[1] "حیاتِ جاوید" صفحہ ۸۹ ۔ لائف سرسیّد مصنفہ مولانا حالی۔

نوٹ - اس مضمون میں موجودہ زمانہ کے حالات کی روشنی میں ہمارے محبوب رہنما سرسیّد علیہ الرحمۃ کی شخصیت کسی قدر قابلِ اعتراض نظر آتی ہے۔ لیکن اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ ان کے اُس وقت کے خیالات و عقائد و نیز فرائضِ منصبی کے تحت تھا۔ اُنھیں یقین تھا کہ انگریزی حکومت ہندوستان سے نہیں جائیگی اور اس کے خلاف بغاوت کرنے سے مسلمان بے وجہ ہلاک ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن جو کچھ خدمات اُن سے ظہور میں آئیں ان کا اُنھوں نے کوئی خاص انعام گورنمنٹ سے نہیں لیا۔ چنانچہ میر صادق علی و میر رستم علی پٹھان چاندپور ضلع بجنور کا وہ تعلقہ جو بحق سرکار ضبط ہو گیا تھا۔ اُنھیں دیا جانے لگا تو اس کے لینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانا ان کی شریف فطرت کے خلاف تھا۔ غدر کے بعد مسلمانوں کو مزید تباہیوں سے بچانے کی شاندار خدمات اور تعلیمی میدان میں اُن کی زبردست جدوجہد بھی جس سے کہ ملّتِ اسلامیہ کو از سرِ نو زندگی حاصل ہوئی مسلّم ہے۔

(ایڈیٹر)



مسز سروجنی نائیڈو

اب سے تیس ۳۰ سال پہلے

(از علامہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی)

دسمبر کا آخری ہفتہ حسب معمول ہماری قومی مجلسوں کے لگن کے دن تھے، امسال کلکتہ کی سرزمین میں ان کے تمام مراسم ادا ہوئے، شوروغل، ہجوم و اژدہام، جوش و خروش کے بڑے بڑے منظر یہاں دیکھے، زبانوں کی سحر کاری، الفاظ کی روانی، دلائل کا زور، مطالب کی اہمیت اور مقاصدِ بیان کی عظمت، اِن میں سے ہر شے فراوانی کے ساتھ ہر جگہ موجود تھی۔

لیکن کیا شے نہ تھی؟ سحر تھا لیکن اثر نہیں، روانی تھی لیکن صفائی نہیں، زور تھا لیکن ہاتھ میں نہیں، اہمیت تھی لیکن بیان میں، عظمت تھی لیکن الفاظ میں، شوروغل تھا لیکن غیر مفہوم ہجوم واژدہام تھا لیکن مورد مگس کا، جوش و خروش تھا لیکن اُس دریا کا جس کی تہ میں گوہر نہیں۔

ہم سے کہا جاتا تھا کہ اب وہ وقت آیا ہے کہ اس وقت "تڑپتی ہوئی لاشوں، کٹی ہوئی رگوں اور بہتے ہوئے خون کی ضرورت ہے" ہم سرتاپا اثر ہو کر جھک کر دیکھنے لگتے تھے کہ خوش بیان مقرر کے سینہ میں تڑپتی لاش ہے؟ گردن میں کٹی ہوئی رگ ہے؟ بدن میں کہیں بہتا ہوا خون ہے؟ لیکن تأمّل کے بعد نظر آتا تھا کہ یہ صرف رونقِ بازار اور گرمئ ہنگامہ کا سامان تھا، نہ کہیں لاشیں تڑپی ہیں، نہ کہیں رگیں کٹی ہیں، نہ کہیں خون بہا ہے۔

اُمّ الاحرار کے جلوس میں اللہ اکبر کے زلزلہ انداز نعرے دمبدم سنائی دیتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کا کنگرہ اب زمین پر آتا، یا زمین کا طبقہ اب نیچے کو دھنس جانا چاہتا ہے،

لیکن جب بھیڑ چھٹ جاتی تو آسمان اپنے مدار پر اور زمین اپنے نقطہ پر نظر آتی تھی۔

ہم نے کہا ہے اور پھر کہتے ہیں کہ مسلمان دم میں جلجانے والے اور جلا دینے والے کو آتش فشاں ہیں، لیکن ہمیشہ سلگنے والے اور جلتے رہنے والے آتشکدہ نہیں، وہ ایک لمحہ کے آنے والے اور گزر جانے والے طوفان آپ ہیں، لیکن ہمیشہ بہنے والے ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کے چشمے نہیں۔

ہم جوشِ بیان، آزادیٔ قول، اور نعرۂ حق کے ساتھ ایک اور چیز بھی ڈھونڈھتے ہیں۔ متانت رائے، استقلال عزم اور دوامِ عمل! دنیا کی تاریخ قول سے نہیں عمل سے بنی ہے، اس لئے ہمارے نزدیک کمزور عمل، پُرزور بیان سے بہتر، اور تھوڑا کرنا بہت بولنے سے اچھا ہے۔

سرسید نے ابنِ خلدون کے نظریہ کے مطابق ایک مضمون لکھا ہے کہ "ہر قوم کی ایک طبعی عمر ہوتی ہے" ہم اس کلیہ میں قومی مجلسوں کو داخل کرنا چاہتے ہیں، کانفرنس کی عمر طبعی ۳۰ برس تھی اور وہ ۳۰ برس ہوئے کہ پوری ہو چکی[1]، اب وہاں عام مجلسوں کا شور و غل اور جوش و خروش بھی نظر نہیں آتا، کانفرنس ہماری تمام مجلسوں میں سب سے زیادہ کبیر السن ہے، اب اس کو دوسرے کاروبار چھوڑ کر گھر کا کام انجام دینا چاہئے، اشاعتِ تعلیم کا پیغام تو ہر جگہ پہونچ چکا، اب اشاعتِ تعلیم کا کام ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں کلکتہ میں ایک اسلامیہ کالج کی بنیاد کی تجویز اگر عمل میں آجائے تو اس کو امسال کی کانفرنس کا حاصل سمجھنا چاہئے[2]

کانفرنس کے تمام شعبوں میں سب سے مفید اور کارکن صیغہ "انجمن ترقی اردو" ہے، اور سب سے سُست رو شعبہ "تعلیم نسواں" ہے، اس کا کام مسلمان عورتوں کی اصلاح ہے، مگر وہ

---

[1] "ہر کلیہ مرا ہستنی" ہوتا ہے۔ بحمداللہ فضل سے کانفرنس اب ساٹھ سال کی ہو جانے پر بھی "جوان" ہے۔ (دسمبر ۱۹۲۷ء کے صدر اجلاس سر اکبر حیدری مرحوم اور اس زمانہ میں کانفرنس کے سکریٹری جناب نواب محمد اسحٰق خانصاحب مرحوم مغفور تھے۔) (مصنف)

[2] یہ کالج قایم ہو گیا نیز درجنوں دوسرے ادارے کانفرنس کی کوشش سے قایم ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ (مصنف)

خود اب "مسلمان عورت" ہوگیا ہے، کم از کم تین برس سے ہم اس کی سالانہ رُوداد سُن رہے ہیں، اِس کے سُننے میں اُسی قدر لطف آتا ہے جس قدر ایک بوڑھی عورت کو آدھے پان کی کُٹی ہوئی گلوری میں۔

چند سال سے ہماری دسمبر کی قومی مجلسوں کی بہترین ساعت وہ ہوتی ہے جب دکن کی مشہور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو اپنی ادھیڑ عمر لیکن نوجوانی کے لباس میں پنڈال کے اندر داخل ہوتی ہیں، سُرخ ٹوپیاں اپنی جگہ سے اُچھل پڑتی ہیں، صدارت کا مرکز اپنی جگہ سے جنبش کر جاتا ہے، اور سکریٹری اپنے نوجوان لیڈروں کی ہمراہی میں اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے، ہمارا سب سے خوش قسمت لیڈر وہ ہے جس کو اُن کے قیمتی فرغل کو کندھے پر رکھنے کی عزت ملتی ہے، اور اس کے بعد خوش قسمت وہ ہے جس کے پہلو کی کرسی میں ان کو جگہ دی جائے، ہندوستان کا ہر شہر اس خوش قسمتی کے لئے اپنے اپنے فرزندوں کو پیش کر سکتا ہے، لیکن عموماً یہ فخر لکھنؤ اور بانکی پور کی قسمت میں آتا ہے۔

چند لمحہ کے بعد صدر اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے اور مسز موصوفہ سے تقریر کی تحریک کا خوشگوار فرض ادا کرتا ہے۔ وہ بلا انکار قبول کرتی ہیں اور جادوگری کے تمام بانے لیکر سامنے آتی ہیں، الفاظ رانی کے دامنے بن بن کر داہنے بائیں اور آگے پیچھے گرنے لگتے ہیں، اسی مسحوری کے عالم میں ہاتھوں کی جنبش، دلوں کا اضطراب، آنکھوں کی گردش ہر چیز سننے والے کی بے قراری کا پتہ دیتی ہے، مسلمانوں کے طبائع کا اندازہ کر کے اسلامی مجلسوں کے لئے ایک موضوع انھوں نے مقرر کر لیا ہے، اور وہ حسب موقع اسلام، تاریخِ اسلام، اور اسلافِ اسلام کی مدح سرائی اور آخری تان ایک اُردو یا فارسی شعر پر توڑ دینا۔

مسز موصوفہ اُس وقت نہ صرف شاعرہ بلکہ سرتاپا شاعرہ ہوتی ہیں، ان کا لباس، طرزِ خرام، طرزِ گفتار، ان کے ایک ایک عضو کی حرکت، سر کی جنبش، آنکھوں کی گردش، اِس میں سے ہر چیز شاعرانہ ہوتی ہے، جب تک وہ بولتی رہتی ہیں سارا مجمع مبہوت اور متحیر رہتا ہے، ڈائس کی بلندی سے ہر چند فقروں کے بعد چیرز کے نعرے بلند ہوتے ہیں، اور آخر نشست تک اِس کی صدائے بازگشت بڑھتی چلی جاتی ہے، آخر اسی چیرز کے آوازوں میں ایک اُردو یا فارسی شعر پڑھ کر جب پلٹتی ہیں تو ہر کرسی خود بخود خالی ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھنے کی آرزو کرتی ہے۔ لیکن کمتر ایسا ہوا کہ اس تسابق میں لکھنؤ یا بانکی پور کی کرسی سے کسی اور کی کرسی سبقت لیجائے، ان کے کانوں میں باتیں کرنے کا شوق اس درجہ ترقی کر جاتا ہے

اور بوڑھوں بوڑھوں سے اس باب میں وہ حرکتیں سرزد ہوتی ہیں کہ ہمارے ادب شناس نوجوان غصہ سے لال پیلے ہو جاتے ہیں۔

بعد ازیں صدر اور سکریٹری فوراً اٹھ کر لیکن تبسم آمیز شرم اور جھجھک کے ساتھ خطبہ کا شکریہ ادا کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ طوطی، بلبل، قمری اور دیگر خوش رنگ و خوش آواز پرندوں میں سے کسی کی تشبیہ چھوٹنے نہ پائے'' اور ہر شکریہ گزار اپنے حسن تشبیہ کے لئے دوسروں پر سبقت کے لئے بیقرار رہتا ہے، شکریہ کا آخری فقرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن کب آئے گا'' جب ہماری پردہ نشین خواتین اس لیاقت و قابلیت سے ہماری قومی مجلسوں پر حکمرانی کریں گی' مسز سروجنی نائیڈو نہ صرف قولاً ان کے لئے نمونہ ہیں بلکہ وہ خود مجسم ہماری خواتین کے لئے عملی سبق ہیں''۔

آخری سین کس درجہ رقت انگیز ہوتا ہے جب وہ شکر گزاروں کے تحفے لے کر چلنے کو اٹھ کھڑی ہوتی ہیں، تو ائس کی نصف کرسیاں آخری جلسہ تک خالی ہو جاتی ہیں اور صف کے اندر جہاں جہاں سے گزرتی ہیں حاضرین کا زیرلب تبسم کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھتی جاتی ہیں، اور آخر جب وہ زمین آتی ہے جہاں گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں تو کہہ نہیں سکتا کہ کس قیامت کی کشمکش برپا ہوتی ہے، اور آخر ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔

ہم مسز موصوفہ کے فضل و کمال کے منکر نہیں، ان کے حسن تقریر کے دل سے معترف ہیں، ان کے خیالات کی قدر کرتے ہیں، لیکن ہم اپنے مسلمان اکابر کی خفیف الحرکتیوں کو جو بھرے جلسوں میں ان سے سرزد ہوتی ہیں، اپنے قومی جلسوں کے لئے لعنتِ کبریٰ سمجھتے ہیں، حافظ کو آٹھویں صدی میں شکایت تھی ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر می کنند

لیکن اگر چودھویں صدی میں ہوتے ''جلوت'' و ''خلوت'' کا بھی فرق وہ نہ پاتے۔

(منقول از شذراتِ رسالہ معارف بابت جنوری ۱۹۱۸ء)

بزمِ مصنّف

پرنسپل عبدالرحمٰن صاحب صدر حیدرآباد اکیڈمی حیدرآباد دکن کا نفرنس کے ادارہ تحقیقاتِ علوم اسلامیہ کے مطبوعہ کتابچہ کا شکریہ۔

شاید آپ کو علم نہ ہوگا کہ میں نے جدید سائنس و ریاضی کے علاوہ علوم اسلامیہ پر بھی بعض شعبہ جات میں تحقیقات کی ہے۔ اور مسلمانانِ عہد ماضی کے سائنس و حکمت وغیرہ پر انگریزی اور اردو میں متعدد مقالے شائع کئے ہیں۔ "حیدرآباد اکیڈمی" کی مطبوعات میں میرے مندرجۂ ذیل اردو مقالے اگر آپ ملاحظہ فرمانا چاہیں تو بھیج دئے جائیں گے۔

(۱) قرونِ وسطیٰ میں عرب اور عجم کے حکماء کی علمی تحقیقات ۔ ۶۸ صفحے

(۲) سیاروں پر زندگی کے امکانات ۲۸ "

(۳) حقائقِ حیاتِ انسانی ۳۰ "

اوّل الذکر مقالہ کا انگریزی خلاصہ "اسلامک کلچر" میں شائع ہوچکا ہے۔ ہیئت کے ایک اہم شعبہ سے متعلق مسلمانوں کی بیش بہا خدمات پر ایک مقالہ بعنوان "فضائی علم الہیئت میں مسلمانوں کا حصہ" اسی رسالہ میں طبع ہو رہا ہے۔ اس سے اہلِ یورپ و امریکہ کو معلوم ہوجائے گا کہ مسلمان حکماء نے صدیوں پہلے کیسی صحیح معلومات فراہم کی تھیں۔

۵ مئی کے رسالۂ "اسٹار" کی اشاعت میں (جو بمبئی سے مسلم لیگ کی مدد سے جاری ہے) بعنوان "سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کے کارنامے" میرا ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کو کس قدر ترقی دی۔ میری نشری تقریروں میں بھی (جو کتاب کی شکل میں شائع ہوگئی ہیں) میں نے اسلامی معاشیات اور مسلمانوں کی سائنٹفک تحقیقات پر مفید بیانات شائع کئے ہیں۔

قبل ازیں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے "الخازنی کی میزان الحکمت" جو طبع اور شائع کی گئی اس میں میرا ایک نوٹ "البیرونی ابوزکریا الرازی ابن سینا" وغیرہ کے طبیعیات کے تجربوں کی اہمیت سے متعلق درج ہے۔ ممالک غیر کے سائنس داں جب اس کو پڑھتے ہیں تو ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اسلامی ثقافت و تمدن سے متعلق میرے فارسی اشعار "معارف اعظم گڑھ"، "برہان دہلی"، "ندائے حرم دہلی" وغیرہ

ہیں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں۔ حال میں ان کا مجموعہ مرقع خیال کے نام سے طبع ہوا ہے۔ ابن بطوطہ کے تحفۃ النظار کا اردو ایڈیشن سائنٹفک جغرافی اور تاریخی اشارات کے ساتھ (جس کا بیشتر حصہ ندائے حرم میں باقساط شائع ہوا ہے) مکمل کتاب کی صورت میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔
براہ کرم مطلع فرمایا جائے آیا ادارۂ تحقیقاتِ علوم اسلامیہ اس کو طبع اور شائع کرنے کے لئے آمادہ ہے۔

اسٹینلی لین پول کی کتاب "مسلم شاہی خاندان" کا اردو ترجمہ بھی میں نے کر ڈالا ہے اور وہ باجازت انگریزی پبلشر ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد کی طرف سے طبع ہو رہا ہے۔ اس ترجمہ کے ساتھ تمہید میں تاریخی مواد کو زمانۂ جنگِ عظیم تک پہونچا دیا ہے۔ اصل کتاب میں یہ مواد صرف ۱۸۹۳ء تک کا درج تھا۔

عرصۂ دراز سے میں مسلمان حکماء کی تصنیفات و تالیفات متعلق ریاضی، ہیئت، طبعیات، کیمیا، ارضیات، نباتیات، معاشیات، عمرانیات، طب، میکانیات، فلسفہ، تاریخ، وجغرافیہ وغیرہ پر یورپ و امریکہ کے مستشرقین نے جو بھی مواد فراہم کیا ہے اُس کی تفصیل اور تنقید لکھ رہا ہوں۔ بشرطِ زندگی انشاء اللہ تعالیٰ یہ کتاب دو سال میں مکمل ہو جائے گی۔ اگر ادارۂ علوم اسلامیہ اس کو شائع کرنا چاہے تو ہر مضمون کا علٰحدہ علٰحدہ حصہ وقتاً فوقتاً بغرض طباعت و اشاعت بھیجا جا سکے گا۔ حیدرآباد اکیڈمی والا اوّل الذکر مقالہ اس کتاب کا پیش لفظ سمجھا جا سکتا ہے۔

قاضی احمد میاں صاحب اختر جونا گڑھی

"مصنف" کا ہر نمبر آپ کے علمی و تاریخی ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اب کی مرتبہ بھی نواب سراج الدولہ از مولوی رئیس الاسلام صاحب گوپاموی) نہایت محققانہ اور پُر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون کو پڑھتے وقت صفحہ ۱۹ کے فٹ نوٹ میں "منتخب اللغات" کا حوالہ دیکھ کر خیال ہوا کہ اس قسم کے لطائف اگر یکجا جمع کر دئے جائیں تو کاتب صاحبان کو اپنی ستم ظریفیوں کا علم ہوتا رہے اور شاید اُن کی اصلاح کا موجب ہو۔

تاریخی مضامین کے سلسلے میں "آسامی مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ" (مترجمۂ اختر النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ جلپور) جتنی دلچسپ ہے۔ اتنی ہی مختصر ہے۔ چند ماہ ہوئے ایک بنگالی محقق بملا چرن لا کا ایک مفصل مضمون "سلاطین گوڑ" پر نظر سے گزرا تھا۔ ابتدائی عہد میں اسلام کے ایک مایۂ ناز فرزند قاضی محمد رکن الدین سمرقندی (۶۰۲ھ - ۶۲۶ھ) معروف با بن العمید سرزمین کامروپ میں پہونچ گئے تھے۔ چنانچہ ان کی ایک عربی کتاب "المرأۃ المعانی فی ادراک العالم الانسانی" (جو یوگ پر سنسکرت کی ایک کتاب "امرت کیڈ" کا ترجمہ ہے) کے دیباچے میں کامروپ کی جامع مسجد میں ایک

ہند دیو گی تھوجر برہمن کے جانے اور قاضی صاحب کے ہاتھ پر اسلام لانے کا واقعہ ملتا ہے۔ اس ابتدائی عہد میں آسام میں مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق اگر مزید تحقیقات کی جائیں گی تو امید ہے کہ زیادہ حالات مل سکیں گے۔

اب کی مرتبہ جدید مطبوعات پر تبصرے خوب ہیں۔ اُردو کے چوٹی کے رسائل میں بھی (رسالۂ اُردو کے سوا) اس سے زیادہ مفصل اور بہتر تبصرے نہیں نظر آتے۔ تبصرہ نگار (سیدہ انیس فاطمہ بریلوی) قابلِ مبارک باد ہیں۔ ع نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

ولی کے سلسلے میں کئی چیزیں پیشِ نظر ہیں، جن کی تکمیل فرصت چاہتی ہے۔ بعض فاضل دوستوں کی رائے ہے کہ اس کو کتابی صورت میں چھپوایا جائے۔ اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ایک مضمون کی صورت میں ہے جس کے کئی گوشے تشنۂ تکمیل ہیں۔ اور مکمل ہونے کے بعد وہ مضمون کی حدود سے متجاوز ہو جائے گا۔ اس لئے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذَالِکَ اَمْرًا۔ آپ کو جو مضمون بھیجا گیا ہے وہ پچھلے مقالے کی آخری کڑی ہے ؎

رفتیم یاراں تخفیف تصدیع گردد دِسر بود از ما شمارا

کرنیل غلام سید محمد معین الدین صاحب حیدرآباد دکن

ایک زمانہ سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ اخبار "یاد" (ہفت روزہ) انشاءاللہ عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔ ظفر جاوید صاحب میرے ساتھ کام کر رہے ہیں ابتدائی منازل طے ہو چکے ہیں۔ سب سے کٹھن کام یعنی پائے کے مضامین کا دستیاب ہونا باقی ہے۔ مجکو قوی امید ہے کہ آپ میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ آپ کے ذریعہ ایک ضروری کام یہ ہے کہ خاص یونیورسٹی کے لئے ایک نہایت ہی ایماندار، صاف گو اور غیر جانب دار نامہ نگار کا تقرر فرما دیجئے جس کے ذریعہ ہم کو یونیورسٹی کے جملہ شعبوں کی صحیح صحیح اور بے کم و کاست خبریں بروقت مل جایا کریں۔ ہم اس اخبار کو فرقہ واریت اور پارٹی بندی سے بالاتر رکھنا چاہتے ہیں اور صرف علی گڑھ کی تعمیری خدمت ہمارا پہلا نصب العین ہے۔

سید مسعود الحسن صاحب ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج بریلی

آپ سے روانگی کے وقت ملاقات نہ کر سکا، جس کا بے حد افسوس ہے۔ آپ کے تمام ارشادات کی تعمیل کردی گئی تفصیل یہ ہے کہ کالج میں ڈبل شفٹ جاری ہو گیا۔ سب بچے داخل ہو گئے۔ اب بحمداللہ بارہ سو طلباء کالج میں داخل ہوں گے۔ آپ کو چونکہ ہمیشہ کالج کی ترقی سے دلچسپی رہی ہے اس لئے درخواست اور انسپکٹر کی منظوری کی نقل بھی بھیج رہا ہوں۔ اس وقت آپ کا کالج صوبہ کے اوّل درجہ کے

اداروں میں ہو گیا ہے۔ جناب مولوی مختار احمد خاں صاحب منیجر ایثار مجسّم ہیں۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن دکنیات کے متعلق آپ کا خیال درست ہے مگر میرا خیال ہے کہ دکنیات سے قطع نظر دکن کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اُس سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر صوبہ کی "اردو" اس قدر وسیع مضمون ہے کہ اُس پر کام کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہے اور پھر میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ایک صوبہ والوں کو دوسرے صوبہ کے متعلق معلومات اس قدر نہیں ہوتیں جس قدر خود اس صوبہ والے کو ہو سکتی ہیں اور جو اصحاب وسیع پیمانے پر اردو کی تاریخ وغیرہ لکھا کرتے ہیں اُن میں سے اکثر کتابیں نامکمل اور تشنہ ہوتی ہیں، کیونکہ اُنکی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ اداروں کی توجہ نہیں خود اپنے متعلق کہوں گا کہ اگر میں، اردو کے کسی وسیع عنوان پر مضمون لکھوں تو ہرگز کامیابی نہیں ہوگی بلکہ معلومات نہ ہونے کے باعث مضمون قابل اعتراض ہوگا۔

جولائی کا مصنف وصول ہوا۔ میری کتاب "عہدِ آصفی کی قدیم تعلیم" پر سیدہ امیر فاطمہ صاحبہ نے جو تنقید فرمائی ہے۔ اُس کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری خدمات کی بیگم صاحبہ نے جن بلند پایہ الفاظ میں ستائش کی ہے۔ اُن کے لئے بھی سپاس گزار ہوں۔ ایسے ہی حوصلہ افزائی کے باعث باوجود دفتری مصروفیت وغیرہ کے کچھ نہ کچھ لکھنے کی جرأت ہوا کرتی ہے۔ اگر بیگم صاحبہ کے دونوں تاریخی مضامین "جنرل بخت خاں" اور "حضرت محل" کتابی صورت میں شائع ہو جائیں تو نہایت مفید ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی چیرمین شعبۂ عربی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی یہ بہت خوب ہوا کہ "کلیاتِ نظیر" کے مقابلے کا کام آپ نے مولوی عبدالشاہد خاں صاحب شروانی کو سپرد کر دیا۔ نول کشوری نسخہ جو میں نے بھیجا ہے اُس کے صفحہ ۱۵ (آغاز دیوانِ نظیر) سے صفحہ ۳۳ کے آخر (لطف کُن لطف کہ این بار برفتم رفتم) تک کا مقابلہ نہ کیا جائے اس لئے کہ غزلیات اور فارسی کلام کا شامل کرنا مقصود نہیں اور بھی بعض جگہ فارسی کلام آگیا ہے وہ بھی نظر انداز کر دیا جائے۔ اس طرح مطبع الٰہی والے مطبوعہ نسخے کے تیسرے اور چوتھے دیوان سے غرض ہے۔

"موتی کی لڑی" (جو ایک عربی رسالے کا ترجمہ ہے، ۱۳۲۷ھ میں کسی آگرہ کے مطبع میں چھپی تھی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کو لکھ کر دریافت کیجئے کہ آیا اس کتاب کا کوئی نسخہ قیمت سے یا مستعار مل سکتا ہے یا نہیں۔ مترجم کا نام منشی محمود سجاد حسین انجم گسمنڈوی ہے۔

خان بہادر میجر مرزا ابوجعفر صاحب کلکتہ چندے کے روپے کی کیا بات ہے وہ تو میں کل بھیج دوں۔ لیکن پھر اُس کے بعد آپ کی توجہ خاص کی توقع رکھنا ایک فعل عبث ہوگا۔ اس لئے تامل کرجانا ہی مصلحت ہے۔ دیکھیں آپ جیتیں گے یا یہ مخلص۔

کیا عجب ہے کہ اکتوبر۔ نومبر کے لگ بھگ میں علی گڑھ جاؤں۔ کیا آپ کے درشن بھی ہونگے؟ (بھینٹ پر موقوف ہے۔ مُدیر) نواب صاحب کی خدمت میں آداب تسلیمات۔

ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی پونہ آپ نے "کانفرنس اسلامک ریسرچ اکیڈیمی" کے بارے میں کچھ باتیں لکھی تھیں میری بہت بڑی خواہش ہے کہ علی گڑھ کے اسلامی ماحول میں آکر کچھ کام کردوں۔ آپ کے مصنف میں قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی کا مضمون دلی پر شائع ہوا تھا۔ اگر موصوف کا کوئی اور مضمون شائع ہو تو مجھے ضرور ارسال کیجئے۔ جناب قبلہ نواب صدر یار جنگ بہادر اور پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی کی خدمت میں سلام علیک۔

مولوی حمید علی صاحب دارالاشاعت پنجاب لاہور "پبلشرز یونائیٹڈ" یہ فرم ہم آٹھ پبلشرز نے مل کر بنائی ہے اور یہاں آٹھ اداروں کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں، باری باری سے ہر سال ایک پبلشر کے ہاتھ میں انتظام ہوتا ہے۔ اس سال شیخ محمد اشرف کے ہاتھ میں ہے۔ لاہور میں کتابوں کی مقامی بکری کا کام زیادہ تر اب اسی فرم کے ہاتھ میں ہے اور کامیاب تجربہ ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر علی گڑھ جولائی کا مصنف ابھی پڑھ کر رکھا ہے۔ اس مرتبہ طبع میں غلطیوں کی شدید کثرت ہے اس طرف توجہ کیجئے۔

صاحبزادہ ممتاز علی خاں بی۔ اے (علیگ) سہاور جولائی کا مصنف انتظار بسیار کے بعد ۲۴ر اگست کو موصول ہوا۔ آپ کی مجبوریوں کے علم نے انتظار کی تلخی کو دور کردیا۔ اس سلسلے میں آپ کی کاوشیں لائق صد ستائش ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف کو نکال کر آپ قوم اور زبان کی ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مصنف ۱۵ کے مضامین عمدہ اور پُر از معلومات ہیں لیکن ان میں سے بعض میں ذاتیات کا ذکر ہے! اور یہ بات فی زمانہ ناپسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ وقت کا اقتضا یہ ہے کہ سیاستِ حاضرہ معلوماتِ جدیدہ اور قومی زندگی سے متعلق موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جائے۔

منشی حبیب الرحمن عبدالجلیل لیس گوڈ والے آگرہ ہماری نظروں سے جناب کا رسالہ مصنف گزرا۔ بہت کامیاب پرچہ معلوم ہوا۔ اور آپ کی علمی۔ ادبی اور اخلاقی

خدمات لائقِ تحسین پائیں۔ یہ کسی قسم کی مصنوعی تعریف یا بناوٹ پر مبنی نہیں۔ ہمیں اشتیاق پیدا ہوا ہے کہ ہم بھی رسالے کے خریدار بن جائیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف جادوگر ہے لہٰذا اس کا علاج بھی کیجئے اور ماہ جولائی کا رسالہ فوراً بذریعہ وی پی بھیج دیجئے۔ یا آپ تحریر کریں تو منی آرڈر روانہ کر دیا جائے۔ پاکستان زندہ باد! مسلم لیگ زندہ باد!! شیرِ اسلام قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد!!!

ہو اور اسی سے ہم پر جادو کر دیا ہے۔

محمود بریلوی صاحب سابق سب ایڈیٹر بمبئی کرانیکل "مصنف" کے اپریل نمبر میں مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم منگلوری کی وفات حسرت آیات کی خبر پڑھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصوریٔ غم میں آپ کو مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ کیونکہ اُس شمارے میں بھی مرحوم کے لئے جو کچھ آپ نے لکھا وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ میں ان بزرگ مرحوم سے پہلی مرتبہ ان کی وفات سے چند ماہ قبل ملا تھا۔ وہی مرحوم سے میری آخری ملاقات بھی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ غالباً دسمبر ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ کے اسٹیشن پر بریلی آنے والی گاڑی کے سکنڈ کلاس میں آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اسی کمپارٹمنٹ میں مولانا مرحوم تشریف رکھتے تھے۔ جن سے ملنے کے لئے آپ اسٹیشن پر تشریف لائے تھے۔ آپ نے ہی میرا تعارف ممدوح مرحوم سے کرایا تھا۔ یہ سعادت مجھے آپ کی بدولت ہی نصیب ہوئی۔ بریلی تک موصوف مرحوم کا اور میرا ساتھ رہا۔ مرحوم نے میری تصانیف کے بارے میں مجھے بڑے مفید مشورے دئے تھے۔

"مصنف" کے موجودہ جولائی ۱۹۴۶ء نمبر میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدر آباد کا مقالہ "قدیم اردو (دکھنی) میں سیرت النّبی کا ذخیرہ" بہت مفید و پُر از معلومات مضمون ہے۔ موصوف ہندوستان کے اُن چند گنے چنے ادیبوں میں سے ہیں جن کا ہر مضمون اور مضمون کا ہر لفظ غور سے پڑھنے اور فائدہ اُٹھانے کے لائق ہوتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ "مصنف" کو مولوی صاحب موصوف ایسے لائق بزرگ کی قلمی اعانت حاصل ہے۔

اسی شمارے میں قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی رئیس جوناگڑھ کا قابل قدر مضمون۔ 'ولی گجراتی' نظر سے گزرا۔ جوناگڑھ (کاٹھیا واڑ) جیسے دُور افتادہ مقام میں رہ کر عربی و فارسی کا یہ عالم اور اُردو کا زبردست ادیب و شاعر جو عظیم الشان ٹھوس خدمت زبان و ادب کی کر رہا ہے وہ پنجاب اور یو۔ پی کے نام نہاد 'ادیبوں' کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ مجھے قاضی صاحب موصوف کی خدمت میں ذاتی نیازمندی کا شرف حاصل ہے ۱۹۳۹ء-۱۹۴۰ء میں جب کہ میں سید واڑہ جوناگڑھ میں مقیم تھا، قاضی صاحب ممدوح کی خدمت میں کئی بار حاضری دینے کی عزت نصیب ہوئی اور موصوف نے اپنی کئی تصانیف

مجھے عطا فرماکر — افتخار بخشا۔ غالباً قاضی صاحب اس ہیچ میرز کو بالکل بھول نہ گئے ہوں گے "مصنف" کے جنوری۔ اپریل اور جولائی کی "بزم مصنف" میں آپ کے دلچسپ خطوط پڑھے۔

"مصنف" کے اپریل ۱۹۶۴ء نمبر میں مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب کا مضمون "بحیرۂ روم میں اسلامی حکومت" میرے بڑے کام آیا۔ اپنی ضخیم زیر ترتیب تالیف "تاریخ اسلامیات عالم" میں اس سے استفادہ کروں گا۔ انشاء اللہ۔ اسی شمارے میں مفتی انتظام اللہ الشہابی صاحب اکبرآبادی کا "صہبائی" پر مقالہ خاصے کی چیز ہے۔ "میرٹ کوہ آبادی" پر بھی آپ کا جولائی نمبر میں مضمون نہایت بلند پایہ ہے۔ تاریخ زبان و ادب اردو میں مفتی صاحب ممدوح کی حیثیت سند کا مرتبہ رکھتی ہے۔ میں سالہا سال سے آپ کے مضامین سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ سید لطیف حسین ادیب بریلوی کا مقالہ "میر کی شاعری پر ایک عام نظر" اور ڈاکٹر سید شریف احمد چشتی کا مضمون "اسلامیان ہند کی تعلیمی ضروریات" دونوں بڑی دقت نظر سے لکھے گئے ہیں۔

اسی نمبر میں مولوی محمد خاں شہاب صاحب مالیر کوٹلوی مقیم بمبئی کا مراسلہ "بزم مصنف" کے ماتحت نظر سے گزرا۔ شہاب صاحب میرے دیرینہ کرمفرما ہیں اور آٹھ برس پہلے ہم دونوں ہمسایہ رہ چکے ہیں۔ اُس وقت موصوف اور میں دونوں "بزم ادب" بمبئی کے رکن تھے۔ جس میں میں نے اپنا مشہور مقالہ جس پر شیعہ پرچوں نے میری بڑی لے دے کی تھی۔ "شاہنامۂ فردوسی پر ایک منتقدانہ نظر" پڑھا تھا اور اُس زمانہ میں متعدد ماہناموں نے اسے نقل کیا تھا۔ "اودھ پنچ" لکھنؤ نے اس پر بڑی سخت نکتہ چینی کی تھی کیونکہ اس میں محمود بریلوی اور محمود غزنوی کی سازباز بیاں تھی۔

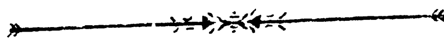
اب کہ میں سات ماہ سے بمبئی میں مقیم ہوں۔ آٹھ برس کی مسلسل غیر حاضری کے بعد بمبئی آیا ہوں۔ مصروفیت اوقات کا یہ عالم ہے کہ اس اثناء میں صرف ایک مرتبہ ٹیلیفون پر محبی پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کی خیر و عافیت معلوم کر سکا اور ایک مرتبہ جب میں ٹیکسی پر جا رہا تھا تو شہاب صاحب پیدل کسی طرف جاتے ہوئے میرے برابر سے گزر گئے۔ ملاقات و تجدید تعلقات کی ہنوز حسرت ہے۔ شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری مقیم لکھنؤ جوائنٹ سکریٹری "آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس" جن کا خط اپریل کی "بزم مصنف" میں شائع ہوا ہے۔ میرے دیرینہ عنایت فرما ہیں ۱۹۴۱-۴۲ء میں جب میں صوبۂ یو۔ پی کے لئے لکھنؤ میں "اورینٹ پریس" کا ایڈیٹر انچارج تھا تو موصوف ہی نے ابتداً میرے دفتر وغیرہ کے قیام کا انتظام کیا تھا اور ہمیشہ مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے رہے۔ قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی کی طرح میں نے بھی ممدوح کے اس فقرہ سے کہ "میں اور مولوی طفیل احمد صاحب۔ ولایت حسین صاحب اور خان بہادر

مولوی حسن احمد صاحب زبیری محبوب نگر دکن | مولانا طفیل احمد صاحب کی حالت آپ سے بالمشافہ معلوم ہو گئی تھی۔ بعد کو اخبارات کے ذریعہ ان کے انتقال کی کیفیت معلوم ہو کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے (آمین) یہاں کے ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول حیدرآباد کے رہنے والے ہیں ولایت کے تعلیم یافتہ اور علی گڑھ کے اولڈ بوائے۔ میرے پڑوسی اور ملاقاتی ہیں۔ پرسوں میں نے اُن سے اتفاقیہ طور پر یہ خواہش کی تھی کہ کوئی عمدہ کتاب مطالعہ کے لئے اپنے اسکول کے کتب خانہ سے میرے پاس بھیج دیں عجیب اتفاق دیکھئے کہ کل انھوں نے آپ کی مؤلفہ کتاب "حیات حافظ رحمت خاں" بھیجی۔ گو میں عرصہ ہوا اس کتاب کو دیکھ چکا ہوں۔ مگر وہ ایسی دلچسپ ہے کہ رات ہی سے میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ جب سے یہ کتاب میرے پاس آئی ہے اس نے آپ کی یاد کو اور تازہ کر دیا۔ کانفرنس کا اخبار اور کانفرنس سے متعلق لٹریچر نیز اپنی مصنفہ کتابیں بھیج دیجئے، ممنون ہوں گا۔ یہاں اور دوست مطالعہ کر سکیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کی کانفرنس کے ممبر بھی بن جائیں۔

مولانا لطف الرحمن صاحب ناظم ادارۂ ترجمان القرآن مالدہ بنگال | عرصہ سے خط و کتابت کا موقع نہیں ملا۔ جس کی وجہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ باوجود عادت سکون مجبوراً ہنگاموں میں کودنا پڑتا ہے۔ اب میں مالدہ میں سکون کے ساتھ کام کرنیکے لئے آ گیا ہوں۔ مدارجنٹ اسکیم پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا مطبوعہ تبصرہ ہمارے سکریٹری مولوی عبد المجید صاحب لے گئے اور ہنوز واپس نہیں آیا اس لئے بھیج دیجئے۔ اصل اسکیم باوجود طلب نہیں آئی اگر ممکن ہو قیمتاً منگوا کر وی۔ پی کرا دیجئے۔

اب پھر نئی حکومتیں بحال ہو گئی ہیں، بہار نے بنیادی تعلیم بغیر مذہبی تعلیم منظور کر لی، کانفرنس کو دوبارہ اپنی لائن پر کام کرنا چاہیئے، میں بھی ممکن خدمات دے سکتا ہوں۔

مولانا مرحوم سید طفیل احمد صاحب کی یاد بار بار ستاتی ہے۔ میں نے آپ کو تعزیتی خط لکھا تھا اور یہاں ایصال ثواب کا نظم بھی مدرسہ میں اور کلاس میں کیا تھا۔



تبصرے

(از سیدہ انیس ناظرہ بریلوی)

افکارِ امام غزالی کے چند بنیادی پہلو | زبان انگریزی۔ مصنف پروفیسر عزالدین صاحب ایم اے لیکچرر شعبۂ فلاسفی۔ شائع کردہ ارشاد بک ڈپو کانفرنس مارکٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ .... قیمت ۳؎

امام غزالی کی مسلمہ اہمیت اور زوالِ امت پر اُن کی اصلاحی تدابیر کا اثر ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ یونان کے خام فلسفہ کی اصلاح و تکمیل میں مسلمان مفکرین کی کامیاب سعی کی تاریخ بغیر غزالی کے تذکرے کے ممکن نہیں۔ زندگی کے وہ اہم مسائل جو غزالی کے وقت تک فلسفہ کے حدود سے باہر تھے اُن کی دانشمندانہ اور سلجھی ہوئی کوششوں نے اُن کا حل فلسفیانہ اصطلاحات میں دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ غزالی کا طریقہ آسان اور فطری ہے۔ وہ ایک سوال قائم کرتے ہیں اور پھر اُس کا اسلامی نقطۂ نظر سے فلسفیانہ اصطلاحات اور اصول کے لحاظ سے جواب دیتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنف نے بھی غزالی کے بعد اُلجھ جانے والے مسائل پر ویسے ہی سوالات قائم کرکے موجودہ فلسفہ کی روشنی میں خود غزالی کے نظریات اور حوالے سے اُن کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اُن کی کامیابی کا اعتراف علامہ اقبال۔ پروفیسر گرنکاؤ۔ ڈاکٹر اولیری۔ ڈاکٹر اسٹوری ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وغیرہ اور دوسرے اکابر نے بجا طور پر کیا ہے۔ کتاب کی خصوصیت عام فہم اور آسان طرزِ بیان ہے۔ اہم اور پیچیدہ مسائل کو کامیاب طریقے سے بیان کرنا اپنی جگہ پر خود ایک بڑی کامیابی ہے۔ اس کتاب کے گیارہ ابواب ہیں جن میں غزالی کے اُن نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو بچوں کی تربیت، حقیقتِ حقہ، رُویتِ باری تعالےٰ۔ آزادیٔ رائے، اصولِ اخلاق وغیرہ جیسے مسائل سے متعلق ہیں۔

عرب کا خود ایک بلند مرتبہ اور عظیم الشان تمدن تھا۔ لیکن قومیں جب گرتی ہیں تو نہ صرف اپنی عظمتِ دیرینہ سے بیگانہ ہو جاتی ہیں بلکہ ایک وقت وہ آتا ہے کہ اُن کو معمولی انسانیت سے بھی کوئی نسبت نہیں رہتی۔ مسلمات عقائد کی صورت میں اور اصول رسموں کے طور پر بگڑی ہوئی شکل میں رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ عرب کے تمدن کا کوئی نشان حضور سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونیکے

وقت باقی نہ رہا تھا۔ اسلام جب ایران میں پہونچ کر نور افروز ہوا تو تمام عالم کے تمدنوں سے ایک ایسا تصادم پیش آیا کہ جس کا احساس بہت عرصہ تک نہ ہو سکا۔ لیکن اُس کے اثرات خطرناک صورت میں اختیار کرتے گئے۔ چین کے طاؤسی عقائد۔ ہندوستان کے ویدانتی نظریات۔ مصریوں کے وجودی خیالات اور یونانیوں کے اُلجھے ہوئے فلسفے کا اسلام پر نرغہ ہوا۔ دراسلامی زندگی میں ایرانی تمدن اور مزدکی اور زرتشتی عقائد سرایت کرنا شروع ہو گئے۔ ابتداءً اسلامی مبلغین نے پرانی تعلیمات کو اصطلاحات غیر میں بیان کرنے کی کوشش مخاطبین کو سمجھانے کے لئے کی تھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اسلامی عقائد اور اصولوں کی جانچ کا معیار وہ چیز ٹھیری جسے غلطی سے فلسفۂ یونان کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک نیا فلسفہ تھا جو تمام عالم کے انسانی افکار سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ اور اصطلاحات کے معانی اور مطالب کی بنا نظریات پر ہوتی ہے اور خود نظریات اقدار کے تابع۔ دین برحق اقدار کے حقیقی تعین سے شروع ہوتا ہے اور اصولِ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا بہ تقید۔ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ أَمْرِهٖ اس پر حاوی ہے۔ ابنائے ملت اسلامیہ نے انسان کے مقرر کئے ہوئے معیاروں کے چکر میں اپنے بنیادی اصولوں سے دوری کو محسوس نہیں کیا اور بتدریج صورت ایسی پیدا ہو گئی کہ قرآن کو معیار قرار دے کر جو کہ صداقتِ کبریٰ ہے زندگی کے تمام اصولوں کو جانچنے کی عادت نہ رہی۔ یہ کام کرنے کا سہرا حضرت امام غزالی کے سر ہے۔ اور زمانہ حال میں اس اقدار بازی کے طومار اور مصطلحات بے محابا کے طوفانِ تخلیق کے علاوہ بھی خود زندگی کا جو نہج ہے اُس کے مبنیِ نظر ایک صحیح اور بے لوث محاکمہ کی ضرورت ہر طرف محسوس کی جا رہی ہے تاکہ بنی نوعِ انسان کے لئے ایک مشترک اور اثباتی نظام عالم ممکن ہو سکے۔

اس حیثیت سے بھی پروفیسر عمر الدین صاحب کی یہ کتاب ایک برمحل اور مفید خدمت ہے جو واضح طور پر ایک نئی راہ کی طرف رہبری کرتی ہے۔ ارشاد بک ڈپو کے مالک سید ارشاد علی صاحب اپنی اس اولوالعزمی پر لائق مبارکباد ہیں کہ اسلامیات پر انگریزی زبان میں عمدہ اور معیاری کتابیں شائع کرنے کا انھوں نے اس کتاب کی اشاعت سے مبارک اقدام کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دارالعلوم علی گڑھ اور بیرونجات کے معارف پرور بزرگ اُن کی ہر ممکن طریقہ سے ہمت افزائی کریں گے تاکہ وہ جلد از جلد علی گڑھ کے "شیخ محمد اشرف" ہو جائیں اور اساتذہ مسلم یونیورسٹی کی بکثرت علمی و تحقیقی کاوشیں جو عرصہ سے تشنۂ طباعت ہیں ان کے ذریعہ باسانی اور پُر منافع طریقہ پر منظر عام پر آ سکیں۔

تقویۃ الایمان | مصنفہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید صاحب رح شائع کردہ اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل۔ تاجپورہ لاہور

حضرت سید احمد صاحب شہید رائے بریلوی اور اُن کے دست راست حضرت اسمٰعیل شہید کی بیاسی تصانیف کی طرح مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی کتابیں بھی عرصہ دراز تک مسلمانوں کی عدم توجہی کا شکار ہیں اور یہ نتیجہ تھا اُس غلط انگریزی پروپگنڈے کا جو بعض علماء سوء کے ذریعہ عرصۂ دراز تک ہندوستان میں سید صاحب اور اُن کی انقلابی تحریک کے خلاف ہوتا رہا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ تشدد اور دار و گیر کے مذموم طریقے بھی اختیار کئے گئے۔ اگر کسی جماعت یا فرد پر تحریک "وہابیہ" سے وابستہ ہونیکا ادنیٰ سا شبہ ہوتا تو اُس کو گورنمنٹ کے لرزہ براندام مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑتا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخری ثلث ربع میں سید صاحب کے عقائد سے ہمدردی اور اُن سے محبت کرنے کی پاداش میں سینکڑوں مسلمان پھانسیوں پر لٹکائے گئے۔ ہزاروں کو سزائے قید ہوئی۔ بکثرت جائدادیں ضبط ہوئیں اور کالے پانی بھیجے گئے۔ جو خاص انہی کے لئے کھولا گیا تھا کیونکہ بعض حکامِ انگریزی کا خیال تھا کہ بعض پھانسی کی سزا مجرموں کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ وہ اُس کو خوشی خوشی قبول کرتے ہیں۔

ان حالات میں سید احمد صاحب شہید۔ حضرت اسمٰعیل شہید اور اُن کے دوسرے رفقاء کار کا منظرِ عام پر لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔

خدا بہشت نصیب کرے مولانا جعفر تھانیسری مرحوم کو کہ اُنھوں نے ایام اسیری انڈمان ہی میں تذکرہ بالا مجاہدین اسلام کے حالات اور اُن کی تصانیف کا تذکرہ اپنی کتاب "تاریخ عجیب" الموسوم "کالاپانی" میں قلم بند کئے جو حوادثِ روزگار کے سینکڑوں تھپیڑوں کے باوجود ہم تک پہونچ بھی گئے۔ لیکن عرصہ تک اُن پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ سب سے پہلے مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم مغفور نے قفلِ خموشی کو توڑا اور مذکورہ کتاب سے استفادہ کرنے کے بعد تحریک "وہابیہ" کے بانی اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید صاحب کے حالات سے موجودہ عہد کے مسلمانوں کو روشناس کرایا۔ مولانا مرحوم کی کتاب "روشن مستقبل" نے بانگِ جرس کا کام دیا اور اب اکثر مشہور اہلِ قلم حضرات کی اس موضوع پر توجہ ہے۔ سید صاحب اور شاہ صاحب کے سوانحات اور اُن کی بیش قیمت تصانیف کے اردو تراجم شائع ہو رہے ہیں۔

پیش نظر کتاب بھی شاہ اسمٰعیل شہید صاحب کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ ہے جس میں مولانا غلام رسول صاحب مہر ایڈیٹر انقلاب لاہور کا مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔ کتاب مذکور کے بارے میں مولانا مہر لکھتے ہیں:-

"شاہ شہید کی تصنیفات میں سب سے زیادہ "تقویت الایمان" مقبول ہوئی۔ اور سو سال کی مدت میں

اس کتاب نے اصلاحِ عقائد کا نہایت اہم کام انجام دیا۔"

کتاب کے پہلے باب میں توحید کی تعریف اور شرک کی مذمت کی گئی ہے۔ دو باب اتباعِ سنت اور بدعت کی برائی میں ہیں۔ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس اردو میں کیا گیا ہے۔

سلکِ گوہر | از میکش بدایونی۔ قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ :-
فرینڈس بک ہاؤس۔ رسل گنج علی گڑھ

یہ مختصر کتاب جناب میکش کی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کہنہ مشق بزرگوں کی سی متانت اور سنجیدگی دیکھ کر مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ ان کو ستارِ ثانی کا خطاب دینے کو جی چاہتا ہے۔ جوانی دیوانی مشہور ہے اور پھر شاعری کی دنیا میں تو گویا سب کچھ معاف ہے۔ اکثر شاعر پیر فرتوت ہو کر بھی جب کہ کھانے اور دکھانے تک کے دانت ٹوٹ جاتے ہیں۔ لہک لہک کر ایسی بھیانک آواز میں ایسے ایسے حیا سوز جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ نوجوانوں کا شرم سے منہ چھپا لینے کو جی چاہتا ہے۔ میکش صاحب لائق مبارکباد ہیں کہ اس روشِ عام سے ہٹ کر فکرِ سخن کرتے ہیں۔ خدا ہمارے دوسرے نوجوان شعراء کو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

نہ پوچھ وحشتِ شب ہائے بیکسی ہمدم | کہ ہر نفس مجھے جینا وبال ہوتا ہے
کبھی نشاطِ گزشتہ کو یاد کرتا ہوں | کبھی فراق سے دل کو ملال ہوتا ہے

چند شعر یہ ہیں:-

سوزِ غمِ پنہاں کو دبا لیتا ہوں | خلوت میں کبھی اشک بہا لیتا ہوں
جب آہ لبوں پہ مرے آ جاتی ہے | اشعار کے پردے سے چھپا لیتا ہوں

جہانِ آرزو | از حضرت آرزو لکھنوی۔
شائع کردہ "نفیس اکیڈیمی" عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

حضرت آرزو لکھنوی عرف منجھو صاحب حضرت جلال کے شاگرد اور جانشین ہیں۔ جلال اور ان کے شاگردوں بالخصوص آرزو کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عربی اور فارسی کے الفاظ اور ایسے الفاظ جن میں اضافتیں ہوں کم سے کم لاتے ہیں۔ عوام کے لئے ٹھیٹ اردو اور چلن سار الفاظ کو سہل تر بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ متروکات سے اجتناب کا سلسلہ ناسخ سے شروع ہوا۔ جلال نے تکمیل کی بلکہ انھوں نے بعض متروکات خود تجویز کئے۔ مثلاً "پہ" چھوڑا اور "پر" استعمال کیا اور

اب وہ عام طور پر مستعمل ہے۔

صحتِ الفاظ کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے حتیٰ کہ اس میں افراط و تفریط ہو گئی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ خاص اُن زبانوں کے تلفظ میں لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً "لال ٹین" کو "لیٹن ٹرن" لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ صورت پسندیدہ نہیں ہے اور کانوں کو اُسی طرح گراں گزرتی ہے جس طرح حیدر آباد میں دسمبر کو "ڈسمبر" اور مدراس میں "جج" کو "جڈج" بولتے ہیں۔ پیش نظر مجموعۂ کلام آرزو صاحب کی کہنہ مشقی کا آئینہ دار ہے پختگی زیادہ اور آمد روانی بھی ہے اور جہاں تک سوز و گداز کا تعلق ہے اُن کی غزلوں میں ذوق کا سا رنگ نظر آتا ہے۔ مجموعۂ کلام دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے اور اس کی اشاعت سے ہمارے سرمایۂ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

رسالہ نئی زندگی الٰہ آباد ایڈیٹر سید انیس الرحمن صاحب زیر اہتمام سید حبیب الرحمن صاحب ہر ماہ نہایت پابندی کے ساتھ دیدہ زیب لکھائی چھپائی اور کاغذ پر شائع ہوتا ہے کچھ عرصہ سے خوبصورت تصاویر کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس رسالے کا شمار چوٹی کے ماہانہ جرائد میں ہے اور ملک کے اونچے سے اونچے طبقہ میں اسے سندِ قبول حاصل ہے۔ مضامین اکثر مستند اہل الرائے لکھتے ہیں۔

"انڈین ریویو" اور "ماڈرن ریویو" کے معیار کے ایک رسالہ کی عرصہ دراز سے اردو زبان میں ضرورت ہے تاکہ اُس میں اہم سیاسی۔ معاشی۔ تمدنی اور تاریخی مسائل پر سنجیدگی، متانت اور بے لوث طریقے پر خالص علمی نقطۂ نظر سے مضامین لکھے اور شائع کئے جائیں۔ رسالہ نئی زندگی الٰہ آباد غالباً مالی وسائل کی کمی کے باعث ابھی اس معیار تک تو نہیں پہونچا ہے لیکن اُس کی روز افزوں ترقی اُمید دلاتی ہے کہ اب نہیں تو مستقبل قریب میں وہ ہماری مندرجۂ بالا توقع کو شاید پورا کرنے میں کامیاب ہوگا۔ سید انیس الرحمن صاحب اور اُن کے بھائی حبیب الرحمن صاحب ان تھک کوشش کر رہے ہیں اور اُن کی کوششیں انشاء اللہ ضرور بارآور ہوں گی بشرطیکہ جنبہ داری کی عینک اُتار کر وہ اپنے نقطۂ نظر کو خالص علمی بنالیں۔

مطلق العنان حکومت اور سامراجی شاہی تیزی کے ساتھ ہمارے ملک میں ختم ہو رہی ہے۔ اختیاراتِ حکومت عوام اور اُن کے نمایندوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہے ہیں اور ملک و قوم کی نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ عوام حاصل شدہ اختیارات کا جائز استعمال جانیں اور یہی نہیں اس کے لئے عام لازمی تعلیم اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور دستوری مصطلحات اور مسائل پر اُن کو پورا پورا واقف ہونا ضروری ہے ورنہ خود غرض لوگ اُن کی عدم واقفیت اور عدم احساس سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ملک میں پہلے سے بھی بدتر صورت

حال پیدا کر دیں گے۔ حکومت کی مشین چلانے کے لئے دردمند، ایثار پیشہ اور مخلص کارکنوں کو اُبھرنے کا موقع نہ ملے گا اور وہی لوگ جو بڑے بڑے خطابات اور اعزازات کے طرّے وکلغیاں لگا کر غیر ملکی حکومت کے معاون و مددگار تھے، کھدر پوش ہو کر پاجامہ و عمامہ زیب تن کر کے بمصداق

"آستیں میں دشنہ پنہاں"

ثابت ہوں گے۔ ابھی تک ہمارے ملک میں ایسا لٹریچر جس سے یہ معلوم ہو کہ ووٹ کیا چیز ہے اُس کے استعمال کرنے والوں کی کیا ذمہ داری ہے۔ مجالس قانون ساز اور کیبنٹ کس کس قسم کی ہوتی ہیں اور اُن کی مختلف اقسام کی کیا مضرتیں یا فوائد ہیں۔ دستوری طرز حکمرانی میں دنیا کی دوسری اقوام وملل کے مقابلے میں ہندوستان کا کیا درجہ ہے۔ کتنی منزلیں طے ہو گئیں اور کتنی طے ہونی باقی ہیں۔ عوام اور رائے دہندوں کے اس خصوص میں کیا فرائض واختیارات اور ذمہ داریاں ہیں۔ اخبارات ورسائل اور سستی کتابوں کے ذریعہ ایسے لٹریچر کی بکثرت اشاعت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ تاکہ اُن کے مطالعہ سے عوام میں خاطر خواہ سیاسی احساس وبیداری پیدا ہو۔

رسالہ "نئی زندگی" اس قسم کی پہلی کوشش ہے اور اُس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اشاعت پذیر ہو کر عوام اور خواص کے ہاتھ میں پہونچنا چاہئے۔

مقالاتِ اسلامیہ وشرقیہ اسٹڈیز اسلامک اینڈ اورینٹل (بزبان انگریزی) ناشر شیخ محمد اشرف صاحب لاہور۔ مصنفہ جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی۔

یہ وہی کتاب ہے جس کے اشاعت پذیر ہونے کی خوشخبری مصنف بابتہ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں دی گئی تھی اور جس کی رائیلٹی میں فاضل مصنف کو کتاب کے صرف پانچ نسخے دئے جانے پر احتجاج کیا گیا تھا۔ جناب قاضی صاحب کی مہربانی سے کتاب ہاتھ میں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ وہ ۳۴۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور خان بہادر پروفیسر محمد شفیع ایم اے (کیمبرج) لاہور کا اس پر عالمانہ مقدمہ ہے۔ بہترین ٹائپ، کاغذ، جلد۔ اور گرد پوش سے اُسے مزین کیا گیا ہے۔ آخر میں نہایت محنت وکاوش کے ساتھ اشاریئے شامل کئے گئے ہیں۔

قاضی احمد میاں اختر ملک کے بلند پایہ عالم محقق اور ادیب وشاعر ہیں اور ریاست جوناگڑھ کے ایک قدیم قاضی خاندان کے فرد۔ ان کے بزرگ تقریباً تین سو سال پہلے سندھ سے جوناگڑھ منتقل ہوئے تھے اور عہدِ مغلیہ میں اُن کو ایک شاہی جاگیر عطا ہوئی تھی جو اب تک قاضی صاحب اور اُن کے اہل خاندان کے ہاتھوں میں محفوظ وموجود ہے۔ مالی فراغت حاصل ہونے کا موصوف نے بہترین مصرف

یہ کیا کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور مخدومی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کی طرح اپنے اوقاتِ عزیز کو تمام تر علمی اور قومی کاموں کے لئے وقف کر دیا۔ آپ کی دس بارہ قیمتی تصانیف اور مجموعۂ کلام اس سے پہلے چھپ چکے ہیں اور سندِ قبول حاصل کر چکے ہیں۔ بکثرت علمی و تحقیقی مقالات ان کے علاوہ ہیں جو ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب قاضی صاحب کے دس مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب رسوائے عالم۔ ریسرچ کے معیار سے بہت بلند اور ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ زبان سلیس اور عام فہم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ علمی ہے۔ پوری کتاب میں شروع سے آخر تک زبان کی صرف ایک غلطی صفحہ ۵ پانچ سطر ۱۲ اکیس پر نظر آئی جہاں "پڑھ کر دم کرنے" کے لئے Chanted کا غیر اسلامی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور جو منتر پڑھنے کے لئے عام طور پر مستعمل ہے۔ کتاب کا ہر مقام اپنی جگہ پر مکمل اور محقق ہے۔ اہلِ یورپ نے مشرقی اور بالخصوص اسلامی شعبہ جات میں ریسرچ کو اس درجہ مضحکہ خیز اور رنجدہ بنا دیا ہے کہ اس لفظ پر کسی مزاح نگار کا توجہ نہ کرنا تعجب خیز ہے۔ لیکن جن مسائل پر اختر صاحب نے قلم اٹھایا ہے ان کی اہمیت مسلّم اور اُن کے اب تک نظر انداز کئے جانے پر تعجب ہے۔ اس لئے کہ اُن میں سے ہر ایک اچھوتا تاریخی پس منظر پیش کرتا ہے اور ہمارے تمدن اور شکوہِ ملی کا آئینہ دار ہے۔ مسلمان دنیا میں علم و ادب تہذیب و ترقی کے گہوارۂ جنبان اور امن و عافیت کے علمبردار رہے ہیں ان کے پرچمِ عروج کے سائے میں قوموں نے سکون و عافیت کے ساتھ جو ترقی کی ہے اس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ہے۔ ایک "وراقت" ہی کو لیجئے (مقالات ۱ و ۹ مشمولہ کتاب ہذا) کہ عہدِ عباسیہ میں اس فن کو کیسی کچھ وسعت حاصل تھی۔ کاغذ سازی۔ کتابت۔ جلد بندی اور دوسرے لوازمات اشاعت وغیرہ سے اُس عہد کے تمدن اور ذوقِ علمی کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

مقالہ ۲۔ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے یقیناً اہم ترین پہلو ان کی چالیس سالہ سیاحی ہے ؎

چہل سال خواندم چہل سال سیر
چہل سال تعلیم کردیم غیر

اور اس سیاحت میں "سومناتھ" کے سفر کو خاص اہمیت اس وجہ سے حاصل ہے۔ کہ ہندوستان میں نہ صرف مذہبی آزادی کا اس سے ثبوت ملتا ہے بلکہ مصر۔ یونان۔ بابل اور کلدان کی تہذیبوں کا ہندوستان پر اثر بھی ثابت ہوتا ہے۔ نیز خود شیخ سعدی کا ذوقِ تحقیق و شوقِ سفر اور دلیری اس

واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔ ہاتھی دانت کے بُت ہندوستان میں بودھ مت اور جین دھرم کے اثر سے یقیناً برباد کیئے جا چکے ہوں گے اور یہ بت جو شیخ نے سومنات میں دیکھا تھا کوئی تازہ شاہکار ہوگا۔ جو مصر و یونان کے اُن ماہرینِ فن کے اثرات کا پر تو معلوم ہوتا ہے۔ جن سے ہندوستان یقیناً غور ث اور دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے متاثر ہوا۔ قاضی صاحب نے اس باب میں جو کچھ تحقیق فرمائی ہے وہ اہلِ یورپ اور ان کے متبعین کی لغوتیوں کی مناسب اصلاح ہے۔ اور اُس سے شیخ کا ہندوستان تشریف لانا پوری طرح ثابت ہوتا ہے۔

مقالہ ۳۔ شیخ الرئیس بو علی سینا ہندوستان میں زیادہ تر طبیب کی حیثیت سے معروف اور روشناس ہیں اور اسی طرح عمر خیام انگریزی خوانوں میں اپنی رباعیات کے غلط سلط ترجموں اور ہوسناک مضامین اور ہلکی سی دہریت کے لئے مشہور ہیں۔ قاضی احمد میاں صاحب اختر نے شیخ الرئیس کے عربی رسالہ کا عمر خیام کا کیا ہوا ترجمہ اور اُس پر اپنی محققانہ رائے قلمبند فرما کر ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ اس مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ عمر خیام ایک عقیدتمند مسلمان تھے اور اُنھیں مسائل الہیات پر پورا عبور تھا۔ جن کو وہ اتنی فصاحت و سلاست کے ساتھ اپنے ترجمہ میں پیش کر سکے۔ اصل عربی مضمون اور اس کا فارسی ترجمہ اس مقالہ کے ساتھ شامل ہے۔

مقالہ ۴۔ حضرت شمس تبریزی جو مولانا روم کے مرشد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لایعنی واہ ناتمدوں اور ہرزہ گو معترضین کے نرغہ سے اس مقالے میں نہایت دیانت کے ساتھ نکالے گئے ہیں۔ اور اُن کا اسمٰعیلی نہ ہونا پوری تحقیق کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ کسی دن ہمارے قاضی صاحب کو حضرت شمس تبریز کے فلسفے پر بھی قلم اُٹھانا پڑے گا اور

> او شیخ نبود و من بودم خرانہ نبود و من بودم
> او شیخ نبود و من بودم من عاشق دیرینہ ام

جیسی دلچسپ پہیلیوں کو حل کر کے ان کے متعلق از خود رفتگی یا دیدانیت کا الزام دُور کرنا ہوگا۔

مقالہ ۵۔ حافظ کی عربی شاعری اپنی ندرت اور دقتِ نظر کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اگر یہ عام عقیدہ صحیح ہے کہ حافظ اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور نہ تھے تو عربی پر ان کی یہ قدرت عام تعلیمی فراخی ترقی اور اس کی گہرائی کا بین ثبوت ہے کہ وہ بے تکلف عربی زبان میں نہایت مکمل شعر اور مصرعے موزوں کر سکتے تھے۔ اور اس سے اس تمدن کی عظمت کا پتہ چلتا ہے جس نے عالم کو حیاتِ تازہ بخشی

مقالہ ۶۔ شہر آشوب ہند۔ کسی نے ایک باغی کا بُت دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ایک زندہ قوم ہے

جس نے اپنے لوٹیرے کو ہیرو بنا دیا ہے اور ایک ہماری قوم ہے کہ اس نے محمود غزنوی جیسے مجاہد کو لیٹرا ثابت کر دکھایا۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا سلوک ان کے ناقدین اور معترضین دونوں نے کیا ہے ؎

گر وہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب

رسم امید ہمانا زجہاں برخیزد

ایک آدھ چھوٹا سا ٹریکٹ کوئی ڈرادنا سا مضمون جو کسی حد تک ان کی تائید میں نکلا وہ ایک حلقہ تک محدود رہا اور فی الجملہ حضرت عالمگیر کے کارنامے ان کی ذاتی شخصیت اور کیرکٹر کی عظمت نیز ملک اور بنی نوع پر احسان عظیم کی سچی تعریف باوجود زمانہ حاضرہ میں مکمل اور کاغذائی ثبوت کے ابتک پردۂ اخفاء میں ہے۔ "بہشتی کا شہر آشوب" بھی ستم ہائے عزیزاں میں سے ایک ہے۔ بہشتی سلطان مراد کا نمک خوار اور حلیف تھا۔ اور جو کچھ بھی اس نے لکھا ہے اِس سے قطع نظر اس کی تاریخی حیثیت قاضی صاحب کی محققانہ نظر میں بجا طور پر اہم ہے اور اسی لحاظ سے انھوں نے اس پر مقالہ لکھا ہے۔ اس مثنوی سے نہ صرف اُس وقت کی انتظامی بدحالی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ دیانت اور سیاست کے اس فقدان کا بھی ثبوت ملتا ہے جو سپاہ کی بیدلی اور مراد کی شکست کا باعث ہوئی۔

اس نظم میں حضرت عالمگیر کے بلند اخلاق کا اعتراف جو یقیناً ان کے یا ان کے طرفداروں کو خوش کرنے کے لئے نہیں کیا گیا ان کی عظمت کا ایک قطعی اور حتمی ثبوت ہے۔

"عربوں کے یورپین نام سیر سین" کی تحقیق مقالہ ۸۔ المادردی کی زندگی پر ایک نظر ۹۔ اور "دتاریخ گجرات کے عربی ماخذ" یہ مضمون اردو زبان میں مصنف میں شائع ہو چکا ہے) بھی بہت بلند پایہ مضامین ہیں جن میں کافی چھان بین سے کام لیا گیا ہے۔

کتاب فی الجملہ اس عہد کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کا حق رکھتی ہے اور اس کا ایک اردو ایڈیشن جلد سے جلد شائع ہونا ضروری ہے۔ تاکہ جو لوگ انگریزی سے واقف نہیں ہیں یا اتنی قیمتی کتابیں نہیں خرید سکتے وہ بھی اس سے بہرہ ور ہو سکیں۔

غدر پارٹی کے انقلابی یہ ایک چھوٹی سی پچاس صفحات کی کتاب ہے۔ قومی دارالاشاعت ہال روڈ لاہور نے شائع کی اور ۸ر قیمت ہے۔ بقول ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر بہار فی زمانا ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں سب سے کم لٹریچر مسلم لیگ، اور سب سے زیادہ کمیونسٹ پارٹی شائع کر رہی ہے۔ پارٹی مذکور کی لاتعداد چھاپی ہوئی کتابوں میں سے ایک یہ کتاب بھی ہے۔

قومی تحریکات کے زاویے وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہماری تمامتر سیاسی جدوجہد "ہوم رول" کے محور کے گرد گھومتی تھی اور چکبست آنجہانی نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا۔ ع

نہ لیں بہشت بھی ہم 'ہوم رول' کے بدلے

لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ قومی نصب العین اور مطالبہ مضحکہ خیز سمجھا جانے لگا۔ اور مکمل آزادی خواہ ایک ہندوستان کی ہو یا دو ہندوستانوں کی ہمارا مطمح نظر بن گیا۔ قومی کارکنوں کی ذہنیت بھی بدل گئی اور جیسا کہ آٹھ دس سال ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا تھا آج کے انتہا پسند کل کے اعتدال پسند اور کل کے اعتدال پسند اس سے آگے والے کل کے انتہا پسند ہو جائیں گے۔ چنانچہ کسے خبر تھی کہ خود پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے انتہا پسند آج حلف وفاداری شہنشاہ برطانیہ اٹھا کر حکومت کی کرسی پر براجمان ہو جائیں گے اور سر فیروز خاں نون جیسے خالص سرکاری آدمی خطابات ترک کر کے دعوت جہاد دیں گے۔

تقسیم بنگال کے وقت سے ہمارے ملک میں ایک تشدد پسند انقلابی جماعت چلی آ رہی ہے۔ اس جماعت کے گروہ در گروہ گولیوں کا نشانہ بن چکے۔ پھانسی کے تختوں پر لٹک چکے۔ کالے پانی کی ہولناک سزا بھگت چکے اور بکثرت ہندوستانی جیلوں کی کال کوٹھریوں میں عمریں گزار چکے، یا گزار رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کے حالات اور لرزہ براندام مصائب کی داستانیں پردۂ خفا میں ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب نے ان میں سے کچھ لوگوں کے حالات پر سے جو "غدر پارٹی" کے نام سے موسوم تھے، تاریکی کا پردہ اٹھایا ہے اور غالباً پہلی مرتبہ مسٹر رندھیر سنگھ کی زبانی اہل ملک کو شہیدانِ وطن کی قربانیوں کا علم ہوگا۔ کتاب کا خلاصہ بیان کر کے ہم اصل کتاب کے اشتیاق کو کم کرنا نہیں چاہتے صرف اس قدر عرض کریں گے کہ کتاب قابل مطالعہ ہے اور اس کو ضرور پڑھا جائے۔

بھگت سنگھ اور انکے ساتھی ایک قومی دارالاشاعت MCA بلڈنگ لاہور کی شائع کردہ ہے قیمت ہے حجم ۱۷۸ صفحات یہ کتاب بھی کمیونسٹ لٹریچر کی ایک کڑی ہے۔ بھگت سنگھ اور اُن کے حالات سے ہمارے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔ کتاب کے مصنف اپنے گھوش اُن کے ساتھیوں میں سے ایک ہیں جو عمر قید کی سزا بھگت چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیڈر بھگت سنگھ اور دوسرے ساتھی چندر شیکھر آزاد، کشوری لال، شیو ورما، جئے دیو اور ڈاکٹر گیا پرشاد کی گرفتاری اور سزا سے پہلے کے حالات مقدمہ کی مفصل کیفیت اور پھر بعد سزا یابی مصائب و تکالیف کی داستانیں نہایت پُر اثر طریقے سے بیان کی ہیں۔ اس کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد بغیر ختم کئے چھوڑنا ناممکن ہے۔ زبان صاف اور سلیس اور بیان میں تعجب انگیز روانی و تسلسل ہے۔

(انیس فاطمہ)

یادگارِ شاہد!

سید شاہد علی کے اچانک حادثۂ ارتحال پر نینی تال میں جہاں اُس کا ۲۸ جون ۱۹۴۶ء کو انتقال ہوا میرے وطن بریلی میں جہاں اسے سپردِ خاک کیا گیا۔ اور علی گڑھ میں جہاں ہم لوگ رہتے ہیں بکثرت عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں نے بالمشافہ اظہارِ ہمدردی کر کے میری اور میری رفیقۂ حیات کی جس درجہ دل نوازی کی اس کے لئے ہم لوگ بدل شکر گزار ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مصیبت کے وقت مخلصوں کی سچی ہمدردی ہی سب سے زیادہ وجہ تسکین ہوا کرتی ہے اور اس خصوص میں میں خاصا خوش نصیب ہوں۔ بالمشافہ ہمدردیوں کے علاوہ بہت سے پیغامات ہمدردی بذریعۂ ڈاک بھی موصول ہوئے جن کے حتی الامکان جوابات لکھنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہونے لگا تو جوابات کا یہ سلسلہ جاری رکھنا اپنے موجودہ حالات میں میری قوت سے باہر ہو گیا۔ اب میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مصنف کے ذریعے شکر ادا کروں۔

خطوط تعزیت اور پیغامات ہمدردی کے مطالعہ سے مجھے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوا (کیونکہ اس سے پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا) کہ ان کے لکھنے کا بھی ایک خاص سلیقہ اور ڈھنگ ہوا کرتا ہے۔ اور جس شخص میں جس قدر زیادہ اثر تحریر کی قابلیت، دردمندی، خلوص اور فلسفۂ حیات و ممات سے واقفیت ہوتی ہے۔ اتنی ہی اس کی تحریر زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے۔ اصنافِ ادب میں مرثیہ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ کیوں نہ خطوطِ تعزیت کو بھی جو بالعموم نظم کے بجائے نثر میں ہوتے ہیں ہمارے ادب میں ایک نمایاں جگہ دی جائے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر جس قدر خطوط اس موقع پر مجھے موصول ہوئے ہیں اور جن میں کسی نہ کسی اعتبار سے کوئی خاص بات یا عبرت و موعظت کا پہلو ہو۔ انھیں چھاپ کر محفوظ کر دینا میرے لئے ناگزیر ہو گیا۔

ویسے بھی صاحبِ استطاعت حضرات اُن لوگوں کی جو انھیں دل سے عزیز ہوتے ہیں بڑی بڑی مادی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ تاج محل، بڑے بڑے دوسرے عالیشان مقبرے، پُل، سرائیں، اسکول اور کالج وغیرہ اسی جذبات کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ ایک غیر مستطیع شاعر، ادیب، مصنف یا اخبار نویس اگر کسی اپنی محبوب ہستی کو کھو بیٹھتا ہے تو وہ مندرجہ بالا قسم کی تو کوئی یادگار بنا نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہے کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے صفحۂ قرطاس پر کچھ نقوش چھوڑ جائے۔

میں بھی شاہد جیسے ہونہار اور صلاحیت رکھنے والے اپنے عزیز ترین بیٹے کی ایک قلمی یادگار بناتا ہوں جو ناظرین مصنف آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے ع

نوشتہ بماند سیہ بر سپید

سید الطاف علی بریلوی

وفاتِ شاہد

(ایک نامعلوم دوست کا ہدیۂ اخلاص!)

(۱)

بہ ریعانِ شباب افسوس شاہد را اجل آمد
بہ الطاف علی درد و ملالِ جاں گسل آمد
بہ سلکِ سال، فکرم قطرہ ہائے اشکِ خوں سُفتہ
وفاتِ سیدِ شاہد علی جاں کاہ شد گفتہ
۱۳۶۵ھ

(۲)

الطاف سے کیا پوچھئے کیا حالت ہے
کیوں کر گئی اک آن میں جانِ شاہد
شاہد ہے کہاں ڈھونڈھئے اُس کو کس جا
بس قلب کا ہے داغ نشانِ شاہد

(۳)

اک دوست کا تھا بیٹا جو سولھویں برس میں
وابستہ اُس کے دم سے گھر بھر کی تھی مسرّت
علم و ادب کا شائق، طبّاع، ذہین، قابل
اطوار تھے حمیدہ، صالح تھی اُس کی فطرت
اُس پر اجل نے ناگہ حملہ کیا غضب کا
ماں باپ رہ گئے ہیں تکتے ہوئے ہی صورت
ہر شخص کو ہے مرنا، اِس سے مفر کہاں ہے
پھر موت نوجواں کی، حسرت ہزار حسرت
تاریخ و مرثیہ کیا، لوحِ مزار پر تم
لکھ دو یہ ایک فقرہ "شاہد کی پاک تربت"
۱۳۶۵ھ



سید شاہد علی بریلوی

وداعِ دوست!

(از حضرت علامہ کیفی چریا کوٹی)

وداعِ دوست، آساں، مرگ مشکل
مگر ہر سانس کی سُولی پہ ہے دِل

ہوئی ہے موجِ دریا کی روانہ
ٹپکتا رہ گیا سر اپنا ساحل

غبارِ خاکِ مجنوں بھی تو آلے
ٹھیراؤ ساربان ہاں روک محمل

چمن سے ٹوٹ کر زیبِ گلو ہے
سُنے گُل کس طرح شورِ عنادل

ارے او دُوریٔ راہِ نظارہ
نگاہوں کو بھی ہو جانے دے شامل

جُدائی اور پھر شامِ جدائی
دُہائی ہے تری اے ماہِ کامل

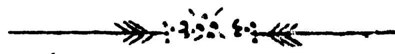
مدد ہاں المدد اے تابِ دیدار
چلا آیا تڑپ کر آنکھ میں دِل

مُبارک باد مرگِ منتظر کو
نہیں ہے زندگی جینے کے قابل

اندھیری شب ہے پروانے کدھر جائیں
اُٹھا لی کس نے آ کر شمعِ محفل

سمجھ میں اپنی کیفی آ رہا ہے
یہ ہی ہے مرگِ مہجوری کا حاصل

تن از ہمراہی او ماند محروم
مگر جاں میرود منزل بہ منزل



تعزیت نامے!

شاہد مرحوم کے ساتھ دس دن
از سید مصطفےٰ علی بریلوی

ہم ۲۰ جون کو "گھٹیا پہاڑ" آئے۔ صبح ہی صبح دیکھا ایک خوبصورت، نازک اندام، دُبلا پتلا لیکن پھرتیلا لڑکا چلا آرہا ہے۔ آتے ہی ایک دم سب کی خیریت نام بنام دریافت کر ڈالی۔ میں نے کہا بیٹھو۔ اطمینان سے بات کرو۔ لیکن اُس کو قرار کہاں۔ 'نینی تال' کی سیر کے واقعات شروع کئے 'تال' کی کشتی بانی سے لے کر 'چینا پیک' کی چوٹیوں تک کے بالتفصیل واقعات بیان کر ڈالے۔ اس پر بھی صبر نہ آیا تو ہاتھ پکڑ کر حدِ نظر تک کے مقامات کی تفصیل، محلِ وقوع، تاریخی اہمیت اس طرح از بر سنائی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لڑکا تاریخ کا طالب علم ہے اور یہیں کا رہنے والا ہے۔ یہ لڑکا شاہد تھا۔ ابتدائی عمر سے بہت کمزور تھا اس لئے سارے خاندان کی توجہ اُس کی صحت کی طرف رہتی تھی۔ فطرتاً بے حد طبّاع، دلیر، خوش مذاق اور محبت کرنے والا تھا۔

۴ مئی ۱۹۴۶ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان ختم کیا۔ اتفاقاً گھر پر ایک بہن شدید بیمار تھی۔ اس لئے متفقہ رائے سے شاہد کو نینی تال، تبدیل آب و ہوا کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ شاہد نینی تال، سید اعجاز علی صاحب کے پاس ٹھیرے جو اُن کے چچا ہوتے ہیں۔

۲۰ جون ۱۹۴۶ء کو شاہد 'گھٹیا' ہم لوگوں سے ملنے آئے۔ یہ مقام 'نینی تال' سے ۴ میل نیچے ہے۔ اُس وقت شاہد پہلے سے کہیں زیادہ تندرست اور موٹے تھے۔ لیکن شاید خدا کو انھیں جلد بلانا مقصود تھا۔ اس لئے ظاہر حالات ایسے ہو گئے کہ سب لوگ قطعی غافل رہیں۔ اس کے بعد ۲۶ جون تک شاہد 'گھٹیا' برابر آتے رہتے۔ ۲۷ جون ۱۹۴۶ء کو میں 'نینی تال' خانصاحب ارشاد حسین پرسنل اسسٹنٹ آنریبل ہوم منسٹر سے ملنے 'نینی تال' گیا۔ شاہد مرحوم کہیں سے ٹہل کر آئے تھے۔ میں نے دیکھ کر کہا 'میاں کیا حال چال ہیں؟' کہنے لگے کچھ نہیں خیریت ہے اب 'نینی تال' میں دل نہیں لگتا۔ کیونکہ کوئی دوست نہیں ہے؛ (شام کے کھانے اور چاء میں میرے شریک رہے۔ میں نے کہا 'گھٹیا' چلتے ہو۔؟ کہنے لگے 'صغیر کے ساتھ جاؤں گا' (... لازم تھا) میں نے کہا کہ 'میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے'؟ صغیر کے ساتھ کیا خاص بات ہے؟ اور ذرا ... کر میں نے کہا کہ نوکروں سے زیادہ نہ ملنا چاہیئے' میری یہ بات اُس کو ناگوار گزری ... کہنے لگے 'اچھا تو کل میں بریلی جاؤں گا' اور ایک خط اپنے بھائی لطیف کو لکھا۔

لوٹتے میں میں نے بازار میں سمجھایا کہ میں نے تم کو کسی خاص وجہ سے کچھ نہیں کہا ہے تم خیال مت کرنا اور عطا روپیہ دیا، نینی تال کی آخری حد یعنی تلی تال وہ مجھے چھوڑنے آیا۔ راستے میں گوروں کے ساتھ کچھ ہندوستانی عورتیں جا رہی تھیں۔ اُن کو دیکھ کر کہنے لگے کہ "بھائی دیکھئے ان بے غیرتوں کو موت نہیں آتی اور اچھے آدمی مرجاتے ہیں"۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ ۴۸ گھنٹے بعد اُن کا بھی وقت آگیا ہے!!!

۲۸ جون ۱۹۴۶ء بروز جمعہ ۲ بجے تک بالکل ٹھیک تھے۔ ۳ بجے کے بعد بخار آیا۔ دوا دی گئی۔ رات کے ۹ بجے سرسامی کیفیت ہوگئی۔ دو دست اور ایک قے ہوئی۔ ڈاکٹر آیا لیکن ابھی صحیح تشخیص اور دوا دینے بھی نہ پایا تھا کہ حالت خراب ہوگئی۔ دوا ڈالی حلق کے پار نہ ہوئی۔ انگلی سے ڈالنے کی کوشش کی تو دانت بند ہوگئے۔ یہ آخری سانسیں چل رہی تھیں۔ اماں بی (اپنی نانی) بھائی (راقم السطور) کو پکارا۔ اللہ کا نام لیا اور ایک آخری حسرت بھری نگاہ سب پر ڈالتے ہوئے۔ پردیس میں بصد حسرت و یاس اس ننھے مجاہد نے جان دی۔ اِنّا لِلّٰہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مرحوم بہترین مقرر، مضمون نگار، سیاست داں لڑکا تھا۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا اتنی سی عمر میں شدید احساس تھا۔ اکثر مضامین مسلمانوں کی اقتصادی، تعلیمی و سیاسی ترقیات کے متعلق لکھتا تھا۔ اپنے اسکول کے لڑکوں میں مسلمہ لیڈر تھا۔ سنجیدگی، ذوقِ مطالعہ اور تاریخ دانی میں اپنا آپ جواب تھا۔ مستقبل میں اس جوہرِ قابل سے بڑی اُمیدیں تھیں۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب شاہد دنیا میں نہیں اور کوئی دنیاوی طاقت اُس کو اس جہان میں نہ لا سکے گی۔ لیکن تمام عمر ایک داغ دل پر رہے گا۔ اور مشیتِ ایزدی میں کسی کو چارہ نہیں۔ خدا ہر حال میں بندہ کی تربیت کرتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ شاہد دنیا میں آیا تھا، اور اب شاہد مرحوم ہوگیا۔ ایک وہ تصور بندھتا ہے، جب سولہ سال کے پہلے شاہد عالمِ ہست میں آیا تھا، ہر طرف خوشی کی لہر تھی اور آج یہ وقت ہے کہ اپنے اور غیر ماتم کناں ہیں اور جلد از جلد دفن کرنے کی فکر میں ہیں۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ مسلمانوں کو دنیا سے محبت نہیں اُن کو عقبیٰ بنانی ہے لیکن دنیا کی کامیاب و باایمان زندگی ہی عقبیٰ کی بہتری کی ضامن ہے۔

نئی نسل کے مسلمان بچوں کے واسطے شاہد کی مختصر زندگی ایک نمونہ ہے۔ کتابیں پڑھنے و جمع کرنے کا شوق۔ ذوقِ سیاحت۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں ہائی اسکول پاس کرلینا۔ چھوٹوں بڑوں سے حسب مراتب ملنا۔ مستقبل میں آگے بڑھنے کی کوشش۔ یہ مختلف سرخیاں ہیں جو شاہد کی

قلیل زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ کاش تمام مسلمان بچے اسی اسپرٹ کے ہوں تاکہ ایک شاہد کے بدلے قوم میں ہزاروں شاہد پیدا ہو جائیں اور ہماری اُمیدیں بر آئیں۔

نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب گنج علی گڑھ | کل آپ کا خط معمولی ذہنی حالت میں کھول کر پڑھا۔ اس کے اندر کے حادثے کی خبر نے دل کو صدمہ دیا۔ کیسا حادثہ آپ کو پیش آیا ـــــ اور دفعتہً ـــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ـــــ یہ مقام صبر و رضا کا ہے۔ رَضِیْنَا بِقَضَاءِ اللّٰہ ـــــ صبر و رضا اُمت نے سادات کرام سے سیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو باغ جنت کی فضائیں بخشے۔ آپ کو اور جملہ اعزا کو صبر و اجر۔

خان بہادر حاجی مولوی حبیب اللہ خانصاحب علی گڑھ | مجھ کو آپ کے صدمۂ جانکاہ کا حال معلوم ہو کر دلی افسوس ہوا۔ مشیت ایزدی میں مجال دم زدن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں التجا ہے کہ وہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ اور آپ کو و اہل خاندان کو توفیق صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ ان اللہ مع الصابرین ہے

خانصاحب میر ولایت حسین صاحب بی۔ اے علی گڑھ | صاحب زادہ شاہد علی کے انتقال پُر ملال کا حال معلوم ہو کر بہت رنج ہوا۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین میں اظہار افسوس کے واسطے خود آپ کے پاس آتا لیکن بدقسمتی سے چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ اس لئے خط کے ذریعہ اظہار افسوس کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سید معین الحق صاحب علی گڑھ | میں نے حادثۂ جانکاہ کی خبر آج ہی سنی۔ ہم لوگوں کو اس خبر کو سن کر جو صدمہ ہوا ہے اس سے کچھ اندازہ آپ کے اور بیگم صاحبہ کے رنج والم کا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت مسلمانوں کو صبر کرنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ نعم البدل کی اُمید وابستہ رکھنی چاہیئے۔ بہر حال زخم کی تکلیف اپنی جگہ رہتی ہے۔

مولوی عبدالشکور صاحب پرنسپل حلیم مسلم کالج۔ کانپور | کل نانا صاحب قبلہ کے خط سے اور آج حسیب میاں کے خط سے اس دلدوز سانحہ کا علم ہوا جس میں آپ، آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کا خاندان مبتلا ہے۔ کیسا اندوہناک اور دل ہلا دینے والا سانحہ ہے جس کا تصور ہی ہوش رُبا ہے اور جب سننے والوں کا یہ حال ہے تو خود آپ پر اور بچے کی ماں کے لال پر کیا کچھ نہ گزرا ہوگا۔ اللہ تبارک تعالیٰ آپ دونوں کو صبر جمیل اور استقامت عطا فرمائے اور مرحوم کی رُوح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ میں اور میری بیوی آپ دونوں کے اس غم میں شریک ہیں اور ہماری دلی دعا ہے آپ کو صبر و شکر عطا ہو۔

ایک تعزیت نامہ آپ کو روانہ کر چکا ہوں۔ جی نہیں مانتا۔ پھر آپ سے ہمکلام ہونے اور غم میں شرکت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جوان کی موت اور پھر ایسے ہونہار اور ترقی کرنے والے کی موت اور وہ بھی اچانک دیارِ غیر میں۔ یہ سب سخت ترین سانحات ہیں۔ اس غم و اندوہ میں آپ کا اور آپ کی بیگم صاحبہ کا کیا حال ہوگا۔ خداوند کریم آپ دونوں کو صبر عطا فرمائے اور آپ کو ہمت و استقامت دے کہ آپ اس سانحۂ عظیم کو خوش اسلوبی سے برداشت کریں۔ ہم دونوں غم میں شریک ہیں اور دست بدعا ہیں۔

مولانا سید عبدالرؤف صاحب ناظم نذیریہ پبلک لائبریری۔ دہلی	آج صبح جناب انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی سے آپکے صاحبزادہ کے انتقال کی خبر وحشت اثر سن کر جس قدر صدمۂ عظیم ہوا وہ حیطۂ

تحریر سے باہر ہے۔ افسوس صد افسوس۔

سید شوکت علی صاحب انجنیر دہلی	تمہارے نورِ چشم لختِ جگر شاہد کو خدا نے اپنے پاس بلالیا۔ اس خبر سے بے انتہا صدمہ ہوا اور انسان کی مجبوری کا ایک اور مشاہدہ ہوا۔ تمھیں سکین دینا دنیا داری

کا فعل ہے۔ صبر و شکر کی طاقت بھی خداوند کریم ہی دیتا ہے ورنہ اس قسم کے صدموں سے جانبر ہونا دشوار ہو جائے۔ مجھے کسی تفصیل کا علم نہیں اور نہ مرحوم کی علالت کی کبھی اطلاع ملی۔ ممکن ہو تو جواب دینا۔

شیخ نعیم اللہ صاحب بریلی	مجھ کو کل معلوم ہوا تھا کہ آپ کے یہاں حادثۂ جانکاہ ہوا۔ فی الواقع بڑا سانحہ ہوا۔ مگر مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ سوائے صبر و شکر کے کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو

صبر کلی عطا فرمائے۔ میں بغرض فاتحہ خوانی آپ کے پاس آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ آپ قبرستان گئے ہیں۔

شیخ کریم الدین صاحب میرٹھ	شاہد ایکسا ذہین اور کس قدر ہوشیار تھا۔ مگر قضا و قدر سے کیا چارہ مشیتِ الٰہی یوں ہی تھی۔ میاں کی ذات بے نیاز ہے ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

میں بھی ایسے ہی حالات میں مبتلا ہوں ورنہ خود حاضر ہوتا۔ معلوم ہوا کہ مرحوم نے اسی سال انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا۔ اپنی طبیعت کی جو کیفیت ہے کیا عرض کروں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے۔

مولوی احمدالدین صاحب نظامی ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں	والد صاحب قبلہ سے آپکے بچہ کے انتقال کی خبر معلوم ہو کر بے حد رنج ہوا۔ دیکھئے اللہ کی کیا شان ہے۔ ایسا ہونہار بچہ چند گھنٹوں میں ختم

ہو گیا۔ آپ کو اور اس کی والدہ کو تو جو صدمہ ہوا ہوگا اس کا تو ذکر کیا۔ میری آنکھوں میں مرحوم کی صورت گھوم رہی ہے۔ بھائی سوائے صبر کے اور کیا چارہ ہے۔ اللہ کا مال تھا اس نے لے لیا۔ وہ معصوم تھا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔ آمین

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی آگرہ	آپ کا حال سُنکر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یہاں کے کام کو سلام کر کے جلد آتا ہوں۔ اب تو آپ کی فکر ہے۔ اللہ رحم کرے۔
محمد سعید اللہ خاں۔ شیرانی دیول گھاٹ۔ برار۔ سی۔ پی	حفیظ صاحب کے خط سے معلوم ہو کر بڑے صدمہ کا باعث ہوا کہ شاہد نے اس جہان سے کوچ کیا۔ مرحوم مجھے نینی تال سے خط لکھتے رہے تھے

آپ کو زیادہ لکھنا تازہ زخم پر نمک چھڑکنا ہے ؂

بلبلا پانی کا ہے دُنیا میں انساں کی حیات
یہ جہاں فانی ہے اِس میں سب کو لازم ہے ممات

سیّد اعجاز علی نینی تال	میں جس دن سے نینی تال واپس آیا ہوں میری طبیعت ایک منٹ کو نہیں لگ رہی ہے۔

کئی دن بکا پڑا رہا اور اب وحشیوں کی طرح پھر رہا ہوں۔ بہت کوشش کی طبیعت بہل جائے لیکن ہر وقت شاہد کا خیال ستاتا رہتا ہے۔ کئی مرتبہ سنیما گیا لیکن آدھا پونا دیکھ کر چلا آیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے برابر بیٹھے ہیں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ برابر کی کرسی خالی پڑی ہے تو عجیب وحشت سی ہوتی ہے۔ کیونکہ میں ہمیشہ اپنے ساتھ سنیما وغیرہ لے جایا کرتا تھا۔ وہ میرے بغیر کبھی اکیلے سنیما دیکھتے تھے۔ میں نے وہ کمرہ بھی چھوڑ دیا ہے جس میں وہ میرے ساتھ رہتے تھے اور جہاں انتقال ہوا۔ کیمپ میں رہ رہا ہوں۔ اگر میں زیادہ دن یہاں رہا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں بخار نہ رہنے لگے۔ لوگ تو یہاں آکر اچھے ہوتے ہیں اور میں اب بیمار ہوا جا رہا ہوں۔ بارش مسلسل اب چار دن سے ہو رہی ہے۔

اخبار "عرش" بریلی	حلقۂ احباب میں کس قدر افسوس کے ساتھ یہ خبر پڑھی جائے گی کہ ۲۸ جون ۱۹۴۶ء کو رات کے ۱۱ بجے سیّد الطاف علی صاحب پرسنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

کے فرزند ارجمند مسٹر شاہد علی بعمر ۱۶ سال صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو تشریف لے گئے اور اپنے شفیق والدین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئے۔ ۲۹ کی شام کو ۴ بجے آپ کی نعش پہاڑ سے موٹر میں بریلی آئی اور ۳۰ کی صبح کو سیّد الطاف علی صاحب اور مرحوم کی والدہ اور گھر کے دوسرے لوگ علی گڑھ سے تشریف لائے تو اعزا، احباب نے اس ہونہار نونہال کو تقریباً ۱۱ بجے سپردِ خاک کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط۔ مرحوم نے اسی سال ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا، بہترین مقرر تھا۔ سیّد الطاف علی صاحب کے فرزندوں میں یہ بچہ نہایت تیز اور ہوشیار تھا اور والدین کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا سیّد صاحب اور ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

حافظ محمد اشرف صاحب قصاب نینی تال

شاہد کی موت ۔ آہ کیسا سانحہ ہے ۔ اِس کے خیال اور تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اعجاز میاں نے بریلی سے واپس آکر جو جانگداز اور دل کو پاش پاش کرنیوالے حالات بیان کئے حوالۂ قلم نہیں ہو سکتے جو صدمۂ عظیم آپ کو اور والدۂ شاہد کو ہوا ہوگا اس کو آپ ہی لوگوں کا دل جانتا ہوگا ۔ آپ کا ہر ایک کو تلقینِ صبر کرنا کس قدر صبر آزما تھا، لیکن پھر رات کی تنہائی میں جو تکلیف اور حالت آپ کی سننے میں آئی خدا ہر صاحبِ اولاد کو اُس سے محفوظ رکھے ۔ شاہد مرحوم کس قدر ہونہار ذہین اور نہ معلوم کیا کیا اوصاف کا مالک تھا ۔ افسوس برق گرتی ہے تو ایسے ہی ہونہاروں کو تلاش کرتی ہے ۔ شاہد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن اس کی یاد باقی ہے اور رہے گی ۔

مولوی محمد یاسین صاحب یعقوبی دیوبند

عزیزم شاہد علی کے انتقال کا حال معلوم ہو کر سخت صدمہ ہوا ۔ اللہ تعالےٰ آپ کو جملہ عزیزوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے ۔ مرحوم معصوم تھا اس کی مغفرت ضرور ہوئی ہوگی ۔ میری اہلیہ کی حالت بھی سخت نازک ہے اور میں شدید پریشانی میں ہوں اللہ تعالےٰ ہم لوگوں پر رحم فرمائے ۔ بیگم صاحبہ کو تسلی دیتے رہئے گا ۔

علامہ کیفی صاحب چریاکوٹی اعظم گڑھ

آپ کے سانحۂ دلگداز و رُوح فرسا کی خبر سنکر صبر و ضبط کے ہوش اُڑ گئے ۔ بڑا ہونہار بچہ تھا ۔ موت اور ہونہار بچے کی موت، کس دل سے آپ کو تلقین صبر کرو ۔ دعا کرتا ہوں اللہ تعالےٰ آپ لوگوں کو صبر عطا فرمائے ۔ ایسے حادثۂ عظیم میں جس قدر بھی رنج و غم کیا جائے بجا اور درست ہے ۔ مگر میرے دوست کہاں تک ۔ بس یوں سمجھئے کہ اللہ کی چیز تھی اُس کو پسند آئی لے لی ۔ تاکہ اس خوشنما پھول سے جنت کا باغ آراستہ کرے ۔ یہ اس کی مرضی ہے کہ آپ کے پاس صرف داغِ جدائی اور خارِ غم رہ جائے ۔ اُس کے سامنے اس عطا پر بھی سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔ پھول اور کانٹے اور داغ سب اس کی مرضی کے اشارے ہیں ۔ بندہ مجبور ۔ اسی مجبوری کا نام بندگی ہے ۔ خدا جس طرح اپنی خدائی نہیں چھوڑ سکتا اسی طرح بندہ اپنی بندگی سے الگ نہیں ہو سکتا ۔ وہ صرف یہ جانتا اور کہتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ میرا دل بھی زخمی اور بہت زخمی ہو چکا ہے ۔ پرسوں میری مریضہ لڑکی جو بڑی سے چھوٹی تھی دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو بلکتا اور ہم لوگوں کو روتا ہوا چھوڑ کر جنت کو سدھاری طاؤس اُڑ گیا نقش قدم رہ گئے ۔ کیا کہوں اور کیا لکھوں ۔ اپنے گھر میں مری دعا کہئے اور کہئے کہ صبر کرکے اپنی خاندانی خصوصیت کا اظہار کریں ۔

قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی

آپ کے فرزند دلبند کی جوانا مرگی سے دل کو سخت صدمہ پہونچا ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو اور ہم کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت

میں جگہ دے۔ اس ماتم سخت میں مجھ کو اپنا شریکِ حال سمجھئے۔ مصیبت میں صبر و استقلال سے کام لینا مسلم کا فرض ہے۔ اس کو آزمائش سمجھئے اور صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیجئے۔ اور اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا ہے۔؟ ع

کیا کریں اے میر صاحب بندگی بیچارگی

میرے گھر کے لوگ بھی اس وقت خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ حادثۂ فاجعہ کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) میرے برادر نسبتی یعنی میری چھوٹی بیگم کے برادر عزیز عمر ۲۳ سال دیہات میں سیر و شکار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ندی کے کنارے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک چٹان کے نیچے بارش سے پناہ لینے کے لئے بیٹھے تھے کہ یکایک وہ چٹان ان سب پر گری۔ اُن میں سے تین بچ گئے اور دو دب کر فوت ہو گئے۔ اُنھیں میں ایک برادر عزیز نعمت الدین عرف حسین میاں بھی تھے۔ میت کو بذریعۂ ریل کار لایا گیا اور ساٹھ سالہ بوڑھے باپ نے پردیس میں اپنے لاڈلے کو سپرد خاک کیا۔ یہ حادثہ ۲۴ جولائی ۴۶ء کو رونما ہوا۔ مرحوم نے ایک نوجوان بیوہ اور دو بچے (لڑکی اور لڑکا) چھوڑے ہیں۔

(۲) عین اسی وقت کہ مرحوم کو پیوند خاک کیا جا رہا تھا اطلاع ملی کہ میری بڑی بیگم صاحبہ کے بڑے بھائی قاضی عبدالحق صاحب جو اپنے گاؤں سے اسٹیشن پیدل آرہے تھے راستہ ہی میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رحلت فرما گئے۔ چنانچہ اُسی وقت دوسری ریل کار کا انتظام کیا گیا اور میت کو اسی جگہ لاکر دفنایا گیا۔ مرحوم میرے چچا زاد بھائی اور میری جاگیر کے سہیم و شریک تھے۔ اور اس زمانے میں میرے دست و بازو بلکہ پشت پناہ تھے۔ اِن دو عزیزوں کا یکایک اُٹھ جانا اور اس طرح دردناک طور پر ان کی موت کا واقع ہونا میرے لئے اور میرے خاندان اور گھر والوں کے لئے قیامتِ کبریٰ سے کم نہیں ہے۔ آج ۷ روز ہوئے طبیعت ان پے در پے صدموں سے بہت نڈھال ہو رہی ہے اور انتشارِ دماغ و اختلاجِ قلب نے مجھے بھی آپ ہی کی حالت پر لاکر رکھ دیا ہے۔ ع

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

لیجئے ایک "ناکارہ" سے محبت کر کے دوسرے نے بھی اپنے "ناکارہ" ہونے کا ثبوت دیدیا۔ اپنی خیریتِ مزاج سے مطلع فرماتے رہئے۔ میری حالت تو یہ ہے ؎

خارِ فراق دل میں ہے سوزش جگر میں ہے
اب جائیے کدھر کہ خلش دونوں گھر میں ہے

دعا فرمائیے کہ خدا ہم لوگوں پر رحم فرمائے۔

خانصاحب شیخ ارشاد حسین صاحب سول سکریٹریٹ "نینی تال"	آج صبح آپ کے لختِ جگر کو را وا نہ بریلی کر چکا ہوں۔ مجھے اُن کی نینی تال میں موجودگی کی اطلاع اس وقت ہوئی جب وہ اس جہان کو الوداع

کہہ چکے تھے۔ حالانکہ پرسوں ہی اعجاز علی اور مصطفےٰ علی مجھ سے ملے مگر آپ کے بچہ کا کوئی تذکرہ درمیان میں نہیں آیا۔ اس سانحۂ جگر شگاف میں آپ کو صبر کی تلقین کرنا لاحاصل ہے۔

پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی علی گڑھ	تم کو کیسا صدمہ ہوا اس کا اندازہ کر سکتا ہوں!! تم سید ہو صبر کے خوگر ہو اس لئے خیال ہوتا ہے کہ غالباً تم اس صدمہ کو بھی سہار لوگے۔

مجھے تم اپنے غم میں شریک سمجھو۔ خدا کرے کہ تم بخیر و خوبی اس ابتلائے عظیم سے عہدہ برآ ہو جاؤ۔ گھر میں بھی صبر ہی کی تاکید کرو۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ یہ غم ایسا نہیں جو تم لوگ آسانی سے بھلا سکو گے۔

مولوی اکرام اللہ خانصاحب ندوی ایڈیٹر "کانفرنس گزٹ علی گڑھ"	آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ واقعی اس حالت میں لکھنا مشکل تھا لیکن اندوہ ناک واقعہ کی اطلاع مل گئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحوم کی

والدہ کو صبر و استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ قلب و دماغ پر اس خبر بد کا جو اثر پڑا اور جو رنج و قلق ہوا اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ واقعہ کی نوعیت بجائے خود اس قدر اندوہ ناک ہے کہ ایک بے تعلق سے بے تعلق شخص بھی بے تاب ہو جاتا ہے۔ ع

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

مرحوم نے باوجود جسمانی کمزوری اور ناتوانی کے تعلیم کی ایک منزل اپنے شوق اور محنت سے طے کر لی تھی والدین اور خاندان کی بہت سی امیدیں اس ننھی سی جان سے وابستہ تھیں لیکن افسوس کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ قدرت کے یہ راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ ع

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

موت خواہ وہ کسی عمر میں ہو خاندان والوں کے لئے رنج و صدمہ کا باعث ہوتی ہے لیکن ایک غیر متوقع موت تو ہر شخص کو بیتاب کر دیتی ہے۔ بہرحال دنیا میں یہ بھی ہوتا رہا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کائنات ارضی میں کتنے غنچے کھلنے سے پہلے مرجھا گئے اور کتنی کلیاں تبسم آشنا نہ ہو سکیں۔ قدرت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے جو یہاں آتا ہے وہ کبھی جلد اور کبھی بدیر رخصت ہو جاتا ہے۔

آپ کو اور مرحوم کی والدہ کو جو رنج و قلق ہوگا اُس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ فطرت ہی ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے معصوم بچے کی وفات پر حزن و ملال ہوا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ انسان جب تک زندہ ہے اس پر کچھ ذمہ داریاں ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے جب ہمیں

زندگی عطا ہوئی تو خواہ مخواہ اس کی حفاظت ضروری ہے اور ہر حال میں زندہ رہنا ہے۔ خوش ہوں یا ناخوش۔ ع شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب اس کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔ اس لئے صبر سے کام لینا ناگزیر ہے۔ اور یہ ہمت کی کی آزمائش کا موقع ہے۔ آپ پر دوسرے بچوں کی (خدا انھیں زندہ اور سلامت رکھے) ذمہ داریاں ہیں۔ پرورش کی ذمہ داری اور تعلیم کی ذمہ داری۔ اس لئے ہمت سے کام لیجئے اور مردانہ وار اس صدمہ کو برداشت کیجئے۔ میرا خیال ہے کہ بریلی میں آپ کا قیام مزید رنج وغم کا باعث ہوگا۔ اس لئے حتی الامکان اس ماحول سے باہر آجانا چاہئے۔

مصطفٰے صدیقی صاحب بی۔ اے — ریاست ٹونک

آخر اُس غمناک خبر کی تصدیق ہو کر ہی رہی جسے اب بھی دل نہیں مانتا۔ کسی طرح دل و دماغ یہ سوچنے کو تیار نہیں ہوتا کہ شاہد میاں جیسا پیارا اور سنجیدہ بچہ ہم سے اس طرح چھینا جا سکتا ہے۔

آپ کے اس نقصانِ عظیم کا اندازہ تو کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ مگر اس وقت یہ خیال کسی طرح دماغ سے نہیں نکلتا کہ کیا واقعی مشیت اتنی بے رحم ہے۔ فطرت اس قدر بے حس ہے اور انسان اتنا مجبور ہے۔

صبر کی تلقین کرنے کی ہمت نہیں۔ اُس "ماں" اور اس "باپ" سے صبر کرنے کو کس طرح کہا جا سکتا ہے جس ماں باپ نے شاہد جیسا بچہ کھو دیا ہو۔

سید اظہر حسن صاحب رضوی بی۔ اے — اورنگ آباد۔ دکن

کس قلم سے آپ کو خط لکھوں اور کس ذخیرہ سے الفاظ چُن لاؤں جن سے میرے اندرونی جذبات کا بھی اظہار ہو سکے اور آپ کا زخم بھی اچھا ہو جائے ——— قدرت نے بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔ ہم مجبور انسان سوائے صبر کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ بیچاری ماں کے دل کا کیا حال ہوگا۔ یہ سوچ کر ہی کلیجہ پھٹتا ہے۔

آپ نے اب تک موت کے ہر جھٹکے کا ایک ہلکے سے تبسم سے مقابلہ کیا ہے۔ اس صدمہ کو بھی جھیل جائیے۔ یہ آپ کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ شاہد ہم سے چھٹ چکا ہے ——— دل ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کہ ——— یہ غریب ایک دن ختم ہوگا اور دل کو موت کے ہاتھوں صبر کا خون پینا ہی پڑے گا۔

حاجی عنایت احمد خاں صاحب — علی گڑھ

یہی مقام ہے جہاں انسان مجبور ہے۔ سوائے صبر و شکر کے چارہ نہیں جو چیز یہاں پسند ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ بھی اسی کو پسند فرماتے ہیں۔ اُسکی امانت تھی پھیر دی۔

حکیم شریف الزماں صاحب علی گڑھ | حالِ وفات شاہد میاں مرحوم معلوم ہو کر حد درجہ رنج و افسوس ہوا۔ بڑا ذہین اور نیک بچہ تھا۔ افسوس صد افسوس۔ عمر نے وفا نہ کی۔ آپ کے بچوں میں یہ بچہ قابل ہوتا۔ مگر مشیتِ ایزدی میں کسی کا چارہ نہیں۔ نیک بندوں کی آزمائش ہوا کرتی ہے۔

سید ریحان الزماں صاحب علی گڑھ | شاہد میاں کے انتقال پُرملال کی وحشت اثر خبر سُننے میں آئی۔ سخت افسوس ہوا۔ دنیا فانی ہے۔ یہاں کی کسی شے کو ثبات نہیں۔ کُلُّ نفسٍ ذائقۃُ الموت۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ کوئی پہلے اور کوئی بعد مگر وقت آنے پر جس کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔ چھلک گیا۔ ہمیں خود ایک روز اس راہ سے گزرنا ہے۔

میر عزیز الرحمان صاحب دہلی | آج یہ خبر سُن کر کہ آپ کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا دل کو بیحد صدمہ پہونچا۔ اولاد کی موت تو یونہی ماں باپ کے لئے صدمۂ عظیم ہوتی ہے لیکن جوان بیٹے کی موت سے بڑھ کر اور کیا غم ہو سکتا ہے۔ یہ نقصان پورا ہونے والا نہیں۔ جب اس کی بہار کے دن آئے تو خدا نے پیالہ کر لیا۔ بھائی میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اور آپ کی اہلیہ محترمہ کو صبر کی توفیق دے اور اس نقصان کی تلافی فرمائے۔ خدا پر بھروسہ رکھئے اور اسی پر معاملہ کو چھوڑ دیجئے۔

پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب ایم اے "ندوۃ المصنفین" دہلی | کل شام "مصنف" پہونچا۔ کھولتے ہی شاہد کی جوانمرگی کے سانحۂ الم انگیز کا علم ہو کر کیا کہوں کہ قلب و جگر پر کیا کیفیت گزری۔ عام دستور یہ ہے کہ پسماندگان مرنے والے کے اوصاف و محامد کو بیان کر کے گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مرحوم کے لئے اُن کا ماتم اور نوحۂ غم جائز اور درست ہے۔ میرے نزدیک اس طرح کی باتیں ایک حد تک اخلاقی کمزوری کی دلیل ہیں۔ ایک باپ کو اپنے بیٹے کا ماتم اس لئے اور صرف اس لئے کرنا چاہئے کہ مرنیوالا اُس کا بیٹا تھا۔ جگر گوشہ اور پیوند جاں تھا۔ ایک باپ کے لئے ماتم کے جواز میں اس سے زائد اور کیا چاہئے۔ شاہد کی جو خوبیاں آپ نے لکھی ہیں وہ بے شبہ ایسی ہیں کہ اُن کو پڑھ اور سُن کر ہر شخص متاثر ہوگا۔ اور مرحوم کی بے وقت موت سے وہ اپنے دل میں ایک چبھن اور خلش سی محسوس کرے گا۔ شاہد جیسے ہونہار اور پر ارمان بچوں کا فقدان کسی ایک گھر کا نقصان نہیں بلکہ پوری قوم کا نقصان ہے کہ اُس کی جمعیت کا ایک ہونیوالا کامیاب سپاہی گم ہو گیا۔ بہرحال یہ تمام اسباب وجوہ غمگینی دوسروں کے لئے ہیں۔ آپ کے اور محترمہ سیدہ انیس فاطمہ کے زیادہ سے زیادہ رنج و غم کے لئے کیا یہی بات کچھ کم ہے کہ اُٹھتی جوانی اور اُبھرتے شباب کے عالم میں مرنیوالا شاہد آپ دونوں کا جگر پارہ اور دل کا ایک

ٹکڑا تھا، آپ دونوں کے لئے تو ایک عربی شاعر کے بقول وہی بات ہوگئی۔ کہ ؎

وَمَنْ شَاءَ بَعدَكَ فَلْيَمُتْ
فَعَلَيْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

ایسے مواقع پر ہم یہ کہنے کی ہے کہ "صبر کیجئے" مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ الفاظ لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ واقعہ جب انتہائی صبر آزما اور حوصلہ فرسا ہو تو پھر ایسے موقع پر صبر کی تلقین کرنا ایک امر غیر مقدور کی تکلیف دینا نہیں تو اور کیا ہے! اس لئے میں آپ دونوں سے ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ صبر کیجئے بلکہ باخلاص تمام خدا کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ دونوں حضرات کو اور دوسرے بہن بھائیوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ خدا قادر مطلق ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے اور آنمرحوم کو جنت الفردوس میں مقام جلیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ مولانا عتیق الرحمن صاحب اور مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب بھی تعزیت کرتے ہیں اور سلام مسنون پہونچاتے ہیں

والسلام مع الاکرام

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے "معنف" میں یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوا کہ آپ کے نوجوان **پرنسپل دارالعلوم کالج حیدرآباد دکن** فرزند نے وفات پائی۔ آپ نے جس انداز میں نوٹ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے نفس پر بڑا جبر کیا ہے۔ اور سچے مسلمان کی طرح صبر و شکر سے کام لے رہے ہیں۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے اور اس کے سوا انسان کر ہی کیا سکتا ہے۔ شکر ہے کہ آپ کو اس صدمۂ عظیم کے جھیلنے کی ہمت نصیب ہوئی۔ اور آپ کی تحریر ایک مرد مومن کے راضی برضائے الٰہی قلب کی غمازی کر رہی ہے۔

امید کہ آپ اس صدمے کا زیادہ اثر نہ لیں گے۔ آپ اردو اور علم کی جو خدمت کر رہے ہیں اس کی خاطر زیادہ بار نہ لیجئے (باقی وارد)

قطعہ

شب کو مرا جنازہ جب جائے گا نکل کر
رہ جائیں گے سحر کو دشمن بھی ہاتھ مل کر
روئیں گے دیکھ کر سب بستر کی ہر شکن کو
وہ حال لکھ چلا ہوں کروٹ بدل بدل کر

(قمر جلالوی

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس

مہینہ میں چار بار شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ تعلیمی تحریک، مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین، غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ اخبار بہت عمدگی اور نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کر کے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے جو اصحاب پیشگی قیمت ادا کر کے اخبار کے خریدار ہوں گے ان کی خدمت میں دو کتابیں یعنی **التربیۃ والتعلیم** ضخامت ۱۵۰ صفحہ اور رسالہ **تمدن و معاشرت** ضخامت ۔۔ صفحہ ہدیۃً پیش کی جائیں گی۔ یہ دونوں کتابیں نہایت مفید و قیمتی مضامین پر مشتمل ہیں۔ جو تعلیم و تربیت اور اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ کانفرنس گزٹ کی سالانہ قیمت تین روپیہ ہے۔ جنگ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا۔

اڈیٹر:۔ محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ

صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

کانفرنس بُک ڈپو

کانفرنس نے کچھ عرصہ سے "کانفرنس بک ڈپو" کے نام سے ایک تجارتی کتب خانہ قائم کیا ہے جس میں ان کتابوں کے علاوہ جو کانفرنس نے خود شائع کی ہیں ہندوستان کے دوسرے مشہور اور مستند مکتبوں اور مصنفوں کی کتابیں بھی فروخت ہوتی ہیں اور ان کتابوں میں عورتوں اور بچوں کے لئے بھی نہایت مفید اور کارآمد کتابیں موجود ہیں۔ کانفرنس بک ڈپو کا نفع علمی اور تعلیمی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ اس لئے التماس ہے کہ آپ کو جب کبھی جس کسی کتاب کی ضرورت ہو کانفرنس بک ڈپو سے طلب فرما کر کانفرنس کے اس شعبہ کو تقویت پہنچائیں تاکہ اس کے علمی اور تعلیمی کام روز افزوں جاری رہیں اور آپ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوں۔

فہرست کتب مفت

مہتمم کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علی گڑھ

تصانیف الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

حیات حافظ الملک حافظ رحمت خاں — روہیلکھنڈ کے مشہور روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی اردو زبان میں پہلی مکمل و مبسوط باتصویر سوانح عمری جس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں روہیلہ قوم کے کارنامے اور درد انگیز حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے طول و عرض میں مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد صہ روپئے (زیر طبع بار دوم)

مسلمانوں کی تعلیمی جد و جہد — (بزبانِ انگریزی) اس کتاب میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک کی مسلمانانِ ہند کی بالخصوص اور مسلمانانِ یوپی کی بالعموم تعلیمی کوششوں اور عہد بعہد کی جد و جہد کو تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ قیمت عہ روپیہ (زیر طبع بار دوم)

مسلمان کی دنیا — مصنف نے اپنی ڈیڑھ سالہ 'پبلک لائف' کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب و علل کو افسانہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ قیمت دو آنے

رباعیات عرش فاروقی — بریلی (روہیلکھنڈ) کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی مرحوم کے درد انگیز حالاتِ زندگی اور بطور نمونہ کلام اُنکی کیف آور رباعیات کا مجموعہ۔ قیمت ۶ آنے۔

مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم — دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو شدید مشکلات اور رکاوٹیں درپیش ہیں، اُن پر نہایت موثر مقالہ ہے۔ ساتھ ہی حلِ مشکلات کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ قیمت ۸ آنے۔

[illegible] الملک نواب دوندے خاں — (بزبانِ انگریزی و اردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریک کار معزت الدولہ دلاور الملک نواب دوندے خاں بہادر کے مجاہدانہ واقعات و سرفروشانہ حالات کا مجموعہ اور مرہٹہ قوم سے نبرد آزمائی کا مرقع ہے۔ قیمت ۴ آنے

[illegible] روہیلہ (سلطنتِ مغلیہ کا آخری محافظ) — بزبانِ انگریزی و اردو۔ (زیر طبع) قیمت ۸ آنے

ملنے کا پتہ

مینیجر کانفرنس بکڈپو سلطان جہاں منزل علیگڑھ